سہ ماہی

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء

انتساب عالمی

ISSN - 2348-5035

سرونج

گوشۂ احمد شناس

ISSN:-2348-5035

شمارہ نمبر-۹۶
اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء

اشاعت کا ۳۳ رواں سال

سہ ماہی انتساب عالمی سرونج

سرپرست
انل اگروال

ترتیب
ڈاکٹر سیفی سرونجی

مدیر
آفاق سیفی
Mb: 9977955000

ہمارے نمائندے
کنیڈا
اطہر رضوی
امریکہ
کامران ندیم
انگلینڈ
گلشن کھنہ
پاکستان
سید معراج جامی
مسعود تنہا
ابوظہبی
یعقوب تصور
جرمنی
سرور ظہیر

زر رفاقت

ہندوستان	
فی شمارہ	چار شمارے
100 روپے	400 روپے
برطانیہ	
-/5 پونڈ	-/20 پونڈ
یورپ	
-/4 یورو	-/16 یورو
امریکہ	
-/15 ڈالر	-/60 ڈالر
سعودی عرب	
-/20 ریال	-/80 ریال
عرب امارات	
20 درہم	80 درہم

رابطہ: سیفی لائبریری، سرونج (ایم۔ پی۔) ۴۶۴۲۲۸
Saifi library Sironj.(M. P.) INDIA.464228
Mob. 9425641777
email : saifi_sironji@rediffmail . com
Sad Bhawna Manch , Sironj . Ph. 253211

U
070
A 11 I-96
2014

کھنڈروں میں منتقل ہو چکے تھے، سڑکیں سنسان اور رستے ویرانیوں کے عکاس تھے۔ مختلف طبقوں اور بستیوں سے وابستہ لوگ کاروبار ماند پڑنے کی وجہ سے بے کاری کے دن کاٹ رہے تھے اور ان میں سے اکثر لوگ یا تو اپنا ذہن وتوازن کھو بیٹھے تھے یا کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اس وقت کشمیریوں پر یہ محاورہ بالکل صادق آتا ہے 'بے کاری بڑی بیماری ہے' عام ٹرانسپورٹ کے بجائے سڑکوں پر گاڑیوں کا اژدہام تھا۔ خوف کا سایہ انسانی زندگی پر اس قدر مسلط ہو چکا تھا کہ اگر گھر کے کسی فرد کو گھر پہنچنے میں ذرا سی دیر بھی ہو جاتی تو اس کے گھر کے بھی افراد کی جان اس وقت تک اٹکی رہتی جب تک نہ وہ شخص گھر پہنچتا۔ موت کی تلوار ہر وقت سروں پر لٹکی رہتی تھی۔ انسانی قدریں پامال ہو چکی تھیں۔ اونچے اونچے محل نما گھر جہاں پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا، غیر محفوظ نظر آتے تھے۔ ہر طرف اداسیوں، مایوسیوں اور محرومیوں کے پہرے تھے۔ غرض ہر کوئی اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔''

کشمیر کی یہ ہولناک تصویر رخسانہ تبسم نے جس انداز میں کھینچی ہے، وہ واقعی قابل تعریف ہے، اس طرح اس ناول میں اور بھی کردار ہیں، صناع کے والد، والدہ، بھائی، چھوٹا بھائی اشفاق اور ایک خاص کردار صناع کی سہیلی انم جو کہ اس کی غم گسار ہے۔ جو صناع کے ہر زخم کو اپنا سمجھتی ہے۔ اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھرنا چاہتی ہے۔ اس کی کوششوں نے صناع کو یونیورسٹی میں جاب ملتی ہے، اس کی کوششوں سے فراز جیسا ہیرو اس کی زندگی میں آتا ہے اور اس کے سارے غموں کا مداوا کرتا ہے۔ رخسانہ تبسم نے اس ناول میں خواتین کی عزت ووقار اور بلند حوصلہ پیدا کرنے کے لئے صناع کے کردار کو لازوال بنا دیتی ہے کہ کس طرح اس نے اپنے گھر کو چلایا۔ نوراں کے گھر والوں بھائی اور بھابیوں کے طعنے برداشت کئے لیکن حوصلہ نہیں ہارا۔ یہ ناول خواتین کے لئے، ان میں زندگی جینے کے لئے بلند حوصلہ پیدا کرنے کے لئے ایک بہترین سماجی اخلاقی ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔ ناول کے دیباچے میں فاروق صاحب لکھتے ہیں:

''خواب حقیقت نہ صرف صناع کے مضبوط کردار کے محور میں گھوم رہا ہے بلکہ اس ناول نے سماج میں موجود ان چہروں کو بھی بے نقاب کیا ہے، جو حکومت کی بے بسی کا فائدہ اٹھا کر اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ جنھوں نے سڑکوں پر ناجائز قبضے جمائے، جنھوں نے کشمیر کی خوبصورتی کو برباد کرنے میں اپنا بھرپور کردار نبھایا، جو غریب کو روندنا چاہتے ہیں۔ کسی بے سہارا کا سہارا نہیں بن سکتے۔''

نراکار:

عمر فرحت نئی نسل کے وہ خوش نصیب شاعر، ادیب ہیں جو اپنی ابتدائی تحریروں سے ہی

آسماں کا چاند بھی اب آگیا زیر قدم
آدمی کوشش کرے تو کچھ بھی ناممکن نہیں

قمر گوالیاری کی شاعری ان کی ڈھلتی عمر کے ساتھ اور توانا ہو رہی ہے۔ان کا تخلیقی شعور ان سے خوبصورت اشعار کی فرمائش کرتا ہے اور وہ سادگی کے ساتھ اردو ادب میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔مشہور و معروف شاعر ابراہیم اشک فرماتے ہیں:

''قمر گوالیاری کے اشعار سادگی اور پرکاری کا نمونہ ہیں۔ان کے اشعار کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان میں غزل کی روایت بڑے ہی ناز و انداز سے سانس لے رہی ہے۔انسان کی زندگی، درد و غم، حادثوں اور مشکلوں سے گھری ہوئی ہے، جن سے کامیابی کے ساتھ اس سے گذرنا ہوتا ہے۔ہر سنجیدہ اور باشعور تخلیق کار کا میدانِ عمل یہی ہے۔قمر گوالیاری کے یہاں بھی یہ شعور جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔''

تحقیق کا موضوع توجہ طلب ہے، یہ بہت ہی خشک موضوع ہے پھر بھی کافی اہمیت رکھتا ہے، کسی بھی تحقیقی کام کو کرنے کے لئے جگر کا ہونا ضروری ہے۔تحقیق کافی محنت مانگتا ہے۔قمر گوالیاری نے گوالیار میں اردو ادب پر عمدہ تحقیقی کام کیا ہے۔شروع سے لے کر اب تک کے شعراء و ادباء کا احاطہ کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔کئی کتابوں سے استفادہ کیا، پھر اس پر غور و فکر کرنا کہ یہ درست ہے کہ نہیں۔اس کی تحقیق کرنا بھی ضروری ہے۔اب آیئے اس پر تھوڑی روشنی ڈالی جائے کہ قمر صاحب نے کیسا کام کیا ہے۔

قمر گوالیاری صاحب کی شخصیت قابل احترام ہے اور ان کا کام بھی لائق احترام ہے۔اپنی کتاب ''گوالیار میں اردو زبان و ادب'' میں پہلے تو انھوں نے فلیپ پر ہی لوگوں کی آراء سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کو پہلے ''گوالیاری زبان'' کہا جاتا تھا اور اسے اردو نام خان آرزو نے دیا ہے۔اس پر اہل قلم کی آراء بھی موجود ہیں۔

''زمانہ قدیم میں گوالیار سے دہلی تک کے علاقوں میں جو زبان بولی جاتی تھی۔ اس کا نام ''گوالیاری زبان'' تھا۔برج بھاشا کوئی قدیم نام نہیں ہے۔قدما اس کو گوالیاری نام سے ہی یاد کرتے ہیں۔''

(پنجاب میں اردو- حافظ محمود شیرانی)

پھر خلیق انجم فرماتے ہیں۔

''خسرو کی تالیف خالق باری (۱۶۲۱ء) کی زبان گوالیاری ہے۔''

اس کی تصدیق فقیر اللہ سیف نے اس طرح کی ہے۔

''ہندوستان میں گوالیاری زبان سب سے اچھی پائی گئی ہے۔ یہ علاقہ ہندوستان میں ایسا ہے، جیسے ایران میں شیراز۔''

ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ گوالیار ادب کے معاملے میں آگے رہا ہے اور پھر بیخود دہلوی نے کہا:

''دہلی اور لکھنؤ سے پہلے شاعری گوالیار میں ہوئی۔''

ان سب باتوں کی تحقیقی حقیقت کیا ہے؟ اس کے لئے قمر صاحب نے پوری ایمانداری سے کوشش کی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں لکھا ہے:

''خان آرزو کو اردو زبان پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ اور منطق پر ہے۔ جب تک کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے۔''

چونکہ قمر گوالیاری کے دل میں یہ بات کھٹکتی رہی کہ گوالیار کی زبان وادب کی تاریخ کون لکھے گا، تو انھوں نے اس عمر میں بھی اپنے جوان حوصلے کے ساتھ اس کام میں ہاتھ ڈالا اور اسے پورا کر کے دکھایا۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں:

''قمر گوالیاری نے ایک بڑے ادارے کا کام تن تنہا کیا ہے۔ گوالیار کی تاریخ اور ادب کی پیش رفت ان کی تحقیقی نظر، دقیقہ رسی، تلاش وجستجو ژرف بینی اور محنت جاں فشانی قابل قدر تقلید ہے۔ یہ ایک اہم اور تاریخی کام ہوا ہے۔ گوالیار میں اردو زبان وادب کے حوالے سے اردو زبان وادب کی تاریخ میں قمر گوالیاری کا یہ زبردست اضافہ ہے۔''

قمر گوالیاری صاحب کی کتاب میں کئی قابل ذکر باتیں ہیں۔ جن کا احاطہ مضمون میں نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب کے مطالعے کے بعد ہی قاری مطمئن ہوسکتا ہے۔ جس شائستگی اور سنجیدگی کے ساتھ قمر صاحب نے کتاب کو معیاری بنایا ہے۔ اس سے ان کی محنت کا انداز ہوتا ہے۔ کتنی خوبصورتی کے ساتھ گوالیار کی ادبی تاریخ مرتب کی ہے۔ جس پر قمر صاحب کی فکر کے گہرے نقوش موجود ہیں۔ قمر گوالیاری کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر صادق صاحب رقمطراز ہیں:

''گوالیار میں اردو شاعری کی روایت کافی مضبوط رہی ہے لیکن تقسیم وطن کے بعد سے یہ روایت روبہ زوال ہے۔ پرانے بادہ کش محفل سے اٹھتے جارہے ہیں اور ان کی خالی جگہ پُر کرنے کے لئے لوگ ناکافی معلوم ہوتے ہیں۔ اس مخصوص صورت حال میں قمر گوالیاری نے اپنے علاقے کی تاریخ ادب رقم کرنے کا جو فریضہ انجام دیا ہے،

وہ یقیناً لائق تحسین ہے۔''

قمر گوالیاری نے تاریخ ادب کے ساتھ شاعری میں بھی اپنی فکری وسعتوں کو بڑے سلیقے کے ساتھ قاری کے لئے پیش کیا ہے۔ ایک طرف نئے پرانے شعراء کی تلاش وتحقیق دوسری طرف شعری وسعتوں کو شیریں انداز میں پیش کرنا اور پھر افسانوں کے ذریعہ سماج کے حالات کا جائزہ لیکر دنیا کو درس دینا یہ سب ایک ساتھ ان کے ذہن کی فیکٹری میں پلتا ہے اور پھر قرطاس کے سینے پر یہ سب ابل پڑتا ہے اور قاری کے لئے بہت کچھ معلوماتی اور ذہنی سکون کا باعث بنتا ہے۔ قمر صاحب قمر بن کر ادب کی بستی میں روشنی پھیلا رہے ہیں جسے اہل ادب یاد رکھیں گے۔

☆☆☆

فکر نو کا ترجمان

سیپ

پچھلے پچاس سالوں سے نسیم درانی

کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

سیپ پبلی کیشنز ۱۸/۴۱۸ فیڈرل بی ایریا

کراچی (پاکستان)

ماہنامہ تخلیق

لاہور پاکستان

اظہر جاوید کے صاحبزادے

سونان اظہر جاوید کی ادارت میں

پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

Mb:03218899007

مشہور ادیب گلزار جاوید کی ادارت میں

ماہنامہ چہارسو

راولپنڈی پاکستان سے

پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے

روشن خیال رجحانات کا نمائندہ

فکرِ نو

لاہور، پاکستان

سے مسعود تنہا کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے

رؤف خوشتر
cell-9538445870

طنز کیا ہے مزاح کیا ہے؟

(نثری حصہ)

طنز عربی لفظ ہے، جس کے معنی طعنہ یا رمز اشاروں میں بات کرنے کے لئے جاتے ہیں، جبکہ اس کے مرادی معنی دل کو چبھتی ہوئی بات کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ مزاح بھی عربی لفظ ہے، جس کے معنی خوش طبعی، ظرافت یا مزاق کے ہیں۔

عربی کا معروف مقولہ ہے ''مزاح المؤمنین عبادۃ'' یعنی ایمان کی حدود کے دائرے میں مؤمنین کا باہمی مزاح بھی عبادت ہے۔ اسی طرح عربی کا ایک اور مشہور قول ہے ''المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام'' جس کا مفہوم ہے کہ کلام میں مزاح کو وہی مقام حاصل ہے، جو طعام میں نمک کو ہے۔ جب تک زبان و بیان پر قدرت حاصل نہ ہو طنز و ظرافت کو نثر میں برتنا نہایت مشکل عمل ہے۔ تخلیق فن ایک سنجیدہ تخلیقی کوشش و کاوش ہے۔ اس کے لئے ہم صفت موصوف ہونا ضروری ہے۔ لفظوں کی سماجی، جمالیاتی اور احساساتی و استعاراتی نشیب و فراز پر بڑی حد تک قدرت رکھنے والا شخص ہی نیز عصری علوم سے واقفیت رکھنے والا پھر تاریخ کا معروضی علم اور نفسیاتی انسانی کی بصیرت رکھنے والا کامیاب طنز و مزاح نگار ہو سکتا ہے۔

زبان کی حلاوت بیان کی ندرت اور اظہار کی جدت کی تثلیث سے طنز و ظرافت لکھا جا سکتا ہے۔ افسانہ اور کہانی کی طرح طنزیہ و مزاحیہ مضامین میں بھی کردار واقعات اور پس منظر ہوتے ہیں۔ مضمون نگار انھیں تینوں کے اجزائے ترکیبی کی مدد سے اپنی بات اور اپنے خیالات

مضمون کے قالب میں ڈھالتا ہے طنز ومزاح نگار اشیاء کا مشاہدہ ایک الگ اور غیر رسمی زاویہ نگاہ سے کرتا ہے اور ان میں وہ صفات تلاش کرتا ہے، جو عام نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ شگفتہ زبان لطیف بیان کا امتزاج طنز ومزاح کو کامیاب بنانے میں اہم عناصر ہیں۔ بقول شمس الرحمن فاروقی: ''طنز عام طور پر سپاٹ اور مزاح عام طور پر بھونڈا ہو جاتا ہے اگر مصنف کو محاورے اور زبان پر قدرت نہ ہو۔ طنز ومزاح دونوں کے لئے ذہن رسا اور طبیعت چونچال درکار ہے۔''

ایک کامیاب طنز ومزاح نگار کے لئے بصیرت ژرف نگاہی، کشادہ دلی، روشن خیالی اور بلند ظرفی کے ساتھ اسلوب ونگارش کی حلاوت مطلوب ہوتی ہے۔ طنز ومزاح ذہن کا آزاد شرارہ ہے۔ جس کے لئے کسی مخصوص ہیئت یا سمت کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ یہ تمام اصناف سخن کا آمیزہ ہے۔ جدت ندرت اور شگفتہ بیانی کے لئے دیگر اصناف سخن سے واقفیت ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس صنف ادب میں ذہنی بازی گری کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے اور بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر آزمایا جاتا ہے۔ لب ولہجہ کا تیکھا پن شوخی وظرافت کی آمیزش اور شگفتہ تحریر اسے زندگی کی حرارت عطا کرتی ہے۔ مخملی لب ولہجہ کا التزام ہوتا ہے۔ طنز ومزاح نگار کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت نقاد عصر کو کثیر المطالعہ عصری آگہی اور حس مزاح کا حامل ہو۔ بقول محبوب راہی: ''وہی طنزیہ ومزاحیہ تحریر کامیاب کہلاتی ہے، جس میں مطالعے کی وسعت، زبان کی نفاست، اخلاق کی حلاوت، لہجے کی صلابت، بیان کی ندرت، طرز اظہار کی جدت، فصاحت وبلاغت کے ساتھ ساتھ جذبوں کی تمازت احساس کی شدت، ایمان کی حرارت وصداقت، رنگ وآہنگ کی جگمگاہٹ ہو۔''

شخصی اور معاشرتی زندگی میں جو ہمواریاں ہوتی ہیں، طنز ومزاح کی تحریک ان ہی سے ملتی ہے۔ اس ناہمواری کو بے نقاب کرنے اور منظر عام پر لانے کے لئے گہری سماجی آگہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ طنز ومزاح کی گل کاری ادب کی معنویت کو زیادہ سے زیادہ پہلودار اور باوقار بناتی ہے۔ ایک طنز ومزاح نگار اپنی جدت طبع اور شوخی وظرافت سے کسی بھی صورت حال کا مضحک پہلو ڈھونڈ نکالتا ہے لیکن اس کے پیچھے ایک ایسی تلخ حقیقت اور سچائی چھپی ہوتی ہے، جس کا برملا اظہار اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ طنز وظرافت کا سہارا لیتا ہے اور ہنستے ہنساتے ایسی چبھتی بات کہہ جاتا ہے، جو حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔ طنز ومزاح نگار کا کام صرف ہنسنا ہنسانا نہیں بلکہ نجی زندگی اور انسانی معاشرے کی بہت سی کمزوریوں، برائیوں اور بے اعتدالیوں بے جا وخلاف معمول رویوں اور تلخ حقیقتوں پر سے پردے اٹھانا ہے اور جتنی خوبی سے وہ یہ کام انجام دیتا ہے،

اتنا ہی اچھا مزاح نگار کہلانے کا مستحق قرار پاتا ہے۔

طنز ومزاح کو ادب میں برتنا بازیچہ اطفال نہیں ہے۔ یہ بڑی مشاطگی اور مشاقی کا کام ہے، مزاح ذہانت وذکاوت کے ساتھ حیات وکائنات کے مشاہدے کی پرلطف پیش کش ہے، یہ ادب کی ایک سربستہ لہلہاتی فصل ہے۔ زندگی اور معاشروں کی ناہمواریوں پر اپنے احتجاج فکر وتاثر کو پرلذت اسلوب میں انتہائی ضبط وتحمل کے ساتھ قارئین کے روبرو کردیا کہ اپنی ہی خامیوں پر مسکرا اٹھیں اور ہماری مزاحی حس بیدار ہوجائے۔ الغرض یہ ایک صبر طلب مشکل فن ہے۔ اپنے درد ودل کو تبسم کے پردے میں چھپا کر لے جانے والا اہل قلم ہی اس ہنر میں طاق ہوسکتا ہے۔

اردو ادب میں طنز ومزاح کا رواج فارسی کے زیر اثر اشد ہوا۔ نثر میں طنز ومزاح کی روایات نمایاں طور پر غدر ۱۸۵۷ء کے بعد نظر آئیں۔ مرزا غالبؔ کے خطوط میں ان کی طبعی شادابی اور طنز ومزاح کی صلاحیت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو نثری طنز ومزاح کے آثار غالب کے پرلطف وبرجستہ خطوط سے نمایاں ہوتے ہیں۔

اردو طنز ومزاح کی یہ خوش بختی رہی کہ انیسویں صدی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کا ربع اول اس صنف ادب کے لئے بڑا ثمر آور ثابت ہوا۔ سید سجاد حسین نے ۱۸۷۷ء میں لندن پنچ سے متاثر ہوکر لکھنؤ میں اودھ پنچ کا اجراء کیا۔ جس کے لئے سجاد حسین کے ساتھ تربھون ناتھ ہجرؔ، مرزا مچھو بیگ، ستم ظریف جوالا پرشاد برق، علی احمد شوق، منشی علی احمد کسمنڈی، رتن ناتھ سرشار اور نواب سید محمد آزاد کی طنزیہ ومزاحیہ تخلیقات ۱۹۲۲ء تک عوام وخواص دونوں کو بے حد محظوظ کرتی رہیں۔

حالیؔ نے مزاح کو ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا کہا ہے، جس سے پژمردہ دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔ مزاح کے مقابلے میں طنز قدرے مختلف ہے، اردو اس کے لئے کئی اصطلاحات کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً طنز، تشنیع، تلخی، لعنت، دل شکنی، تمسخر اور مضحکہ وغیرہ۔

رشید احمد صدیقی کے مطابق ان تمام اصطلاحات میں طنز ہی ایسا لفظ ہے، جو بڑی حد تک انگریزی لفظ Satire کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لئے اردو میں اس لفظ طنز کا چلن عام ہے۔ یہ ایک ایسا عمل جراحی ہے، جس کا مقصد اصلاح وتنقید ہے۔

طنز ومزاح کے فرق کو مشتاق احمد یوسفی نے ایک مثال دے کر یوں واضح کیا ہے کہ ''ایک اچھا طنز نگار تنے ہوئے رسے پر کرتب نہیں دکھاتا بلکہ تلواروں پر رقص کرتا ہے۔ جب کہ مزاح نگار کو جو کچھ کہنا ہے وہ ہنسی ہنسی میں کہہ جاتا ہے۔'' بقول مراق مرزا: ''طنزیہ ومزاحیہ تخلیق کاری کا راستہ آسان نہیں ہے۔ ایک جنوئن طنزیہ ومزاحیہ قلم کار اپنے سماج کا معالج ہوتا ہے، جو

اپنی طنازی کے نشتر سے سماجی برائیوں کی جراحی کرتا ہے اور مزاح کے مرہم سے ان کا علاج کرتا ہے۔ گویا کہ ایک کامیاب طنز و مزاح نگار بیک وقت معالج اور جراح دونوں ہوتا ہے۔''

اردو طنز و مزاح کے نثری کارواں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں، تو ہم کو مرزا غالب، سید سجاد حسین، پنڈت رتن ناتھ سرشار، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، انجم مانپوری، ملا رموزی، تمنا مظفر پوری، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، ابراہیم جلیس، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، ابن صفی، کنہیالال کپور، فکر تونسوی، کرشن چندر، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، خواجہ عبدالغفور، بھارت چندکھنہ، نریندر لوتھر، مسیح انجم، پرویز یداللہ مہدی، جمال پاشا، منظور عثمانی، فیاض احمد فیضی، اسد رضا، نصرت ظہیر، عابد معز، قیوم بدر، دلیپ سنگھ، سید ضمیر حسن دہلوی، عائق شاہ، محمد اسداللہ انصاری، اصغر جمیل، عبدالقادر ادیب، شیخ رحمٰن اکولوی، بابو آر کے مانک ٹالہ، منظور، وقار، مختار احمد منو، فاروق نشتر، شکیل رضا، شکیل اعجاز، منظر قدسی، اقبال سلیم، مشتاق سعید، امجد علی، الف احمد برق، ماجد شمیم، راشد فریدی، منظور الامین، مشہود احمد خاں، علیم خاں فلکی، رفیق شاکر، پرویز احمد خاں، سعید زیدی، سلطان سبحان، محبوب پڑائی، حمید عادل، م۔ ق، سلیم ضیاء، جعفر، فضل جاوید، نعیم جاوید، جاوید بٹ، نٹ کھٹ عظیم آبادی، کشور کولاری، رشید عباس، محمد علی رفعت، علی الدین صدیقی، رونق جمال، سرور جمال، مختار ٹونکی، مختار یونس راہی قریشی، خلیق الزماں، رؤف انور، رؤف خوشتر، جیسے راہ رو نے اس کارواں کو رواں دواں رکھنے میں اپنی شگفتہ تحریروں سے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

خواتین قلم کاروں میں شفیقہ فرحت، حبیب ضیاء، لئیق صلاح، حلیمہ فردوس، شمیم علیم، بانو سرتاج، زنفر کھوکھر، فرزانہ فرح، اور انیس سلطانہ زینت کارواں ہیں۔

پاکستان کے طنز و مزاح نگاروں میں شوکت تھانوی، ابن انشاء، مشفق خواجہ، شفیق الرحمٰن، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خاں، عطاء الحق قاسمی، رؤف پاریکھ، انور سدید، ایس ایم معین قریشی، سلیمان، عبداللہ ڈاراہم نام ہیں۔

یہ طنز و مزاح نگار انی آہوں سسکیوں کو چھپا کر قارئین کو ہنسانے وال شگفتہ تحریریں پیش کرتے ہوئے حفیظ میرٹھی کے اس شعر کی عملی تفسیر بن گئے ہیں۔

چاند کا کردار اپنایا ہے ہم نے دوستو
داغ اپنے پاس رکھے روشنی بانٹا کئے

☆☆☆

عبد اللہ سلمان ریاض

Mob: 9341378921

26, Haines Road, 1st Floor,

Egyptian Block, Bangalore -560051

محمد ہارون سیٹھ سلیم بنگلوری کی

مزاحیہ شاعری

طنز ومزاح، لطافت وظرافت، ہنسنے ہنسانے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اطباء کا کہنا ہے کہ قہقہے لگانے اور ہنسنے سے صحت ٹھیک رہتی ہے اور عمر میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ شدید ذہنی تناؤ اور ڈپریشن سے بچنے کے لئے ڈاکٹر مریض کو دل کھول کر ہنسنے اور خوش وخرم رہنے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ ذہن پر چھائے ہوئے مایوسی کے بادل چھٹ جائیں اور اس کی جگہ امید کی کرن طلوع ہوجائے۔ آج کے اس رنج والم کے دور میں چند لمحات قہقہے لگانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ شہر بنگلور میں بھی آئے دن طنز ومزاح کے مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں جو اس بات کی اہمیت کے لئے بین ثبوت ہیں۔

اسی شہر بنگلور میں ایک طنز ومزاح، لطافت وظرافت کا شاعر ۲۸ر جون ۱۹۴۶ء کو مسکراتے ہوئے اور گھر والوں میں خوشیاں بکھیرتے ہوئے جنم لیتا ہے جسے لوگ محمد ہارون سیٹھ سلیم بنگلوری کے نام سے جانتے ہیں۔ بقول سلیم صاحب انھوں نے ہائی اسکول تک تعلیم پائی اور پیشۂ تجارت سے وابستہ ہوگئے۔ کہتے ہیں کتاب بینی اور مطالعہ کی لت انھیں ایسی لگی کہ یہ اسی کا ہوکر رہے اور پھر اس شوق نے انھیں شاعر وادیب کے صف میں لا کھڑا کردیا۔ ان کے استاذوں میں آزاد ساحری کا نام

نمایاں طور پر لیا جاتا ہے۔ تمہیداً عرض ہے کہ آزاد ساحری جو ماہنامہ ''نشتر'' بنگلور کے مدیر اعلیٰ تھے۔ شاعری، مزاح نگاری و مزاح گوئی سے ان کا خاص لگاؤ تھا۔ ان کا شعری مجموعہ ''صریر خامہ'' کافی مشہور ہوا۔ شعر و ادب کی دنیا میں ان کا بڑا نام رہا ہے۔

ظاہری بات ہے استاد کا کچھ نہ کچھ اثر تو شاگرد پر پڑتا ہی ہے۔ اور اس زمانے کے استاد اپنے شاگردوں کو کچھ بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ اپنے شاگردوں کو کچھ نہ کچھ دیتے تھے۔ آج کے دور میں یہ سلسلہ مفقود نظر آتا ہے۔ اس زمانہ میں پہلی بات تو اچھے استاد ملتے نہیں اور جو ملتے بھی ہیں وہ سکھانے کا ہنر نہیں جانتے یا پھر سکھانا نہیں چاہتے۔

بہر کیف! ہارون سیٹھ سلیم کا اس زمانے سے لے کر آج تک اردو کے معیاری کتابوں اور رسائل و جرائد کا غائر مطالعہ کرنا، شعر و شاعری کی مجلسوں میں شرکت کرنا، دانشوروں سے ملاقاتیں کرنا، مشہور شعراء و ادباء سے خط و کتابت کرنا ان کے اہم مشاغل میں شامل ہے۔ ان کا کلام بنگلور کے مشہور اخبارات و رسائل کے علاوہ دہلی، حیدرآباد، ٹونک، ممبئی اور کولکتہ کے اخبارات و رسائل کی زینت بنتا رہتا ہے۔ موصوف ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں لیکن ظریفانہ شاعری سے ایک خاص محبت و لگاؤ بلکہ عشق و جنون ہے۔

ان کے کلام میں تغزل بھی ہے اور طنز کی تیز کاٹ بھی، وہ بے حد زود گو شاعر ہیں انھوں نے اپنے خود نوشت سوانح حیات (منظوم) میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ آسمان ادب پر چمکنے کا انھیں جنون ہے جس کی فکر میں وہ سب کچھ بھلا کر شاعری کر رہے ہیں۔

بہر حال خدا نے انھیں ذوق سلیم کے ساتھ ساتھ ذوق سخن بھی عطا کیا ہے۔ ان کا یقین و وژن پُر عزم ہے اور انھیں امید ہے کہ وہ آسمان ادب پر ضرور اپنی جلوہ گری دکھا کر رہیں گے۔

ان کی شاعری پر کشش ہے روایتی انداز کو بھی انھوں نے شگفتہ و دل کش بنا کر پیش کیا ہے جس کی وجہ سے غزل پر مزاحیہ غزل کا شک ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اکبر الہ آبادی کے رنگ میں انگریزی الفاظ کا استعمال اپنی غزلوں میں خوب کیا ہے۔ کہتے ہیں شاعر اپنے آپ کو منوانے کے لئے کئی پینترے استعمال کرتا ہے۔ آج کل سنجیدہ شاعری سے زیادہ لوگ مزاحیہ شاعری پسند کرتے ہیں۔ اور مزاحیہ شاعروں کو اسٹیج پر جلوہ گر ہونے کے مواقع بھی خوب ملتے ہیں کیوں کہ آج کے غم والم، اسٹرس ٹینشن کے دور میں لوگوں کو ہنسنے ہنسانے اور قہقہے لگانے کا موقع میسر نہیں آتا ایسے میں طنز و مزاح کا شاعر ہی انھیں غذا فراہم کرتا ہے۔ اور اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طنز و مزاح کے شاعر اقلیت میں آتے ہیں جس کی وجہ سے انھیں ہر اسٹیج پر یاد کیا جاتا ہے۔

ہارون سیٹھ سلیم جہاں مزاحیہ شاعری کے لئے جانے جاتے ہیں وہیں ان کا اپنا ایک خاص مقام سنجیدہ شاعری میں بھی ہے۔لیکن ہم یہاں ان کی مزاحیہ شاعری پر روشنی ڈالتے ہیں۔ چلئے دیکھتے ہیں ان کی مزاحیہ شاعری کے کچھ نمونے:

میرے گھر جب نوکرانی آ گئی ☆ بوڑھے دادا پر جوانی آ گئی
نوکرانی سے یہ دادا نے کہا ☆ اے مرے سپنوں کی رانی آ گئی

مہنگائی کے اس دور میں ہر کوئی ملازمت و نوکری کرنے پر مجبور ہے، کیا جوان کیا بوڑھے، کیا مرد کیا عورتیں، کیا نوجوان لڑکیاں کیا نوخیز لڑکے ہر کوئی کام کرنے پر مجبور ہے۔بغیر کام کئے روٹی کا ایک نوالہ میسر نہیں ہے۔ ہر طرف صبح صبح لوگ دفتر کی طرف خرامہ خرامہ بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں:

اے سولہ برس کی جواں چھوکری ☆ تو کرتی ہے دفتر میں کیوں نوکری
کیا تیرے پتا جی کماتے نہیں ☆ یا بھیا ترے گھر چلاتے نہیں

آگے سلیم صاحب نے مشورہ دیا ہے اس کے نوکری چھوڑنے کا دیکھئے کہتے ہیں:

تو اپنی جوانی پہ اے چھوکری ☆ ترس کھا ذرا چھوڑ دے نوکری
جو مخدوم ہے تیرا بے درد ہے ☆ سلیم ایک ہے، جو کہ ہمدرد ہے

سلیم صاحب نے اکبر الہ آبادی کی طرح اپنے اشعار میں انگریزی لفظوں کا بھی خوب استعمال کیا ہے۔اور اس سے انھوں نے مزاح کا کام لیا ہے۔ان کی کئی ایسی غزلیں، ہزلیں اور فکاہیہ ہیں جس میں انھوں نے انگریزی کے الفاظ کا بڑے خیر وخوبی سے استعمال کیا ہے۔آج کے دور میں کئی اور شعراء اس طرف توجہ دینے لگے ہیں لیکن سلیم صاحب کے یہاں اس نوع کے سیکڑوں اشعار مل جاتے ہیں۔''حکایت پیر نابالغ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

کرنے لگے ہیں عشق میاں Old Age میں
دل ان کا جا پھنسا ہے پری وش کے Cage میں
تم نے جو میرے ساتھ کیا تھا معانقہ
تصویر چھاپ دوں گا صنم Front Page میں
غصے میں جب بھی آتے ہیں لگتے ہیں جانور
دیکھا نہیں کسی نے کبھی ان کو Rage میں

اسی طرح انھوں نے ایک عمدہ فکاہیہ Anglo Urdu کے عنوان سے لکھا ہے اس کے بھی چند اشعار دیکھیں کہ کس خوش اسلوبی اور مزاح کے انداز میں اپنی مافی الضمیر کی ادائیگی کرتے

ادبی دنیا میں جانے پہچانے جانے لگے، ان کی کہانیاں مضامین، غزلیں ہندوستان کے علاوہ پاکستان اور دیگر ممالک کے رسائل میں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کشمیر کی وادیوں سے نکل کر ان کی آواز آج ہندوستان بھر میں دور دور تک پہنچ چکی ہے۔ ۲۰۰۷ء کے بعد ہی وہ شاعر، اسباق تحریک ادب، بزم ادب، گل کدہ، لفظ لفظ، کاش (پاکستان) انتساب، شاندار اور صدا جیسے معیاری رسالوں میں چھپنے لگے۔ اس کے علاوہ اعظم گڑھ یوپی سے نکلنے والے رسالے قدیر نیاز جیراجپوری نے عمر فرحت پر ایک خصوصی ضمیمہ بھی نکالا۔ ان کا پہلا افسانہ 'بے رونق' کے عنوان سے 'مشرقی دلہن' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے خاموشی اختیار نہیں کی بلکہ اپنی کم عمری سے ہی لکھنے پڑھنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ ظاہر ہے جب کوئی شخص ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے تو ادب بھی اسے شہرت وعزت سے ہمکنار کر دیتا ہے اور اردو زبان تو پھر ایسی زبان ہے کہ جس نے اسے اپنایا شہرت وعزت اس کے قدم چومنے لگتی ہے۔ عمر فرحت نے اردو زبان سے عشق کیا، غزلیں، مضامین تبصرے لکھتے رہے اور چھپتے رہے اور اس طرح ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ جب اپنی ابتدا کی شاعری سے ہی اس طرح کے شعر کہنے لگے کہ ان کے روشن مستقبل کے امکانات صاف طور پر نظر آنے لگے۔

کسی بچھڑے ہوئے کی یاد کب سے
مرے کمرے میں روتی جا رہی ہے
رات کے شاید ایک بجا ہے
سوتا ہوگا میرا چاند

اتنے خوبصورت شعر جب وہ اپنی ابتدائی شاعری میں کہہ سکتے ہیں تو آگے چل کر وہ اردو شاعری میں کیا گل کھلائیں گے کہ ابھی سے وہ نئے نئے الفاظ سے اپنی شعری کائنات کو سجانے لگے مثلاً کمرہ۔ ایک بجے وغیرہ جیسے الفاظ کو سلیقے سے استعمال کرنا بھی ایک مشکل فن ہے کہ شاعری خاص طور پر غزل جیسی نازک صنف ایسے الفاظ کا بوجھ مشکل ہی سے برداشت کر پاتی ہے۔ عمر فرحت صرف شعر وشاعری تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ان کی ابتدائی تحریر شعر نہیں افسانہ تھا یعنی وہ نظم ونثر پر یکساں عبور رکھتے ہیں اور اب تو ایک اور بڑا کمال انھوں نے یہ کیا کہ ایک بہت ہی خوبصورت ناولٹ لکھ ڈالا جبکہ اردو میں شاعر تو ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں لیکن نثر نگاروں کا قحط ہے اور وہ ناول نگار جو کہ دور دور تک نظر نہیں آتے اور نئی نسل میں تو سہل پسندی اتنی در آئی ہے کہ ناول لکھنا تو دور کی بات ہے، ناول پڑھنے تک کا ان کے پاس وقت نہیں ہے، ایسے ماحول میں کوئی نوجوان ادیب اگر ناول لکھتا ہے تو واقعی یہ اس کا کارنامہ ہوگا اور یہ اس کے روشن مستقبل کا کھلا ثبوت ہوگا ''نرا کار'' عمر فرحت کا یہ

ہیں:

آپ کو دنیا اگر کمپلسری اچھی لگی
ہم کو لیکن یہ بلا ٹمپروری اچھی لگی
آندھرا کی آپ کو گوداوری اچھی لگی
اور ہمیں کرناٹکا کی کاویری اچھی لگی
ہم نے پوچھا آپ سے کیا شاعری اچھی لگی
آپ نے جل کر کہا کہ پوئٹری اچھی لگی

اسی طرح ایک الیکشن مینی فیسٹو کے بارے میں لکھتے ہیں:

میں بھی الیکشن F i g h t کروں گا
اپنا Bright - Future کروں گا
کام کروں گا ایسے ایسے
سب کا بھیجہ T i g h t کروں گا

آگے لکھتے ہیں:

گر میں الیکشن ہار گیا ، تو
دلی تک Right - Left کروں گا
واں سے الیکشن F i g h t کروں گا
اپنا فیوچر برائٹ کروں گا

سیٹھ سلیم یقیناً زبان و بیان کے سیٹھ و دھنی ہیں ان کی شاعری میں اُردو، عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی کے الفاظ اس طرح ضم ہو جاتے ہیں گویا کہ وہ اسی زبان کے اپنے الفاظ ہوں۔ ان کے اشعار دیکھنے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر کو کس قدر زبان پر قدرت ہے اور اس کا علم و مطالعہ بھی پختہ ہے۔ اور ظاہری بات ہے کہ آپ نے اپنے سارے اوقات کو اسی شاعری کے لئے وقف کر دیا ہے۔ زندگی کا مقصد ہی اچھی تخلیق پیش کرنا، ہنسنا ہنسانا، قہقہ لگانا اور لوگوں کے دلوں سے رنج و غم، آہ و بکا، نفر و عداوت کو مٹانا ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں:

لگائیں گے ہم قہقہے ایک ساتھ
سدا مسکرائیں گے ہم ایک ساتھ
بھلا کر زمانے کی سب رنجشیں

ہنسیں گے ہنسائیں گے ہم ایک ساتھ

ایک اچھا مزاح نگار وہی کہلاتا ہے جس کے اشعار سننے کے بعد قاری کے اندر سے اس کے رنج وغم کافور ہو جائیں۔ اس کے دل کی دنیا کھل جائے اور اس میں ایک نئی خوشی نیا جوش انگڑائیاں لینے لگے۔ دلوں کے رنج والم دور بھگانا ایک اچھے مزاح نگار کا کام ہوتا ہے، یہ سب چیزیں سلیم کی شاعری میں یقیناً ملتی ہیں۔

یہ محفل جو ہنسنے ہنسانے کی ہے
یہ رنج و اَلم کو بھلانے کی ہے

انھوں نے تمام اصناف سخن میں آزمائی کی ہے۔ ان کے یہاں جہاں غزلیں، نظمیں، نعتیں، حمدیں ملتی ہیں وہیں ان کے کلام میں تضمینیں، ہزلیں، فکاہیہ، ترانے، قصیدے، مرثیے اور شہر آشوب بھی کثرت سے نظر آتے ہیں۔

سلیم صاحب کو بچوں کی شاعری سے بھی خاص دلچسپی ہے۔ ان کے کلام میں بچوں کے لئے بھی بہت کچھ نظر آتا ہے۔ بلکہ اگر ان کے ذخیرۂ کلام پر کوئی نظر ڈالے تو وہ یقیناً ان کو ادب اطفال کا نمائندہ شاعر کہنے پر مجبور ہو جائے گا۔ ایک نظم ''گفتار مرغیاں'' بہت عمدہ ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ مرغے سے مرغی نے ہنس کر کہا
مرے بال بچوں کے تم ہو پتا
تمھیں ان کا رکھنا پڑے گا خیال
وگرنہ مجھے اس کا ہوگا ملال

اسی میں ایک شعر دیکھیں جو اس زمانے کے لحاظ سے بڑا ہی چبھنے والا ہے۔ آج کے اس ماڈرن زمانہ میں انسان کس طرح لڑکیوں کی پیدائش کو اچھا نہیں سمجھتا اس کی طرف شاعر نے اپنا نشانہ لگایا ہے۔

ہو بیٹا یا بیٹی مجھے غم نہیں
کسی سے بھی کوئی ذرا کم نہیں

بچوں کے لئے انھوں نے تتلیاں لالہ زار میں، مچھلیاں واٹر ٹینک میں، گفتار مرغیاں، بچے من کے سچے، تاج محل رُو یا میں، نانی کی کہانی اور مکھی وغیرہ بہت ہی عمدہ اور فنی لحاظ سے بھی قابل دید ہیں۔ بچے کے تعلق سے لکھتے ہیں:

جن کے گھر میں بچے ہیں

وصف و صفت کے اچھے ہیں
نیک و بد کا علم نہیں
ناداں ہیں پر سچے ہیں

اسی طرح انھوں نے گدھے کی سرگذشت، جس کے کل بارہ بند ہیں مخمس لکھ کر اپنی زبان پر قدرت کا شان دار مشاہدہ پیش کیا ہے۔ ایک مخمس آپ بھی دیکھیں اور لطف اندوز ہوں:

ہوکے دل برداشتہ اک دن گدھے نے یہ کہا
ہوئے رَبّا اب ہماری زندگی کس کام کی
دھوبیوں نے تو ہماری قوم کو ٹھکرادیا
فکر دامن گیر ہے ہم قوم کو انجام کی
اے خدا تو ہی بتا دھوبی نے ایسا کیوں کیا؟

یہ بات بھی بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جن شعراء کو بچوں سے محبت ہوتی ہے وہ بچوں کے ادب سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں، میں نے سیٹھ سلیم صاحب کو خود بھی اس کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا کہ یہ اپنے گھر کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں سے کافی محبت کرتے ہیں اور ان کی نفسیات کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسی طرح ان کی نفسیات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

جہاں یہ مزاحیہ شاعری کرتے ہیں وہیں کبھی کبھی ان کے اشعار میں غم وغصہ اور احتجاج کی شدت بھی دکھائی دیتی ہے اور ان کی حمیت وغیرت کو للکارتی ہے تو ان کا کلام تیز تلوار اور تیر ونشتر کا کام کرتا ہے۔ ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء مسلمانوں کے لئے ایک غم والم کی گھڑی تھی یعنی بابری مسجد کی شہادت، اس وقت یوپی کا وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ تھا جس نے بابری مسجد کے انہدام کے بعد مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے بعد اپنا سینہ ٹھونک کر کہا تھا: ''آج میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کام کیا ہے جس پر مجھے فخر ہے''۔ کلیان سنگھ کو جب بی جے پی سے نکال دیا گیا تو اس نے کچھ سالوں کے بعد سماج وادی پارٹی میں آنے کی کوشش کر ہا تھا اور مسلمانوں سے معافی مانگنا چاہتا تھا، اس وقت یہ خبر جیسے ہی اخبارات اور ٹی وی چینلوں میں گونجتے ہوئے ہارون سیٹھ سلیم صاحب کے پردۂ سماع تک پہونچی تو بس پھر کیا تھا سلیم صاحب بھڑک اٹھے ان کا پارہ گرم ہوگیا تو انھوں نے اپنی نظم ''آہ وفغاں'' کے ذریعہ سارے اخبارات میں یہ پیغام بھیج دیا اور اپنے غم وغصہ بلکہ اپنے غیض وغضب کا اظہار اس طرح کیا:

ضرورت نہیں تیری کلیان سنگھ
تو شیطاں صفت ہے اے شیطان سنگھ

تو دشمن ہے سر تا پا اسلام کا
ترا مدعا ہے برے کام کا
رہا مفسدوں کا تو ہی منتظم
جو مسجد کو تو نے کیا منہدم
ترے جیسا دنیا میں جاہل نہیں
تو دنیا میں رہنے کے قابل نہیں

آگے لکھتے ہیں:

معافی کا حقدار تو ہے نہیں
وفا کی ذرا تجھ میں بو ہے نہیں
ترے دل میں ڈر ہے نہ بھگوان کا
تو دشمن ہے اب بھی مسلمان کا

آپ نے گجرات سانحہ پر ''لہو رنگ مناظر کے نام!'' سے بہت عمدہ لکھا ہے اس کے چند بول دیکھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں:

تجھ کو خبر ہے بھارت میّا ☆ ڈوب رہی ہے تیری نیّا
اسی کے ہاتھوں ڈوب رہی ہے ☆ تو نے جس کو سمجھا کھویا

ہارون سیٹھ سلیم کو اپنے ملک و وطن اور خاص کر اپنی ریاست کرناٹک سے ایک غیر معمولی محبت ہے جو ہر ایک کو ہونی چاہئے لیکن شہر بنگلور سے تو ان کو عشق ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں:

خوب صورت شہر یہ بنگلور ہے
خلد کی مانند اس کا نور ہے
جنت ارضی اسے کہتے ہیں لوگ
''یہ زمانے میں بہت مشہور ہے''

☆☆☆

سیفی سرونجی

گوپی چند نارنگ اور غالب شناسی

پروفیسر گوپی چند نارنگ اس صدی کا سب سے بڑا اور اہم نام ہے۔ جس نے اپنی پوری زندگی اردو زبان وادب کی خدمت میں صرف کی ہے۔ ان کی زبان سے جو پہلا لفظ نکلتا ہے۔ وہ اردو ہے، سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے صرف اردو زبان کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اردو کا ایسا سچا عاشق آج دور دور تک نظر نہیں آتا۔ ان کے کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ درجنوں اسکالرمل کر بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری ہے اور ہر ماہ کوئی نہ کوئی کتاب کسی نہ کسی رسالے کا گوپی چند نارنگ نمبر منظر عام پر آجاتا ہے۔ امریکہ، لندن، جرمنی، پاکستان، ہندوستان دنیا کے تمام ممالک میں ان کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے اور کتابوں پر کتابیں آرہی ہیں اور آتی رہیں گی۔ اسی سلسلے کی یہ ایک کڑی ہے۔ ''گوپی چند نارنگ اور غالب شناسی'' جسے ایڈیٹر سبق اردو، دانش الہ آبادی نے ترتیب دیا ہے۔ یہ بات ساری ادبی دنیا جانتی ہے کہ پچھلے سال پروفیسر گوپی چند نارنگ نے غالب شناسی سے متعلق کتاب لکھ کر غالب شناسی کے نئے دروازے کھول دئے ہیں اور ایک ایسی کتاب لکھ ڈالی کہ غالب کو نئے سرے سے سمجھا اور پڑھا جانے لگا۔ نارنگ صاحب نے اس کتاب میں غالب کو از سر نو دریافت کیا اور اس کتاب نے مقبولیت کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ دنیا بھر کے رسالوں میں اس کتاب پر مضامین آنے کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہونے کا نام نہیں ہے۔ ہر رسالے میں تبصرے مضامین، اشتہاروں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس کتاب سے متعلق جتنے مضامین رسالوں میں شائع ہوئے، انہیں یکجا کر کے 'گوپی چند نارنگ اور غالب شناسی'

کے نام سے ترتیب دے کر سبق اردو کے ایڈیٹر دانش الہ آبادی نے شائع کیا ہے۔ جو چھ سو پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ جبکہ اس کتاب پر مضامین کے آنے کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اس کتاب میں تمام معتبر ادیبوں نقادوں نے لکھا ہے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اس کتاب کو غالب شناسی میں ایک نیا اضافہ قرار دیا ہے۔ انتظار حسین لکھتے ہیں:

''کلام غالب کی اب تک کتنی تعبیریں ہو چکی ہیں مگر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ غالب پر غور وفکر کرتے کرتے ایسی راہ کی طرف نکل گئے، جس کی شاید ہی کسی ماہر غالبیات کا دھیان گیا ہو۔ نارنگ صاحب کو تو یہ خیال آنا ہی تھا کہ اب ان کا اصرار اس پر ہے کہ اردو کی کلاسیکی شاعری حسن وعشق کے جس تصور کی امین ہے۔ اس کا سرچشمہ قدیم ہند کے افکار وتصورات میں ہے۔ سو شاید انھوں نے غالب سے بھی کچھ ایسے اشارے لئے اور قدیم ہند کے افکار وتصورات میں لمبی غوطہ زنی کر ڈالی۔ وہاں انھیں غالب کی فکر کے سرچشمے نظر آئے۔ ویدانتی فلسفہ، اور بودھی فکر، نارنگ صاحب کو اس پر بھی اصرار ہے کہ غالب نے اگر واقعی کسی فارسی شاعر سے گہرا اثر قبول کیا ہے، تو وہ سبک ہندی کا شاعر بیدل ہے۔ مگر بیدل اور غالب دونوں اگر کسی سے قریب ہیں، تو ان کی دانست میں وہ کوئی فارسی شاعر نہیں بلکہ بودھی فکر کا ترجمان مفکر ناگا جن ہے۔ مگر ادھر انھیں دریدا کی فکر کے ڈانڈے بھی ناگا جن کی فکر سے ملتے ہیں، نارنگ صاحب نے شعر غالب کی تعبیر کچھ اس طرح کی ہے کہ ایک طرف اس کا رشتہ ویدانتی فلسفہ اور بودھی فکر سے ملتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف اس کے ڈانڈے آج کل کی مابعد جدید فکر سے ملتے دکھائی دے رہے ہیں۔ یعنی اب ہم نارنگ صاحب کے واسطے سے غالب کی ایک یکسر نئی تعبیر کے روبرو ہیں۔ سو اب صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے۔'' (انتظار حسین)

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے غالب شناسی کے میدان میں ایک نئے اضافہ کا بیڑا اٹھایا اور اپنی کتاب ''غالب معنی آفرینی جدلیاتی وضع شونیتا اور شعریات'' جیسی ضخیم کتاب لکھ کر ساری ادبی دنیا کو یہ احساس دلا دیا کہ ابھی غالب کو سمجھنے کے لئے بہت سے نئے پہلو موجود ہیں۔ جن کی طرف نارنگ صاحب نے اشارے کئے ہیں اور غالب کو از سر نو دریافت کیا۔ یہ کتاب نارنگ صاحب کے برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ پتہ نہیں نارنگ صاحب غالب کے بارے میں کب سے سوچ رہے تھے، انھوں نے غالب کو سمجھنے کے لئے کیا کیا پڑھا ہوگا؟ تب کہیں جا کر ایسی نایاب تحریریں وجود میں آئیں

اوراب اس کتاب کے بعد جولوگ غالب سے متعلق چند مضامین یا ایک کتاب لکھ کر ماہر غالبیات کہلانے پر فخر کرتے تھے۔انھیں بھی دوبارہ سوچنے پر مجبور کردیا۔یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی مقبولیت نے ایک ریکارڈ قائم کیا۔اور بے شمار مضامین اس کتاب پر شائع ہوئے اور رسائل میں شائع ہوتے رہے۔انہیں مضامین کو یکجا کر کے دانش الٰہ آبادی نے گوپی چند نارنگ اور غالب شناسی کے نام سے شائع کی ہے۔اس کتاب میں پچاس سے زیادہ مضامین اور نارنگ صاحب کے غالب سے متعلق انٹرویو وغیرہ شامل ہیں۔انتظار حسین، افتخار عارف، سعید نقوی، ابوالکلام قاسمی، بیگ احساس، انور سن رائے، رؤف پاریکھ، شافع قدوائی، عارف وقار، ظفر اقبال، فرحت احساس، ناصر عباس نیر، علی احمد فاطمی، ف۔س۔اعجاز، حقانی القاسمی، نظام صدیقی، سیدہ جعفر، مولا بخش، مشتاق صدف، راشد انور راشد، متین ندوی، وسیم بیگم، قدوس جاوید، اصغر ندیم جیسے کئی معتبر شاعروں ادیبوں نقادوں نے مضامین لکھے۔کسی نے ٹی وی پر گفتگو کی، کسی نے اس کتاب کو موضوع بنا کر مباحثے کئے۔غرض یہ کہ گوپی چند نارنگ کی اس کتاب نے غالب کو دوبارہ پڑھنے سمجھنے پر مجبور کردیا اور اب وہ لوگ بھی اس کتاب کو پڑھ رہے ہیں۔جو ماہر غالبیات سمجھے جاتے تھے اور سوچتے تھے اب غالب سے متعلق نیا کہنے کا کچھ نہیں ہے۔مگر یوں لگتا ہے کہ غالب کو سمجھنے اور غالب کو پڑھنے کا اب وقت آیا۔نارنگ صاحب نے ایسی ایسی مثالیں دیکر غالب کو نئے سرے سے سمجھا اور دلائل سے اپنی بات کہہ کر غالب کو از سر نو دریافت کیا کہ ساری ادبی دنیا غالب کو دوبارہ پڑھنے پر مجبور ہوگئی۔بے شک ایسی کتاب صدیوں نہیں لکھی جاسکتی ہے۔اس کتاب نے عالمی ادب میں ایک ایسا رکارڈ قائم کیا کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔اس کتاب سے متعلق اگر سب کی رائے کی ایک ایک لائن ہی دینا شروع کردی جائے تو یہ مقالہ نہیں کتاب ہوجائے۔لیکن میں تو اس کتاب کے مرتب دانش الٰہ آبادی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے غالب شناسی اور گوپی چند نارنگ کے عنوان سے سارے مضامین کو یکجا کر کے کتاب شکل میں شائع کیا ہے۔وہ اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر گوپی چند نارنگ کو بے شمار ادبی انعامات اور اعزازی ڈگریاں مل چکی ہیں۔کئی تحقیقی مقالے، کئی کتابیں ان پر شائع ہوچکی ہیں، نیز کئی اہم رسالوں نے خاص نمبر شائع کئے ہیں، ان پر کہاں کہاں اور کتنا کام ہوا ہے۔شاید ان کو بھی اس کا علم نہ ہو کیونکہ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ۔وہ کسی کی برائی غیبت یا دل شکنی پر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔غالب کی شاعری ایک بحر زخار ہے۔وہاں سے اتنے بڑے اور چمکدار موتی وہی لاسکتا ہے۔جو صرف اپنے کام سے

کام رکھے ۔ نارنگ صاحب کی اس تازہ کتاب ''غالب معنی آفرینی جدلیات وضع شونیتا اور شعریات'' جیسی کوئی دوسری کتاب آنے میں صدیاں گزر سکتی ہیں ۔ بہت سے صاحبان نظر نے اس کتاب کی اشاعت کو ایک واقعہ قرار دیا ۔ سبق اردو کے اس خاص شمارے کی اشاعت کا اگر کوئی جواز ہوسکتا ہے ۔ یہی ہے اگر چہ اس راہ میں ایک چھوٹا سا قدم ہے۔

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بت آئینہ سجا نہ ہوا''

اس کتاب کی اشاعت کا جواز دانش الٰہ آبادی نے جو کچھ بتایا ہے، وہ اپنی جگہ درست ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ غالب سے متعلق نارنگ صاحب کی اس کتاب پر صحیح معنوں میں اب لکھنے کا وقت آیا ہے ۔ دھیرے دھیرے غالب کو سمجھا جانے لگا ہے اور اس کتاب کی روشنی میں لوگ دوبارہ غور وفکر کر رہے ہیں اور یہ سلسلہ اب ختم ہونے والا نہیں ہے ۔ ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے ۔ نارنگ صاحب نے تمام محققوں نقادوں کو غالب کے بارے میں دوبارہ غور وفکر کی دعوت دی ہے اور صدیوں اس کتاب کے حوالے سے غالب کی فکریات پر گفتگو کی جاتی رہے گی ۔ اس لئے کہ گوپی چند نارنگ نے غالب کے حوالے سے ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب کو سمیٹ لیا ہے اور غالب کو ہندوستان کی تہذیب کا ایک عظیم مینار قرار دیا ہے ۔ گویا نارنگ صاحب نے دیگر ممالک کے سامنے ہندوستان کی عظمت کا پرچم بلند کیا ہے۔

☆☆☆

لندن میں مقیم اردو پنجابی کے مشہور شاعر **مشتاق سنگھ**

کے شعری مجموعہ ''چاندنی چوک کی ایک شام''

کی کامیابی کے بعد- ان کا تازہ شعری مجموعہ

''چراغ قربتوں کے'' شائع ہو چکا ہے۔

ناشر: انتساب پبلی کیشنز، سرونج

سیفی سرونجی

چند سیپیاں سمندروں سے پروین شیر کا نیا کارنامہ

بلاشبہ پروین شیر کا یہ نیا کارنامہ کہا جائے گا اس لئے کہ اب تک انھوں نے اردو شاعری میں جو نئے نئے گل بوٹے کھلائے ہیں اور اردو نظم کے میدان میں اپنی ایک زبردست پہچان قائم کی ہے، اپنی تصویروں میں جو خون جگر صرف کیا ہے، وہ ادب کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا ۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور دیگر فنی کمالات پر دنیائے ادب کے تمام معتبر قلم کاروں نے کھل کر لکھا ہے اور ان کی صلاحیتوں اور ان کے فن کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، وارث علوی ، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر خالد محمود جیسے کئی بڑے نقادوں نے پروین شیر کے فن اور ان کی شاعری کو اس عہد کی آواز کہا ہے۔ 'کرچیاں' سے لے کر 'چند سیپیاں سمندروں سے' تک آتے آتے پروین شیر نے ادب کی دنیا میں اپنے لئے ایک قابل احترام جگہ بنالی ہے اور 'چند سیپیاں سمندروں سے' میں تو ان کی پوری تخلیقی توانائی اجاگر ہوگئی ہے۔ خلیل مامون نے اس کتاب پر سرنامہ کے عنوان سے جو تحریر لکھی ہے، وہ بہت جامع ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پروین شیر اردو ادبی دنیا کے لئے ایک معتبر نام ہے۔ یہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے کہ کوئی فن کار دو یا تین اصناف یا فنون میں دخل رکھتا ہو، ان سب میں اس کی حیثیت یکساں ہو بلکہ اردو معاشرہ تو اردو ادیب کو یہ الفاظ غالب یک فنا یعنی صرف ایک فن سے وابستہ ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ کتنا ہی اچھا شعر کہے جیسے ہمارے اقبال متین ہیں، ایک بار افسانہ نگار کی

چھاپ ان پر لگ گئی، بس وہ آخری مہر ٹھہری۔ وزیر آغا صرف نقاد ٹھہرے، فاروقی نے ناول بھی لکھا لیکن مخلوق خدا انہیں صرف نقاد دیکھنا چاہتی ہے، سرور صاحب اور خورشید الاسلام یہ کہتے کہتے اللہ کو پیارے ہو گئے کہ دیکھو ہم نے بھی شاعری کی ہے اور اس میدان میں ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں لیکن اس عظیم نقار خانے میں طوطی کے بول کا کیا گذر۔ یار لوگوں نے کان نہیں دھرے تو نہیں دھرے میری نظر میں ایک مثال ہے اور وہ ہے پروین شیر کہ جن کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ شاعری میں بڑی ہیں کہ مصوری میں۔ دونوں فنون میں انھوں نے لوہا منوالیا ہے۔ وہ ایک باخبر فن کار ہیں، بین الاقوامی سطح پر انسانیت عذابوں سے گذر رہی ہے اور انسان کی جانوں کی قیمت ارزاں ہے، اس کا انہیں شدید احساس ہے۔ وہ ایک حساس فنکار ہیں جیسا سوچتی ہیں جیسے تجربے سے گذرتی ہیں، اسے فنی پیرائے میں ڈھالنے سے گریز نہیں کرتیں۔ انہیں زندگی کا ہی گہرا شعور نہیں ہے، فن کا بھی شعور ہے، اس شعور کی گواہ ان کی مصوری بھی ہے۔ لفظوں کو رنگ بنانے اور رنگوں کو لفظ بنانے کے ہنر پر جسے قدرت ہو وہی شاعری اور مصوری دونوں میدانوں میں کامیاب ہو سکتا ہے اور اس کی کامیابی کا راز اس نسخے میں مضمر ہے۔''

خلیل مامون کی اس تحریر کو پڑھ کر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پروین شیر کو شاعری مصوری جیسے فن پر مکمل عبور حاصل ہے۔ اس اقتباس میں ان کی موسیقی کا ذکر نہیں ہے اور جب شاعری، مصوری اور موسیقی اگر کسی ایک فن کار میں یہ تینوں خصوصیات جمع ہو جائیں تو اس کا فن ایک شاہکار فن ہو جاتا ہے اور خدا نے یہ خصوصیات پروین شیر کو ودیعت کی ہیں۔ اتنی ڈوب کر لکھنے والی فنکار میں نے ابھی تک نہیں دیکھی، جس نے اپنی پوری زندگی فن کی بقا کے لئے وقف کر دی ہو، جس نے آرام و آسائش کی زندگی چھوڑ کر غربت کے دائروں میں بسنے والوں کے اندر جھانک کر دیکھا ہو، جس نے ان کے دکھ سکھ کو پہچانا ہو، کسی شاعر نے کہا ہے

اس شخص کا ضمیر کبھی جاگتا نہیں
جو دوسروں کے درد کو پہچانتا نہیں

پروین شیر نے دوسروں کے دکھ درد کو اتنی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ وہ ان کے فن میں مصوری میں شاعری میں لفظ لفظ میں سمو دیا ہے اور جس کرب کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ وہ ان کی تصویروں اور شاعری میں ایک ایسی درد بھری کیفیت قاری پر پیدا کر دیتی ہے کہ ہر قاری وہ تڑپ اور کسک اپنے دل میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ 'چند سیپیاں سمندروں سے' حالانکہ ان کا ایک سفر نامہ

ناولٹ یوں تو ایک رومانی ناولٹ ہے، جس کا ہیرو خدا پر یقین نہیں رکھتا لیکن وہ جس لڑکی سے محبت کرتا ہے، اس کا نہ صرف خدا پر یقین پختہ ہے بلکہ وہ روزہ ونماز کی بھی پابند ہے، دونوں کے خیالات نظریات دونوں میں زمین آسمان کا فرق، لڑکی مشرقی تہذیب کی دلدادہ اور لڑکا مغربی تہذیب کا دیوانہ۔ لڑکی بہت کوشش کرتی ہے کہ کسی طرح اسے راہ راست پر لے آئے اور اسے خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرا لے لیکن اس کی ہزار کوشش کے باوجود وہ کامیاب نہیں ہو پاتی۔ وہ خدا سے دعا کرتی ہے کہ خدا اسے ایمان کی توفیق عطا فرمائے۔ آخر ایک دن وہ ایک ایسے زبردست حادثہ کا شکار ہو جاتا ہے جہاں خدا کے علاوہ کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ اس حادثے کا اس کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوتا ہے کہ وہ بے اختیار خدا کے حضور سربسجود ہو جاتا ہے، اس پورے ناول میں جہاں ایک طرف تضاد وتکرار ہے، نظریاتی بحث ومباحثے ہیں وہیں دوسری طرف زندگی سے جڑے مسائل بھی ہیں۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ عمر فرحت نے اپنی کم عمری میں ہی اتنا اچھا ناولٹ لکھ ڈالا، جو زندگی کی خوشیوں اور محرومیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ نئی نسل کے لکھنے والوں کے لئے نئی راہیں کھول دی ہیں کہ آدمی اگر چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اس ناولٹ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا پیش لفظ ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار نور شاہ نے تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ پروین کمار اشک، پرویز مانوس، آنند لہر، ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب کے تاثرات بھی شامل ہیں۔ اس ناولٹ کو پرویز مانوس ترتیب دے کر شائع کر رہے ہیں۔ میں پرویز مانوس اور عمر فرحت کو اس ناولٹ کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں اور خدا سے دعا گو ہوں کہ یہ ناول ادبی دنیا میں کامیابیاں حاصل کرے۔

☆☆☆

سیفی سرونجی

کا ناول

ہاں ! میں دیش بھکت ہوں

شائع ہو چکا ہے۔

ناشر: انتساب پبلی کیشنز سرونج (ایم۔ پی۔)

ہے، اس میں بھی انھوں نے تخلیقی رنگ بھر دئے ہیں۔ جب ہم ان کی یہ کتاب پڑھتے ہیں، تو ایک سنسنی سی ذہن و دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی وہ نظمیں جو ایک دم ذہن پر کھلتی نہیں ہیں۔ ان کی معنویت کھلتی چلی جاتی ہے۔ اور ان کی وہ تمام نظمیں جو اکثر رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں یا 'کرچیاں' 'نہال دل' جیسی کتابوں میں ہیں۔ ان کی تخلیق کب ہوئی کیونکر ہوئی، اور کونسی کیفیت ان پر طاری ہوئی، جب یہ نظمیں وجود میں آئیں، وہ سارا تخلیقی پس منظر بھی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ کیوں لکھتی ہیں کیا لکھتی ہیں اور وہ کیا دیکھتی ہیں کونسا تجربہ یا حادثہ، واقعہ نظر سے گذرا جسے دیکھ کر ان کے دل میں یہ تڑپ پیدا ہوئی۔ انھوں نے کن کن مقامات پر کیا دیکھا، غربت کی آگ میں جھلستے انسانوں کو قیدیوں کو دیکھا، تو جو کچھ ایک بڑے تخلیق کار پر گزرتی ہے، اس ساری کیفیت کو تخلیقی روپ میں پیش کرنا واقعی پروین کا بڑا کارنامہ کہا جائے گا کہ انھوں نے اپنی شاعری اور مصوری سے ایک جہان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے اور اس طرح کہ آدمی اپنا دل پکڑ کر رہ جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں فکری بلندی اپنے عروج پر ہے کہ خدا نے یہ زمین کیوں بنائی اور کیسی بنائی اور اس میں کیا کیا رنگ بھرے سوچ کی ایک ایسی گہرائی ہے کہ اس میں ڈوبتے ہی چلے جایئے سرا نہیں ملے گا۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''یہ زمین نہ جانے کب سے خلا میں جھوم رہی ہے جیسے ایک کشتی ہمیں اپنی بانہوں میں سمیٹے ہوئے کائنات کے سمندر پہ تیرتی رہتی ہے۔ یہ زمین یہ جو محبت ہے، اپنے سوچ کی دیوانی ہے۔ پروانے کی طرف اپنے چراغ کے اردگرد منڈلاتی رہتی ہے۔ نجانے کب سے نہ جانے کب تک یہ زمین جو ہمیں ایک ماں کی طرح اپنے سینے سے لگائے رہتی ہے۔ جو پیار کی انتہا ہے۔ جو صرف دیتی ہے، کچھ نہیں لیتی، اسی کی کشش کے سہارے تو زندگی ہے۔ ورنہ سب بے خانماں ہوتے۔''

پھر پروین شیر نے نظم کہی 'ایک دنیا' اب نظم کو پڑھتے ہیں تو یہ ساری کیفیت ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ پروین شیر کی شاعری میں جو آفاقیت ہے، وہ بڑے بڑے شاعروں کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی کہ انھوں نے ساری کائنات کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے، بہت غور کیا ہے، بہت سوچا ہے، بہت سمجھا ہے، تب کہیں جا کر سمندروں سے موتی تلاش کئے ہیں۔ 'چند سیپیاں سمندروں کی' ایک ایسی کتاب ہے جس میں پروین شیر کی اپنی پوری تخلیقی قوت پرواز اور پوری زندگی کے تجربات کے ساتھ نظر آتی ہیں، سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب پر ہی ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے کہ اس میں اتنی وسعت اور گہرائی ہے کہ اختصار سے بات نہیں بنتی۔ ہاں پروین شیر کی یہ کتاب پڑھتے وقت مجھے ایک

واقعہ یاد آیا کہ برسوں پہلے دہلی میں ایک بزرگ تھے، جن کا نام رسول نما تھا، ان کا یہ کمال تھا کہ دوسرے سے دو ہزار روپے لیتے اور خواب میں حضور اکرمؐ کے دیدار کرا دیا کرتے تھے، اس لئے ان کا نام رسول نما پڑ گیا۔ ایک مرتبہ ان کی بیوی نے کہا کہ آپ نے اتنے لوگوں کو حضورؐ کے دیدار کرا دئے اور ہم ابھی تک محروم ہیں۔ انھوں نے کہا لائیے دو ہزار روپے، بس پھر کیا تھا، بیوی برس پڑیں کہ کبھی آپ نے پھوٹی کوڑی بھی دی جو میں دو ہزار روپے دوں۔ اچھا ایسا کرو نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن کر آجاؤ، اس پر بھی برس پڑیں کہ کبھی آپ نے ایک جوڑا بھی دلایا۔ اچھا ایسا کرو، وہ چوتھی کا جوڑا ہی پہن کر آجاؤ۔ بیگم گئیں نہا دھو کر چوتھی کا جوڑا پہن کر آ گئیں، تو انھوں نے بہت ہی مزاق اڑایا کہ بوڑھی گھوڑی لال لگام اور جانے کیا کیا، وہ اس صدمے سے بے ہوش ہو گئیں اور اسی بے ہوشی میں انھوں نے حضورؐ کے دیدار کر لئے، مسکراتی ہوئی اٹھیں کہ جائیے آپ کیا دیدار کرائیں گے ہم نے تو کر لئے۔ بزرگ نے کہا، نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ تم نے حضور کے دیدار کو یوں ہی سمجھ لیا، جب تک دل میں تڑپ پیدا نہ ہو، تب تک دیدار نہیں ہو سکتے۔ تمہارا مزاق اڑایا تو دل پر چوٹ لگی، دل میں تڑپ پیدا ہوئی، تو دیدار ہوئے، میں دوسروں سے بھی پیسے اس لئے لیتا ہوں کہ انھیں احساس تو ہو، دل میں تڑپ تو پیدا ہو۔ بس دل میں تڑپ ہی یہ بات پیدا کرتی ہے۔ پروین شیر کی شاعری میں یہی تڑپ اور درد شدت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اسی تڑپ سے وہ ایسے تخلیقی نمونے پیش کر رہی ہیں اور 'چند سیپیاں سمندروں سے' ایک ایسی ہی کتاب ہے، جس میں پروین شیر نے اپنی زندگی کی تڑپ کو سمو دیا ہے اور فن کو شاہکار بنا دیا ہے۔ دیکھئے سفر کے دوران انھوں نے ایک جگہ کی تصویر کچھ یوں کھینچی ہے:

''ٹاون شب ٹور میں سیاحوں کے لئے وہاں رہنے والے ایک خاندان کے گھر کا ٹور بھی شامل تھا، وہ ایک خستہ حال دو کمروں کا گھر تھا، در و دیوار بد حال تھے، اجڑے ہوئے رنگ تھے۔ ادھڑے ہوئے پلاسٹر کی پپڑیاں یوں لگ رہی تھیں، جیسے خشک ہونٹوں پر پپڑیاں ہوں۔ کمزور ستون پر ٹین کی چھت ٹکی ہوئی تھی، ایک باتھ روم صحن میں تھا جسے ہمسائے بھی استعمال کرتے تھے۔ اس دو کمروں کے گھر میں نو افراد رہ رہے تھے، اپنے ضعیف والدین کے ساتھ دو نوزائدہ بچوں کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں بیڈ اور ٹیبل کے درمیان چلنے کی جگہ بھی نہیں تھی، چھوٹی سی کھڑکی سے روشنی بھی سہمی ہوئی ذرا ذرا سی اندر آ رہی تھی۔ اس خستہ حال مقام پر آنے سے کترا رہی تھی لیکن بے دلی سے رحم کھا کر اندر آ رہی تھی، اسے کینیڈا میں اپنا روشن خوش حال کمرہ آ گیا تھا، اسے اپنے آپ سے ایک انجانی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک کمرہ ضعیف باپ کا تھا، نیم روشن، چھوٹا سا پرانا بستر اور چھوٹا

سارنگ اڑا ہوا بیڈ تھا، ایک عورت اندھیرے گوشے میں اپنے نوزائدہ بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔''

یہ اقتباس پڑھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پروین شیر نے اپنے اس سفرنامے میں کتنے قریب سے غربت میں پلنے والے ایک کنبے کو دیکھا اور ان کے دکھ درد کو کس طرح محسوس کیا کہ گھر کی ایک ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ بوڑھا باپ، پرانا بستر، کچی دیواریں ٹین کی چھت حد تو یہ ہے کہ باتھ روم تک کی تصویر دکھا دی، پروین شیر چونکہ ایک بڑی مصور بھی ہیں، اس لئے ان کی آنکھ نے جو کچھ دیکھا، وہ ہو بہو محفوظ کر لیا اور اپنے تخلیقی ذہن سے اس میں رنگ بھرا ہے۔ جب ہم پروین شیر کی یہ کتاب پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے گویا ہم ان کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے اور وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو پروین شیر دیکھ رہی ہیں اور انھوں نے وہی سب کچھ قارئین کو بھی دکھایا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ایک اور بات پیدا ہوئی کہ اب تک ان کی شاعری جو ہم پڑھتے چلے آ رہے ہیں، ان میں کئی نظمیں ایسی ہیں کہ ان کی معنویت کی تہہ تک ہم نہیں پہنچ پا رہے تھے لیکن جب یہ کتاب پڑھی تو وہ نظمیں جنھیں ہم اب تک سرسری طور پر پڑھتے رہے تھے، ان کی معنویت کی پرتیں ہم پر کھلتی چلی جاتی ہیں اور ان نظموں کی تخلیقی معنویت سے ذہنوں میں ایک گہری سوچ، فکر میں مبتلا کر دیتی ہے اور سمجھ میں آتا ہے کہ پروین شیر نے یہ نظم کب کہی ہے، کیوں کہی ہے اور اس کے تخلیق ہونے کا جواز کیا ہے۔ اس لئے کہ اس کتاب میں پروین شیر نے جو سفر کئے ہیں، جو کچھ دیکھا ہے، جس دکھ درد سے وہ آشنا ہوئی ہیں، وہ قاری کو بھی اسی احساس تک پہنچانا چاہتی ہیں۔ انسانیت کی قدروں کو اجاگر کرتی ہیں۔ انسان میں ہمدردی، پیار محبت کے جذبات کو بیدار کرتی ہیں، 'چند سیپیاں سمندروں سے' نہیں چنی بلکہ سمندروں سے انھوں نے ایسے موتی تلاش کر لئے ہیں کہ جن کی چمک دمک سے جہاں ایک طرف قاری چکا چوند ہو جاتا ہے، وہیں دوسری طرف اپنے دل میں ایک ٹیس ایک تڑپ بھی محسوس کرتا ہے۔ پروین شیر نے ہمیں بہت کچھ دکھایا اور سمجھایا ہے۔ انھوں نے دنیا کے کئی ممالک کا سفر کیا ہے اور دبے کچلے طبقے کے دکھ درد کو دل سے محسوس کیا ہے۔ اسی احساس کی شدت سے انھوں نے اپنے قاری کو آشنا کرایا ہے۔

☆☆☆

نثار احمد صدیقی

مکالمہ

افسانوی ادب پر-عبدالصمد سے گفتگو

*اپنی ذاتی وادبی کوائف بتایئے؟

**میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا، مگر ہوش سنبھالا تو زمینداری جا چکی تھی۔ کھیت اور جائداد یں تھیں، جن کی بنیاد پر شان وشوکت کی گرتی ہوئی دیواریں کسی طرح برقرار رکھی گئیں۔ ہم چار بھائیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ان دیواروں کو سنبھال لیا اور اب اللہ کا شکر ہے۔

گھر میں کوئی خاص ادبی ماحول نہیں تھا۔ پر دادا حافظ عبدالمجید اثر ایک قادرالکلام شاعر تھے، ان کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا مگر ان کی کچھ غزلیں دستیاب ہوئی تھیں۔ انہیں قائم چاند پوری سے شرف تلمذ تھا۔ دادا بھی شاعر تھے۔ والد صاحب (جناب محمد شبلی مرحوم) کو ادب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، البتہ وہ شاعری سننے کی حد تک اس کے شائق ضرور تھے۔ والدہ محترمہ کو شروع ہی سے لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اچھے ادب کی پرکھ رکھتی تھیں۔ وہ ایک پردہ نشیں خاتون رہی ہیں۔ اپنے شوق کی تکمیل میں باہر نکلنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے جب کہ میری عمر نو دس سال کی ہوگی بہار شریف کی ایک اردو لائبریری کا ممبر بنوایا۔ وہ کتابوں کے نام لکھ کر مجھے بھیجتی تھیں اور لائبریری سے کتابیں منگواتی تھیں۔ ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ انہیں ''شکوہ وجواب شکوہ'' تقریباً زبانی یاد تھا۔ حجاب امتیاز علی کے اکثر کرداروں سے ان کی گہری واقفیت تھی۔ ایسے ماحول میں ادب سے میرا واسطہ پڑا۔ وہ گھر میں کئی ادبی رسالے بھی منگواتی تھیں۔ انہوں نے ہم بھائیوں کے لئے ''کھلونا''، ''کلیاں'' اور بچوں کے کچھ دوسرے رسالے جاری کرادئے تھے۔ ساڑھے دس سال کی عمر میں ''غنچہ'' (بجنور) میں میری پہلی کہانی ''جھوٹ کی سزا'' شائع ہوئی تھی۔ اس کے محرک اس وقت کے مشہور افسانہ نگار جناب

جنید شرفی تھے، جو میرے چچا پروفیسر نہال احمد کے دوست تھے۔ آپ کو میں ایک بات بتاؤں، یہ جو خاصی تعداد میں بچوں کے رسالے نکلتے تھے ان کے ذریعہ ادب کی ایک طرح سے ٹریننگ ہو جاتی تھی، لکھنے پڑھنے کا فطری شوق جلا پاتا تھا۔ آج ادب سے شوق میں وہ خلوص اور ایمانداری باقی نہیں رہی تو اس کی ایک بڑی وجہ بچوں کے ادب پر توجہ نہیں دینا بھی ہے۔

* آپ اپنی چند پسندیدہ کہانیوں کے نام بتائیں۔ ان کی تفہیم کے سلسلے میں ایک قاری کی حیثیت سے آپ کیا کہیں گے؟

** بھئی میرا معاملہ یہ ہے کہ جب میں اپنے بہترین افسانوں کا انتخاب کرنے بیٹھتا ہوں تو مجھے کوئی افسانہ بہترین نظر نہیں آتا اور جب میں خراب افسانوں کو منتخب کرتا ہوں تو کوئی افسانہ اتنا خراب دکھائی نہیں دیتا کہ اسے ایسی کسی فہرست میں شامل کیا جائے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ میں نے کچھ اچھے افسانے بھی لکھے ہیں اور یقیناً خراب افسانے بھی لکھے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو افسانہ میری نگاہوں میں بہت اچھا نہیں، وہ دوسروں کی نگاہوں میں بہت اچھا ہوتا ہے اور جسے میں اچھا سمجھتا ہوں وہ دوسروں کی نگاہوں میں قابل اعتبار نہیں ٹھہرتا۔

ایک بات میں واضح کر دوں، اگر چہ یہ بات اب گھسی پٹی ہو گئی ہے کہ جو افسانہ میں لکھنا چاہتا ہوں، وہ میں ابھی تک نہیں لکھ سکا۔ جب بھی لکھنے بیٹھتا ہوں تو ارادہ یہی ہوتا ہے کہ یہ افسانہ میرا بہترین افسانہ ہوگا، مگر خاتمے کے بعد مایوسی ہوتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرے افسانوں کی تفہیم کا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ میں اپنی تحریروں سے اپنے ذہین قاری کو مایوس نہ کروں۔ ویسے کچھ لوگ میرے افسانوں پر سپاٹ بیانیہ کا الزام لگاتے ہیں، جس کی میں تردید کرتا ہوں۔ یہ ایک لمبی بحث ہے جس پر گفتگو پھر کبھی۔

* ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید کہانیوں میں ہم کس طرح امتیاز برت سکتے ہیں۔ امتیازی اوصاف کی روشنی میں آپ اپنی کہانیوں کے متعلق کیا کہنا چاہیں گے؟

** افسانہ کے سلسلے میں سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہی جا سکتی کہ افسانہ یا تو اچھا ہوتا ہے یا برا۔ ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید افسانوں میں سوائے اچھے اور برے کے اور کوئی امتیاز نہیں برتا جا سکتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ ترقی پسند دور میں جو بہترین افسانے لکھے گئے کیا وہ پرانے افسانے کہے جائیں گے—؟ میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب کا وہ ایک سنہری دور تھا جس میں ادب کو گویا عبادت کا درجہ حاصل تھا۔ جو لکیریں اس وقت بنائی گئیں، لگ بھگ وہی لکیریں آج بھی برقرار ہیں۔ آپ جو چاہیں انہیں نام دے دیں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بارے میں کیا عرض کروں، میں نے

اپنے افسانوں پر کسی نظریے یا تحریک کا ٹھپہ نہیں لگنے دیا۔ یہ تو پڑھنے والے بتائیں گے کہ ان افسانوں کو کس زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ویسے میں نے اپنے افسانوں میں وقت کی دھڑکن کو سمونے کی پوری کوشش کی ہے اور نہیں جانتا کہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔

* علامتی و تجریدی افسانوں کے سلسلے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟ کیا اس کے بغیر کوئی اعلیٰ سطح کا افسانہ نہیں لکھا جا سکتا؟ جواب تفصیل سے دیں۔

* * اعلیٰ اور عمدہ افسانہ کے لئے علامتی اور تجریدی کی کوئی شرط قابل قبول نہیں ہے۔ کیا بیانیہ انداز میں اعلیٰ افسانے نہیں لکھے گئے — علامتی اور تجریدی انداز میں بھی بہت معیاری افسانے لکھے گئے۔ اصل چیز یہ ہے کہ افسانہ نگار کو یہ بہ خوبی معلوم ہونا چاہئے کہ اسے کیا لکھنا ہے اور کس انداز میں پیش کرنا ہے۔ علامتی اور تجریدی افسانہ اس لئے بدنام ہوا کہ بعض افسانہ نگاروں کو ان کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں تھا اور انہوں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی یا یوں کہئے کہ فیشن کے طور پر علامتی و تجریدی افسانہ لکھنے کی کوشش کی۔ میں علامتی و تجریدی افسانوں کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ ساتھ ہی بیانیہ کو بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ٹریٹمنٹ کسی افسانے کو چھوٹا یا بڑا بناتا ہے۔ افسانہ لکھنا ایک فن ہے۔ ہر قسم کی تحریریں فن کے زمرے میں نہیں آتیں۔ افسانہ لکھنا راتوں رات نہیں آجاتا، اس کے لئے محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یوں اس کی صلاحیت فطری اور خداداد تو ہوتی ہی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

* ۱۹۸۰ء کے بعد افسانہ نگاری میں آپ کن کن افسانہ نگاروں کے یہاں انفرادیت پاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کیا خوبیاں و خامیاں ہیں؟

* * ۱۹۸۰ء کے بعد جو افسانہ نگار سامنے آئے ہیں ان کے ہاں بہت ٹیلنٹ ہے۔ وہ اپنے پچھلے لوگوں کی طرح، طرح طرح کے تجربات سے نہیں گزر رہے ہیں۔ انہوں نے افسانہ کی جڑ کو پکڑا ہے اور افسانہ کے منصب سے واقف ہیں۔ ان کے ہاں ترسیل کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ان کے ہاں بہت مضبوط بیانیہ ملتا ہے۔ ویسے بیانیہ کے سلسلے میں لوگوں نے جو بھرم پھیلایا ہے اس سے میں ہرگز اتفاق نہیں رکھتا۔ جو افسانہ نگار بھی لکھتا ہے، وہ پوری ذمہ داری سے لکھتا ہے۔ اب یہ ہے کہ ہر لکھنے والے کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے جو اس کی تحریر میں نظر آتی ہے اور میں آپ سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ افسانہ یا تو اچھا ہوتا ہے یا برا۔ کچھ لوگوں کے ہاں کمزور افسانے بھی ملتے ہیں۔ الگ الگ نام لینا مناسب نہیں، مگر میں اردو افسانے کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ مجھے اطمینان ہے کہ افسانہ مضبوط ہاتھوں میں جا رہا ہے۔

* اردو کہانی میں نعرہ بازی کی تحریک یا رجحان کے کھوکھلے چکر میں کہانی کو کہانی ہونا نصیب نہیں ہوا۔

اس جملے سے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

** پہلے یہ بتایئے کہ یہ جملہ ہے کس کا—؟ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ اردو افسانہ طرح طرح کے تجربات سے گزرا ہے۔ اس پر کچھ کڑا وقت بھی آیا ہے۔ لیکن کسی تحریک یا رجحان نے افسانے کا کچھ نہیں بگاڑا۔ افسانہ آج بھی ایک توانا اور مضبوط صنف ہے اور اس میں آگے بڑھنے کے بڑے امکانات ہیں۔ ترقی پسند دور تو اردو افسانے کا نشاۃ ثانیہ تھا، اس وقت جو افسانے لکھے گئے، وہ ہمارا بیش بہا سرمایہ ہیں اور ہم ان پر جتنا فخر کریں کم ہے۔ جدیدیت کے دور میں اگرچہ ایک ایسا دریا بہہ نکلا تھا جس میں ہر کس و ناکس نے ہاتھ دھونے کی کوشش کی، علامتوں اور استعاروں کا غلط مطلب سمجھا گیا یا سمجھایا گیا، پھر بھی اس دور میں بھی بے شمار اعلیٰ اور عمدہ افسانے تحریر کئے گئے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ افسانے کا سفر جاری و ساری رہا اور درمیان کے کچھ عرصے کو چھوڑ دیں تو افسانے نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ آج کا افسانہ تو ہر طرح کی نعرہ بازی اور رجحان سے یقیناً باہر نکل آیا ہے۔ اس نے تو اپنے کڑے وقت میں بھی کہانی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ تجربات کوئی بری چیز نہیں، اس سے بہر کیف فائدہ ہی ہوتا ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ ہم لکیر کے فقیر نہ بنے رہیں۔ نئی اور تازہ ہوا کو ہمیں ضرور قبول کرنا چاہئے۔

* جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نام پر جو کہانیاں لکھی جارہی ہیں، اس سے آپ کہاں تک متفق ہیں؟

** میں افسانے کو جدیدیت، مابعد جدیدیت یا کسی بھی خانے میں رکھنے یا اس پر کوئی لیبل لگانے کا سخت مخالف ہوں۔ دراصل کچھ تنقید نگاروں نے اپنی سہولت کی خاطر اس قسم کی خانہ بندی کر رکھی ہے۔ آپ بتایئے کہ منٹو، بیدی اور قرۃ العین حیدر کے افسانوں کو آپ کس خانے میں رکھیں گے—؟ فن ایک ایسا تابدار ہیرا ہوتا ہے کہ اسے پردوں میں چھپا کر رکھئے، اس کی آب اور تاب چھپ نہیں سکتی۔ جو لوگ اردو افسانے کی تاریخ مرتب کرتے ہیں انہیں اس قسم کی درجہ بندی سے آسانی حاصل ہو جاتی ہے، ورنہ افسانہ افسانہ ہے آپ اس پر جو لیبل لگایئے اس سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

* آپ کے ہم عصر افسانہ نگار شوکت حیات، حسین الحق، سلام بن رزاق اور پیغام آفاقی کے افسانوں سے متعلق اپنے ٹھوس تاثرات پیش کیجئے؟

** آپ نے میرے ہم عصر افسانہ نگاروں کے نام لے کر مجھے سخت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم عصروں پر ایماندارانہ اظہار خیال کرنا کتنا کٹھن امر ہے۔ ظاہر ہے، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ہر افسانہ نگار کے پاس کچھ اچھے افسانے ضرور ہیں۔ ساتھ ہی کچھ خراب

افسانے بھی۔ آپ نے جن لوگوں کے نام لئے ہیں ان میں کچھ ناموں کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ساجد رشید، شموئل احمد، انور قمر، انور خاں، غضنفر وغیرہ۔ بہر کیف، یہ سبھی بڑے اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان سب کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ کوئی ٹریٹمنٹ کا بادشاہ ہے، کسی کے پاس پیشکش کا انوکھا انداز ہے، کسی کے پاس اچھے موضوعات ہیں، کسی کی اپنے فن اور موضوع پر زبردست گرفت ہے۔ کسی کے پاس زبان و بیان ایسا ہے کہ اور کچھ نہ ہو پھر بھی ان کی تحریریں افسانہ بن ہی لیتی ہیں۔ الگ الگ تاثرات پیش کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ میرے سارے ہی ہم عصر مجھے بہت عزیز ہیں اور میں ان کے بغیر اپنے افسانوی سفر کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

* عصمت چغتائی کے افسانوی لب ولہجہ سے متعلق آپ کا ذاتی نظریہ کیا ہے؟

** وہ ایک منفرد لب و لہجے کی مالک ہیں۔ وہ جس انداز میں افسانہ لکھتی رہی ہیں وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکا۔ انہوں نے بے شمار لکھنے والوں کو متاثر کیا۔ لاشعوری طور پر انہیں بھی جوان کی عظمت کے سامنے سر جھکانے سے انکار کرتے ہیں۔ عصمت چغتائی ہمارے افسانوی ادب کا ایسا سرمایہ ہیں جن کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوگی۔ ان کا ایک انفرادی انداز تھا جو نقل کرنے کے باوجود بہتوں کو نصیب نہ ہو سکا۔ فکشن کے تعلق سے انہیں خداداد صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں۔ اصل بات یہ ہے کہ عصمت جیسی ہستی ہمارے ادب کا وہ سرمایہ ہیں جن پر ہمیں فخر ہے۔

* چند ترقی پسند فنکاروں کا خیال ہے کہ افسانہ منٹو، عصمت اور کرشن چندر سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو کیوں کر؟

** میں اس بات سے قطعی اتفاق نہیں رکھتا۔ اردو افسانہ منٹو، عصمت، کرشن چندر، بیدی، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی اور سہیل عظیم آبادی کے دور میں اپنے عروج کو پہنچا تھا۔ مگر اس کے بعد اس کا آگے کا سفر ختم نہیں ہوا بلکہ یہ بام عروج کی طرف بڑھتا رہا۔ قرۃ العین حیدر، غیاث احمد گدی، محمد منشایاد، انتظار حسین، اقبال مجید وغیرہ وغیرہ اس سلسلے کو بڑھاتے جایئے تو کافی لمبی فہرست بن جائے گی۔ ان لوگوں نے اردو افسانے کو یقیناً بہت آگے بڑھایا۔ ان کے ہاں اور ان جیسے کچھ دوسرے لوگوں کے ہاں ضرور ایسے افسانے مل جائیں گے جنہیں بہت فخر کے ساتھ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھے گئے اعلیٰ افسانوں کی فہرست میں رکھا جا سکتا ہے۔

* اردو ادب میں آج سے بیس سالوں کے اندر کون سا ایسا معیاری ناول لکھا گیا ہے جس نے آپ کو متاثر کیا ہے۔ کیا ترقی پسند ادب کے زمانے کا ناول ''خدا کی بستی''، ''آگ کا دریا'' اور ''اداس نسلیں'' سے بہتر اور معیاری ناول ہے؟ اگر ہے تو کیوں کر؟

** آپ نے بیس سال کی قید لگا کر اپنے سوال کو بہت کٹھن بنا دیا ہے یعنی اس کا جواب دینا میرے جیسے آدمی کے لئے بہت مشکل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پچھلے بیس سالوں کے اندر کوئی ایسا معیاری ناول نہیں لکھا گیا جو ''آگ کا دریا''، ''خدا کی بستی''، ''اداس نسلیں'' اور اس قبیل کے دو چار اور معیاری ناولوں کی صف میں رکھا جا سکے۔ اس معاملے میں پھر ترقی پسند دور کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس وقت جو ناول لکھے گئے (کوئی ضروری نہیں کہ ناول نگار ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر رہا ہوں) اس معیار کے ناول پھر نہیں لکھے گئے۔ آپ اسے خود پسندی نہ سمجھیں تو میں عرض کروں کہ پچھلے پچیس تیس سالوں کے جمود کو میرے ناول ''دو گز زمین'' نے توڑا۔ اس کے بعد ناول لکھنے کا ایک سلسلہ سا چل پڑا۔ کچھ اچھے ناول بھی منظر عام پر آئے۔ مگر ترقی پسند دور نے جو ایک معیار قائم کر دیا تھا اس معیار تک پہنچنا مشکل نظر آتا ہے، لیکن میں مایوس ہرگز نہیں ہوں۔ ابھی ذوقی اور غضنفر کے علاوہ کچھ اور لوگ بہت عرق ریزی اور خلوص کے ساتھ لکھنے میں مصروف ہیں اور یقیناً ان کے قلم سے کوئی ایسا ناول ضرور سامنے آئے گا جو ہماری تمام تر تشفی کر سکے اور ہم فخر سے اسے اپنے دور کے ساتھ معنون کر سکیں۔

* ''آگ کا دریا'' ایک اوسط درجے کا ناول ہے کیوں کہ اس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ تاریخ اس ناول کی بازیافت کا حصہ نہیں بنتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ناول میں بعض مقامات پر دس دس بیس بیس صفحوں میں تاریخی واقعات کی کھتونی پیش کی ہے۔ جنہیں اگر نکال دیا جائے تو ناول پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان جملوں سے متعلق اپنا خیال ظاہر کیجئے؟

** آپ اپنے سوالات کسی quatation سے کیوں شروع کرتے ہیں — ؟ کس نے کس کے بارے میں کس خیال کا اظہار کیا، اس کی کیا اہمیت ہے — ؟ لوگوں کے اپنے اپنے تعصّبات اور تحفظات ہوتے ہیں اور کوئی ضروری نہیں کہ ہم اور آپ اس سے اتفاق بھی کریں۔ ''آگ کا دریا'' ہرگز ایک اوسط درجے کا ناول نہیں ہے بلکہ بلا شبہ اول درجے کی تخلیق ہے۔ ایسا ناول صدیوں میں لکھا جاتا ہے۔ تاریخ کی بازیافت ہی تو اس ناول کا کمال ہے۔ اردو میں تو طرح طرح کی باتیں ہمیشہ کی جاتی ہیں۔ یہی ناول کسی دوسری زبان میں لکھا جاتا تو پتہ نہیں اسے کیا مقام ملتا۔ ناول طویل ضرور ہے لیکن اس کی طوالت کہیں بھی ناگوار محسوس نہیں ہوتی۔ مصنفہ نے اس ناول پر بہت محنت کی ہے اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ اس کے کسی پیراگراف کو بھی نکالنے کی جرأت کرے۔ دراصل اس قسم کی باتیں وہی کرتے ہیں جو اس ناول کی روح تک پہنچنے میں ناکام رہتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر ایک ایسی فنکار ہیں جو ناول اور افسانے دونوں میں کمال رکھتی ہیں اور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ کسی ناول یا افسانے کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس کے چند صفحات یا چند پیراگراف نکال دے جائیں تو اس

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

پروفیسر مختار شمیم

ڈاکٹر سید تقی عابدی اور فیض شناسی کے چند پہلو

اردو تحقیق وتنقید کے باب میں کتنی ہی دلآویز شخصیتیں ہیں، جو ہمارے لئے باعث افتخار ہیں، انہیں میں سے ایک مشفق خواجہ مرحوم اور ان کے بعد اب ڈاکٹر سید تقی عابدی ہیں، جنھیں بلاشبہ معاصر اردو ادب کی آبرو کہا جاسکتا ہے۔

ادب سے دیوانگی کی حد تک مشفق خواجہ کے ذوق وشوق کی حکایات صفحہ در صفحہ ان کی تصنیفات میں موجود ہیں۔ ان کے جیسا ذہن رسا اور ان کے مطالعہ کی جہت نے یقیناً ایک عالم کو فتح کیا۔ لیکن اسی دوران ڈاکٹر سید تقی عابدی کی سحر انگیز شخصیت نے جہانِ ادب کو متوجہ کیا اور اپنے پاکیزہ تحقیقی وتنقیدی ذوق کی بدولت جلد ہی اپنی ادبی فتوحات کا اعلان بھی کر دیا۔ مملکت ادب کے شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ بھی ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ان کارناموں پر انگشت بدنداں ہیں۔ بقول میر انیس ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی مہاجر زندگی نے جو پیشہ اپنایا، وہ مسیحائی کا ہے۔ تاہم مسیحائی نے انسان اور انسان کے دکھ اور درد کی پہچان کرائی اور ادب سے ان کا رشتہ مضبوط کیا۔ اسی کے ساتھ مذہبی، اخلاقی اور سماجی بصیرتیں انہیں راہ دکھلاتی رہیں۔ یہاں تک کہ زندگی کی تہذیب کے لئے ان کی تنقیدی فکر نے اعلیٰ ادبی معیار قائم کیا اور تحقیقی شعور نے عرفان وآگہی اور بصیرت وفضیلت کی راہیں ہموار کیں۔

فن پارے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا یا وہ فن پارہ اور نکھر جائے گا۔ یہ بات کہنے والا شاید یہ نہیں جانتا کہ لکھنے والے نے ان چند صفحات یا چند پیراگراف لکھنے میں اپنا کس قدر خون جلاتا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہی حصے اس کی نگاہوں میں اہم ترین ہوں۔

* آپ کا کون سا ناول اردو ادب میں مقبول رہا اور کیوں؟ اس ناول میں کیا خوبیاں ہیں؟ بیان کیجئے۔

** آپ بھی جانتے ہیں کہ ''دوگز زمین'' کو جو مقبولیت اور شہرت نصیب نہیں ہوئی وہ میرے کسی اور ناول کے نصیب میں نہیں آسکی۔ اسے ساہتیہ اکادمی اور دوسرے اہم انعامات سے نوازا گیا۔ یہ ہندوستان کی بائیس زبانوں میں ترجمہ ہوکر شائع ہوا۔ بنگلہ، ہندی اور انگریزی میں تو اسے جو شہرت ملی وہ شاید اردو میں بھی نہیں ملی۔ دراصل اس میں جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ پاکستان کی تقسیم یعنی بنگلہ دیش کے وجود تک آگئی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بنگلہ دیش کے قیام کے پس منظر میں لاکھوں بنگالیوں اور بہاریوں کے خون بہے، بے شمار گھرانے نیست و نابود ہوگئے۔ بہار میں بہت کم گھرانے ایسے تھے جو اس سے کسی نہ کسی طور پر متاثر نہیں ہوئے۔ یہ تمام باتیں غالباً فکشن کی صورت میں اس سے پہلے نہیں آسکی تھیں۔ اب رہی بات خوبیوں کی تو یہ آپ بہتر طور پر بتا سکتے ہیں۔

* کیا یہ سچ ہے کہ انور سجاد کے افسانوں میں فرائڈ کی سیکس تھیوری زیادہ ملتی ہے، جو اردو افسانے کے لئے مضر ہے؟

** میں نہیں مانتا کہ انور سجاد کے افسانوں پر فرائڈ کی سیکس تھیوری غالب ہے۔ البتہ انہوں نے گاہے گاہے فرائڈ سے استفادہ ضرور کیا ہے اور اس سے خود انہیں نقصان پہنچا ہے اردو افسانے کا کچھ نہیں بگڑا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انور سجاد کو اس قدر اہمیت کیوں دی جائے کہ ان کی تحریروں سے اردو افسانہ کی صحت پر کوئی اثر پڑ سکے۔ انور سجاد ان افسانہ نگاروں میں ہرگز شامل نہیں ہیں جن کا ان کے بعد آنے والوں نے گہرا اثر قبول کیا ہے بلکہ جن لوگوں نے یہ کوشش کی وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ انور سجاد کے دوسرے ہم عصر ان سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں مثلاً بلراج مین راوہ افسانہ نگار ہیں جنہیں اگر اپنے زمانے کا Trend setter کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ ان کے افسانوں کا ایک ایک لفظ بہت سوچا سمجھا اور جانا بوجھا محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے بہت پہلے لکھنا چھوڑ دیا مگر وہ کبھی بھی بھلائے نہیں گئے۔ اردو افسانے میں ان کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔

* اردو فکشن کی موجودہ صورت حال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

** میں اردو فکشن کی موجودہ صورت حال سے کافی حد تک مطمئن ہوں۔ ادھر دس پندرہ برسوں میں

کچھ ایسے لکھنے والے سامنے آئے ہیں جن کی موجودگی کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اردو فکشن کا مستقبل تاریک ہرگز نہیں ہے۔ میری اس بات سے آپ اتفاق کریں گے کہ فکشن ادب کی سب سے مقبول ترین صنف ہے، اور اس کے امکانات کبھی محدود نہیں رہے۔ اس میں نت نئے تجربات کی بے حد گنجائش ہے۔ اگر چہ دوسری زبانوں میں جو فکشن لکھا جا رہا ہے، وہ بہت طاقتور ہے۔ بنگلہ، مراٹھی یہاں تک کہ ہندی میں جو فکشن آ رہا ہے وہ اردو کے مقابلے میں کافی بہتر ہے۔ پھر بھی صورت حال مایوس کن نہیں ہے۔ دراصل فن کے ساتھ ساتھ سچویشن پر مکمل گرفت حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور یہ چیز محنت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

* ہندو پاک میں آپ کے پسندیدہ افسانہ نگار؟ ان کے افسانوں میں کیا خوبیاں ہیں؟

** ہندو پاک میں میرے کئی پسندیدہ افسانہ نگار ہیں، جن کی خوبیوں پر میں اپنے طور پر گفتگو کرنے لگوں تو اس میں بہت سارا وقت درکار ہوگا جو شاید میرے ساتھ آپ کو بھی نصیب نہیں ہے۔ ہندوستان کی سطح پر دو بے حد قد آور افسانہ نگار ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اقبال مجید اور شفیع جاوید۔ پاکستان میں منشایاد تھے جن کا ابھی ابھی انتقال ہو گیا۔ انتظار حسین ابھی موجود ہیں جنہوں نے بعض بہت اچھے اور یادگار افسانے اردو کو دئے ہیں۔ خود ہمارے ہم عصروں میں بہت سے ایسے افسانہ نگار موجود ہیں جن کے ہاں خوبیاں زیادہ ہیں خامیاں کم۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ لوگ مسلسل لکھ رہے ہیں اور ان کے افسانوں میں تازگی محسوس ہوتی ہے۔ میں جان بوجھ کر نام نہیں لے رہا ہوں۔ نام لینے سے کچھ فائدہ نہیں۔ الٹا نقصان ہی ہوتا ہے۔

* بہار میں اردو ادب کا مستقبل؟

** مسئلہ یہ ہے کہ جب اردو ہی کا مستقبل بہت تابناک نہیں ہے تو پھر ادب کا کیا مستقبل ہوگا۔ ادب بہت شاندار ہو مگر اس کے پڑھنے والے، اس سے فائدہ اٹھانے والے، اس سے لطف لینے والے ہی نہ ہوں تو ایسے ادب کا کیا فائدہ — ؟ میں اردو کے مستقبل کے لئے حکومت سے زیادہ اردو دانوں کو ذمہ دار ٹھہراتا ہوں۔ آپ اردو پڑھیں، اپنے بچوں کو پڑھائیں، اس کی حفاظت کے لئے کمر بستہ ہو جائیں۔ ان چیزوں سے آپ کو کون روکتا ہے۔ حکومت تو ایسی زبانوں کو بھی بے تحاشہ امداد دیتی ہے جو تحقیقی اداروں اور کتابوں میں بند ہیں۔ سماجی زندگیوں سے وہ غائب ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہماری زبان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو۔ آپ زبان کو زندہ رکھیں گے تب ہی تو اس کے ادب کا مستقبل بھی تابناک رہے گا۔ زبان ہی نہیں رہے گی تو آپ کے ادب کی اہمیت ہی کیا ہوگی۔

☆☆☆

سوہن راہی
England

گیت

تیرے نیناں جو گیت ہوتے ہیں
میرے ہونٹھوں کے میت ہوتے ہیں

روشنی خواب لے کے چلتی ہے
دھوپ چھاؤں میں عمر پلتی ہے
آتے جاتے تو پل ہیں اک جیسے
ہار ہوتے نا جیت ہوتے ہیں
تیرے نیناں جو گیت ہوتے ہیں

بادلوں کا سفر ہے بوندوں میں
آدمی کا گزر ہے رشتوں میں
کیا کہوں وقت کی ہتھیلی میں
کیسے موسم بتیت ہوتے ہیں
تیرے نیناں جو گیت ہوتے ہیں

دل کی جو گرہ کھلنے لگتی ہے
روح مستی میں کھلنے لگتی ہے
سارے دکھوں کی بھیڑ میں راہی
وہ ہی کچھ پل ہی پیت ہوتے ہیں
تیرے نیناں جو گیت ہوتے ہیں

☆

رشیدہ عیاں

غزلیں

ذرۂ عشق، مری جان میں رکھے رکھے
بن گیا شعلہ بس اک آن میں رکھے رکھے
جھولنے دو انھیں شاخوں پہ، اگر گل ہیں پسند
سوکھ جائیں گے یہ گلدان میں، رکھے رکھے
سوچتی ہوں کہ منڈیروں پہ ہی رکھ دوں یہ چراغ
یونہی بجھ جائیں نہ، دالان میں رکھے رکھے
بھاؤ کم کر کے ہی دے دو، یہ غریبوں کو اناج
گھُن ہی لگ جائیگا کھلیان میں رکھے رکھے
چند غنچے، جو مرے گلشن اخلاص کے تھے
کِھل گئے دامن ارمان میں رکھے رکھے
اک بت وہم وگماں، خود ہی بدل جاتا ہے
مدتوں کعبہ، ایمان میں رکھے رکھے
دل محبت کا سبو ہے یہ ہمیں دید تیج
زنگ لگ جاتا ہے سامان میں رکھے رکھے
وہ جو یاد آتا تھا، آج اس نے مجھے یاد کیا
موم پگھلا تو شمع دان میں رکھے رکھے
مے کو میخوار کے پیمانے میں ڈھل جانے دو
نشہ کھو جائے گا فنجان میں رکھے رکھے

☆

مسعود تنہا
Pakistan

غزل

وہ طلسمِ نگہ ناز کہاں بھولا ہے
غم کی روداد کا آغاز کہاں بھولا ہے

کتنا دل کش ہے ترے حُسنِ نظر کا منظر
دیکھنے کا تجھے انداز کہاں بھولا ہے

کتنے نغمے مرے کانوں میں مسلسل گونجے
پر ترا شعلۂ آواز کہاں بھولا ہے

مطربِ شہر کی آواز میں دل کش سی کھنک
آج بھی نغمۂ بے ساز کہاں بھولا ہے

کون کہتا ہے مجھے بھول گیا ہے تنہا
میری باتیں مرا ہمراز کہاں بھولا ہے

☆

وصی مکرانی
Nepal

میرے آنگن میں جو بھولے سے بھی آتی ہے ہوا
دشمنوں کے دل کی راحت کو جلاتی ہے ہوا

آدمی جاتا نہیں ہے سانس لینے کے لئے
سانسوں میں انسان کی خود آ کر سماتی ہے ہوا

لذتِ تسکین کا احساس کرتا ہے بدن
جھوم کر جب کھلکھلا کر مسکراتی ہے ہوا

چھین لیتی ہے سکون وچین بھی انسان کا
سر پہ جب اپنے کبھی طوفاں اٹھاتی ہے ہوا

ایک ہی پل میں بدل دیتی ہے موسم کا مزاج
جب کبھی اپنی انا کی ضد پہ آتی ہے ہوا

توڑ کر رکھ دیتی ہے اونچائیوں کا سب غرور
جب کبھی غصے ،غضب میں قہر ڈھاتی ہے ہوا

سو نہیں پاتے ہیں بچے ماں کی جب آغوش میں
مسکرا کر ، لوریاں گا کر سلاتی ہے ہوا

ہو نہیں سکتا بیاں اس جذبۂ احساس کا
اے وصی جب میٹھے میٹھے گنگناتی ہے ہوا

☆

ساحرؔ شیوی

گرامی قدر و منزلت محترم **نارنگ ساقی** کی خدمت اقدس میں خلوص و احترام کے ساتھ

نذرانۂ عقیدت

مزاح نگارِ اردو نارنگ ساقی
شعر و ادب کی خوشبو نارنگ ساقی
اردو کی آبرو نارنگ ساقی
پیغامِ سرخرو- نارنگ ساقی
دانشورِ اردو نارنگ ساقی
مہتاب ہو بہو نارنگ ساقی
اِن کی ذات اقدس پاک اور شفاف
ہر قطرۂ وضو- نارنگ ساقی
تحریر میں اپنی زندگی کا نور
ہر حال میں خوش خو -نارنگ ساقی
اردو کی الفت اردو کی عظمت
اردو کے ہیں ذو -نارنگ ساقی
مزاح نگاری میں کون ان کا ثانی؟
الفاظ خوبرو -نارنگ ساقی
نثر ہو یا نظم ہر صنف پر اس کی
رکھتے ہیں قابو نارنگ ساقی

دلفریب ساقی میخانۂ ادب کے
اک مستحکم بازو -نارنگ ساقی
جان بھی دیدیں اردو کی خاطر
دیوانۂ اردو -نارنگ ساقی
سہل نہیں ہوتا ہر اک کو ہنسانا
رکھتے ہیں یہ خو -نارنگ ساقی
شاید ہو کوئی ایسا مزاح نگار
پر ہیں یہ مو بمو -نارنگ ساقی
اردو کے سر پر دھوپ گر آئے
بہاتا ہے آنسو -نارنگ ساقی
طنز و مزاح سے اپنے لوٹتا ہے دل
نامور ہر سو -نارنگ ساقی
ہو خوشی کہ غم ہر دم رہتے ہیں
اردو کے روبرو -نارنگ ساقی

☆

احمد زین الدین
مدیر 'روشنائی' پاکستان

اندیشہ!

کئی دن بعد ہم شفیق کو دیکھنے گئے۔ وہ اوپن ہارٹ سرجری کے کے بعد ریاض سے واپس کراچی آچکا تھا۔ وہ میرا بہت قریبی رشتہ دار ہے۔ دل کے آپریشن کے بعد اسے نئی زندگی ملی ہے اور اب وہ تیزی سے روبہ صحت ہو رہا ہے۔ ملنے پر اس نے بڑی تفصیل سے ساری باتیں بتائیں۔ بیوی اور بچوں کے یہاں واپس آجانے کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ کام کی زیادتی اور بھاگ دوڑ کی وجہ سے اسے یہ تکلیف ہوئی۔ بلڈ پریشر کے مرض میں مبتلا تھا کہ اچانک دل کا دورہ پڑا۔ وہ گھر میں بالکل اکیلا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے قریبی دوست رحیم کو فون کر کے بتایا۔ وہ فوراً گاڑی لے کر آگیا اور اسے ہسپتال لے گیا۔ اتفاق سے اسی ہسپتال میں اس کی بیوی رعنا کی سہیلی مریم کام کرتی تھی۔ اس نے ہر طرح سے اس کی مدد کی اور مریض کی ساری ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی۔ اسی کی وجہ سے داخلہ اور دوا علاج کی سہولت اسے میسر آئی۔ مریم کی وجہ سے بڑی ڈھارس ملی۔ شفیق بار بار مریم کے حسن سلوک اور اپنوں سے بڑھ کر خیال رکھنے کی تعریف بھی کر رہا تھا اور بار بار یاد کر کے اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

''آپا میں بتا نہیں سکتا کہ ان دنوں مجھ پر کیا گذر رہی تھی۔ صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ کر کے میں اوپن ہارٹ سرجری کرائی اور مریم نے موت وحیات کی ذمہ داری اور فارم پُر کیا۔ دوست رحیم نے روپے پیسے اور بھاگ دوڑ کا ذمہ لیا اور مجھے دلاسا دیتا رہا۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو ان لوگوں کا کیا ہوتا۔ مستقل ملازمت بھی نہیں تھی اور تنخواہ بھی کمپنی والے پوری نہیں دیتے تھے۔ پاسپورٹ انھیں

کے پاس تھا تا کہ میں بھاگ نہ سکوں۔ وہ ہر ملازم کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے تھے۔ البتہ میری ایمانداری اور محنت کی وجہ سے کمپنی والوں نے بھی خیال کیا اور حوصلہ بڑھاتے رہے۔'''شفیق زیادہ بات نہ کرو۔ تم کافی دیر سے وہاں کی باتیں کر رہے ہو۔ ابھی تمہیں مکمل آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپریشن سے پہلے تم نے رعنا کو فون کر کے بتا دیا تھا، یہ بہت اچھا کیا تھا۔ اللہ نے کرم کیا جو سارا کام بخوبی ہو گیا۔ تم بہت جلد صحت مند ہو جاؤ گے۔'' رات کے کھانے کے بعد میں نے اس کے بیٹے عادل سے کہا کہ بیٹا جا کر ٹیکسی لے آؤ، اب ہم جائیں گے۔ اس کی بیوی رعنا، فریدہ اور بھابی شائستہ سے باتیں کر رہی تھیں۔ رعنا کے بچوں کی تعلیم کا ذکر آیا۔ عادل کیڈٹ کالج میں پڑھ رہا ہے اور چھوٹا حارث ایم بی اے کی تیاری کر رہا ہے اور بیٹی نگہت، جس کو ہم پیار سے نکی کہتے ہیں۔ بی اے کے بعد ایک کمپیوٹر کی کمپنی میں کام کرتی ہے۔ باہر کی کمپنی ہے۔ وہ لوگ اس کے کام سے بہت خوش ہیں۔ چنانچہ انھوں نے دونوں بیٹوں کو رات کے وقت پارٹ ٹائم کرنے کی سہولت دے رکھی ہے۔ نکی کو ڈراموں میں کام کرنے کا بڑا شوق ہے۔ اس نے تربیت بھی لینے شروع کر دی۔ وہ ٹی وی کے ڈراموں میں آنا چاہتی ہے۔ ہم نے اسے منع بھی کیا مگر وہ بڑی پُر اعتماد اور حالات پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ریاض میں ان لوگوں کی انگلش میڈیم میں تعلیم ہوئی، جس کی وجہ سے سارے بچے بڑے بولڈ اور سمجھ دار ہیں۔ وہ ہم دونوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ شفیق بھی صحت یاب ہو کر اپنے دوست رحیم، جس نے ریاض میں بڑی مدد کی تھی، کی کمپنی میں کام کریں گے تا کہ گھر کا خرچ چل سکے۔

فریدہ نے اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے رعنا سے کہا۔''زمانہ بڑا خراب ہے۔ نگہت سیانی ہو گئی ہے۔ لڑکوں کے ساتھ ڈرامہ کی ریہرسل میں اکیلی جاتی ہے۔ خدانخواستہ کچھ نہ ہو جائے۔ بڑے باپ کے لڑکے بڑے آزاد اور اوباش ہوتے ہیں۔ تم اس پر کڑی نظر رکھنا۔ شفیق تو مزاجاً رحم دل کم سخن ہیں۔ بچوں پر بھی ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرتے ہیں مگر یہ شہر بڑا خراب ہے۔''

''ہاں آپا، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر نگی ایسی ہے نہیں۔ وہ اتنی بولڈ ہے کہ ایک بار میں نے اسے ٹوکا تو کہنے لگی، مجھے اپنے اچھے برے کی تمیز ہے، آپ پریشان نہ ہوا کریں، روک ٹوک لگانے سے ہم آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔''''بہر حال میری سمجھ میں جو آیا تم سے بتا دیا۔''

''نہیں آپا، آپ نے ٹھیک سوچا۔'' کچھ دیر کے بعد عادل ٹیکسی لے کر آ گیا۔ وہ دس دن کی چھٹی لے کر باپ کو دیکھنے آ گیا تھا۔ اس نے فلیٹ کے نیچے سے آواز دی۔''ٹیکسی آ گئی ہے۔ جلدی کریں۔'' ہم لوگ اجازت لے کر نیچے آئے۔ ٹیکسی والے نے بڑے ادب سے دروازہ کھولا اور

پوچھا۔ ''سر جی، کہاں جانا ہے؟''

''نارتھ ناظم آباد، این بلاک جانا ہے۔ چلو میں تمہیں جگہ بتادوں گا۔''

وہ کچھ دیر خاموشی سے ٹیکسی چلاتا رہا۔ پچھلی سیٹ پر فریدہ اور شائستہ نگی کی آزاد خیالی اور لڑکوں سے بے تکلفی سے ملنے جلنے کی باتیں کرتی رہیں اور یہ بھی کہا کہ نگی ذرا دیر کے لئے گھر میں آئی اور پھر کپڑے بدل کر علیک سلیک کر کے فوراً چلی گئی۔ گاڑی پر اس کے ڈرامہ ریہرسل میں ساتھ دینے والے اس کے دوست انتظار کر رہے تھے۔ اس نے ماں سے کہا، مجھے جلدی ریہرسل میں پہنچنا ہے، میں جارہی ہوں۔ ڈرامہ کی شوٹنگ چل رہی ہے اور میں بھی اس میں شامل ہوں۔

''نگی کی آنکھیں کتنی خوبصورت بڑی بڑی ہیں اور اس کا فگر بھی اچھا ہے۔ ہنستی ہے تو بہت اچھی لگتی ہے۔ بال بھی کمر تک آتے ہیں۔''

''اچھا اب بس کرو۔ چل کر باقی باتیں کریں گے۔ ڈرائیور سن رہا ہے۔'' اس نے بڑی آہستگی سے کہا۔

''سر جی زمانہ بڑا خراب آگیا ہے۔'' ڈرائیور نے رائے دی جیسے اس نے ساری باتیں سن لی ہوں۔

میں چونک پڑا۔ ''مگر تم کو کیسے اندازہ ہے؟''

''دیکھئے نا سر جی، اب اخلاق محبت کی باتیں کوئی نہیں کرتا۔ جائز ناجائز ذریعہ سے کمائے ہوئے پیسوں سے آدمی آدمی میں فرق پیدا ہوگیا ہے۔ امیر، غریب کا۔''

''مگر تم کو یہ احساس کیسے ہوا؟''

''سر جی مجھے روزانہ بھانت بھانت کی سواریاں ملتی ہیں۔ میں بل پارک کے اسی علاقہ جہاں سے آپ آرہے ہیں، میں رہتا ہوں۔ میں کسی سے اتنی بات نہیں کرتا مگر آپ لوگوں کو شریف دیکھ کر میں کچھ بولنے کی ہمت کر رہا ہوں۔'' ''تمہارا نام کیا ہے؟'' زلف قار (ذوالفقار) ''تم پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔'' ''سر جی، میں میٹرک کا امتحان پاس نہیں کر سکا۔ غربت کی وجہ سے۔ پھر گاؤں چھوڑ کر پیسے کمانے کراچی آگیا۔ سر جی، میرے والد نے پیدائش کے بعد میرا نام ذوالفقار رکھ دیا۔ میں سن ۱۹۷۴ء میں پیدا ہوا۔ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کا نام سب کی زبان پر تھا۔ ملک میں اچھے کام ہو رہے تھے اور پاکستان ترقی کر رہا تھا۔ خوش حالی آرہی تھی۔ عوام ان کے دیوانے تھے۔ میرے والد کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ مجھے زلفی کہہ کر پکارتے۔ پھر ۱۹۷۷ء اور اس کے بعد جو کچھ ہوا تو آپ کو یاد ہوگا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

میرے ذہن میں ماضی کے واقعات کے جھکڑ چلنے لگے۔ ملک دولخت ہو گیا اور ہم لوگوں کو دوسری ہجرت کرنا پڑی۔ ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ جیل روڈ چورنگی پر رک گئی۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے سرخ بتی پر دھیان نہیں دیا۔'' ''دیکھ کر چلاؤ میاں۔''

وہ پھر بول پڑا، جیسے وہ آج راستے بھر اپنی ہی باتیں سنائے گا۔ ''سر جی، اب پہلے جیسا کچھ بھی نہیں رہا۔''

میں نے اس کے چہرے کو دیکھا، چھوٹی چھوٹی داڑھی، سیاہ رنگت، کشادہ پیشانی کے نیچے بڑی بڑی جہاندیدہ آنکھیں۔ وہ نوجوان تھا مگر ایسی باتیں کر رہا تھا کہ جیسے اندر سے بوڑھا ہو گیا ہو۔ مگر چہرے مہرے اور باتوں سے شریف لگتا تھا۔ ''سر جی، آپ مجھ سے بڑے ہیں۔ شاید اس ملک میں اچھے دن بھی دیکھے ہوں گے۔ مگر میں آج کے زمانے کو دیکھ رہا ہوں۔ اب پہلے جیسا کچھ بھی نہیں رہا۔''

فریدہ اور شائستہ نے اس کی باتوں کی آہستگی سے تائید کی، ''ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔''

ان کے خیالوں میں گویا نکی پھر در آئی ہو۔ وہ ان کے ذہن سے گئی کہاں تھی۔

''ماں جی، آپ لوگ تو میری سمان ہیں۔ مجھے اپنا بچپن یاد آتا ہے۔ میں شہر میں رہ کر بھی گاؤں کو نہیں بھولا۔ جیسے گاؤں تو میرے اندر آباد ہو۔ میری عمر ان دنوں بارہ سال تھی۔ والد صاحب مجھے ملوانے دوسرے گاؤں لے گئے تھے۔ وہ لوگ بھی مجھے پیار سے زلفی کہا کرتے۔ یہ تیرے نانا ہیں، یہ پھوپھا، یہ ماسی اور یہ تیرے دادا ہیں۔ نانا نانی تو میری پیدائش کے فوراً بعد فوت ہو چکے تھے۔ ماں بھی میرے ساتھ تھی۔ وہ خوش ہو کر میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی جیسے دل میں نہال ہو رہی ہو۔ سب لوگوں نے مجھے گلے لگایا، پیار کیا اور گڑ دئے۔ دودھ لسی کے گلاس آ رہے تھے۔ گھی مکھن چپڑی ہوئی مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ جس پر ڈھیر سارا مکھن رکھا ہوا تھا۔ میرے دل میں وہ سارے رشتے ناطے آباد ہیں۔ مگر میرا چھوٹا بھائی جو شہر میں پیدا ہوا، ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ بس اسے اڑانے کے لئے پیسے اور اچھے کپڑے چاہئیں۔ سر جی، ایک بات مجھے کبھی نہیں بھولتی۔''

''کون سی بات؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ ایک بار ماما کے بیٹے کی شادی بڑے دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ ماں اور بابا بھی شریک ہونے آئے تھے۔ انھوں نے مجھے ماما سے ملوانے کی کوشش کی مگر وہ دھیان دئے بغیر دوسری طرف چلے گئے۔ ان کے اس رویے پر میں رونے لگا۔ مجھے روتا دیکھ کر والد صاحب مجھے پنڈال سے باہر لے گئے۔ بڑے لوگ ہیں بیٹا، دولت مند لوگوں کی آؤ بھگت میں مصروف ہیں۔ اس دن کے بعد

میں کبھی ان سے ملنے نہیں گیا اور ماں کے ساتھ فیصل آباد واپس چلا گیا۔ دنیا کسی اور طرف جارہی ہے۔''

''تباہی کی طرف۔'' شائستہ نے کہا۔''تم اتنی چھوٹی عمر میں اتنی اچھی باتیں کرتے ہو زلفی۔اتنی سمجھ تم میں کہاں سے آئی۔''سر جی ٹھوکریں کھا کر ہی آدمی سیکھتا ہے۔اس میں عمر کی کیا قید؟''میں زلفی کی باتوں میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ مجھے یاد آیا کہ عید بقر عید کے موقع پر میرے سگے بھتیجے بھی ملنے نہیں آتے۔واقعی زمانہ بدل گیا ہے۔زلفی نہ جانے کیوں ایک دم سے خاموش ہو گیا۔منزل پر پہنچنے میں ابھی دیر تھی۔اس کی باتوں سے راستہ آسانی سے کٹ رہا تھا۔مجھے نگی کا خیال آیا۔

اتنے میں زوردار بریک لگی اور ہم اچھل پڑے۔''کیا ہوا زلفی؟''''کچھ نہیں سر جی، پچھلی گاڑی میں چند نوجوان شور مچاتے اور قہقہہ لگاتے ہوئے اوورٹیک کر کے گزر گئے۔اگر میں ایسا نہ کرتا تو ٹکر ہو جاتی۔گاڑی اتنے قریب سے گزر رہی تھی کہ''

شائستہ نے ایک دم کہا۔''اگلی سیٹ پر نگی بیٹھی قہقہہ لگا رہی تھی۔''

''نہیں نہیں فریدہ نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں نے دیکھا وہی تھی۔''

ان کی گاڑی تیزی سے دور جا چکی تھی، اس لئے تصدیق نہ ہو سکی مگر ہمارے ذہن میں بہت سے وسوسوں اور اندیشوں نے سر اٹھایا۔

''سر جی، میں نے ان لڑکوں کو کئی لڑکیوں کے ساتھ ہل پارک میں مستی کرتے ہوئے دیکھا ہے اور انھیں گاڑی سے ایسی ویسی جگہ چھوڑا بھی ہے۔''''تم کیا کہہ رہے ہو۔نگی ایسی لڑکی نہیں ہے۔''''بہن جی، یہ لڑکی نہیں تھی، دوسری لڑکیاں تھیں جو دولت مند باپ کے بیٹوں کے ساتھ عیش کرتی ہیں۔''اتنے میں میرا موبائل بجا۔رعنا کی آواز آئی۔''آپا نگی کا حادثہ ہو گیا ہے اور وہ ہسپتال میں داخل ہے، ابھی اس کے دوست کا فون آیا تھا۔شفیق کی حالت غیر ہو گئی ہے۔ہم انھیں ہسپتال لے جا رہے ہیں۔''

مجھے جس بات کا اندیشہ تھا وہی ہوا۔

☆☆☆

ادبی تنقید وتحقیق کے باب میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کسی ایک مستقل موضوع کو منتخب کیا ہے اور اس پر سیر حاصل مطالعہ پیش کرنے کے بعد جو تجزئے اور نتائج سامنے آئے، وہ ان کی دانشوری کی بین مثال کہے گئے ہیں۔

مرکز نگاہ فی الوقت ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ضخیم کتاب 'فیض شناسی' ہے اور حکم یہ ہے کہ 'فیض شناسی' کو اظہار خیال کا وسیلہ بنایا جائے۔ میرے ایک کرم فرمانے اپنی محبتوں کا یہ ایک سنگ گراں میرے سینے پر رکھ دیا ہے اور میرا یہ حال ہے کہ سانس بھی آہستہ نہ لے سکوں، البتہ فیض شناسی کے مطالعہ کی روشنی میں اپنے اندھیرے اجالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

بات دراصل یہ ہے کہ ادبی فیصلے ہی نہیں ادبی جائزے بھی ایک مدت کی ریاضت طلب کرتے ہیں۔ یہاں ہفتہ دو ہفتے میں کسی کتاب کا اور وہ بھی ضخیم کتاب کا مطالعہ ممکن نہیں کہ جس کے ورق ورق اور سطر سطر میں تحقیقی بصیرتیں اور زندگی کی مسرتیں جگمگا رہی ہوں، جہاں لفظ لفظ پر آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہوں اور دل یہ کہے کہ 'جا ایں جا است' چنانچہ اس انداز نظر کی کیفیت کو کوئی نام نہ ملے تو اس گہر بے مایہ کی قدر و قیمت کا اندازہ کس طرح لگایا جا سکتا ہے۔

صاحبان! ''فیض شناسی'' کے صرف دو تین مضامین کے پیش نظر میں اپنی بات رکھنا چاہتا ہوں وگرنہ ''من آنم کہ من دانم'' تاہم اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ساڑھے پانچ سو صفحات میں فیض شناسی کا جو حق ادا کیا ہے، اس سے بہتر کوئی اور یہ کارنامہ انجام دے بھی نہیں سکتا تھا۔ تقریباً ۲۴ مضامین نکتہ رسی، دیدہ ریزی اور تلاش وجستجو کی دولت گرانمایہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ایک سے ایک آب دار۔ ایک سے ایک گہر بار۔ ''فیض شناسی'' میں شامل ابتدائی تین صفحات میں علامہ اعجاز فرخ کی معجز نمائی لفظ لفظ روشن ہے۔ فہرست مضامین پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ فیض شناسی کے سلسلہ میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ جہاں ایک طرف فیض احمد فیض کی شاعرانہ شخصیت کے بارے میں مشاہیر کے خیالات سے روشنی حاصل کی گئی ہے، وہیں دوسری طرف تقابلی مطالعے کے ذریعہ سے فیض کی انفرادیت کو واضح کیا گیا ہے، تقابلی مطالعہ میں ایک دشواری یہ ہے کہ کبھی کبھی عصبیت بھی در آتی ہے، تاہم ڈاکٹر سید تقی عابدی کی دراکی وذہانت، نقد ونظر کی ہمہ گیریت، تحقیقی بصیرت اور مطالعہ کی وسعت نے انہیں صرف اور صرف صداقت کا پیروکار بنایا ہے۔ اس لئے خود بخود ان کی تحریروں میں متوازن نقطہ نظر پیدا ہو گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ادب کی کوئی صورت ہو ذاتی ذوق اور وجدان کی کارفرمائی اسے نہ صرف یہ کہ دلچسپ بناتی ہے

محمد قیوم میو
Mb:9958455583

خاص خبر

وہ ایک چھوٹے سے اخبار کا نیوز ایڈیٹر تھا۔ اس کی ڈیوٹی شام چھ بجے شروع ہو کر رات دو بجے تک رہتی تھی۔ وہ ہر روز ڈیوٹی سے ایک گھنٹہ قبل ہی دفتر پہنچ جاتا تھا اور رات کو ڈیوٹی ختم ہوتے ہی آفس میں بنے چھوٹے سے کیبن میں سو جاتا تھا۔ صبح پہلی بس سے گھر چلا جاتا تھا۔ اس کا یہ روز کا معمول تھا، وہ اپنے نائب کو نیوز بنا کر دیتا اور نائب خبروں کو کمپوزنگ کے لئے دیتا رہتا تھا۔ وہ ہر دس منٹ میں آتا اور خبریں کمپوزر کو دیتا رہتا اس رات بھی وہ دو بجے کے بعد آرام کرنے لیٹ گیا تھا۔

تکان کچھ زیادہ تھی، اس لئے وہ جلد ہی سو گیا لیکن ابھی اس کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔ اور ''خاص خبر'' کے لئے جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ اخبار تین بجے پریس جانا تھا۔ اس جگہ کو پر کرنے کے لئے تین بجے تک کا وقت مقرر تھا۔

اگر اس جگہ کو پر کرنے کے لئے کوئی خاص خبر نہیں آتی تھی، تو اس کے بجائے کوئی بھی نیوز وہاں لگا کر اخبار چھپنے بھیج دیا جاتا تھا۔ اس کا نائب بھی کچھ آرام کرنے کے لئے ایک طرف رکھے کاغذ کے بنڈلوں پر سو گیا۔ خاص خبر کے انتظار میں اس کی آنکھ لگ گئی۔

اسے کچھ احساس نہ رہا۔ ایک گھنٹہ بعد وہ گھبرا کر اپنے کیبن میں بچھی بینچ سے اٹھ بیٹھا۔ گرمی کی وجہ سے وہ پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔ اس نے ہتھیلیوں سے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ ٹیبل فین کا رخ اپنی جانب کیا۔ پھر وہ اٹھا۔ واش بیسن میں جا کر پانی کی چھینٹیں اپنے چہرے پر ماریں۔ تھرمس میں چائے کپ میں ڈالی اور جلدی جلدی پینے لگا۔ پھر کاغذ قلم لے کر میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے چند

منٹوں میں دو چھوٹے صفحے سیاہ کر ڈالے اور پھر مطمئن ہو کر کاغذ قلم ایک طرف رکھ دیئے اور گہری نیند سو گیا۔ اس کے سونے کے کچھ دیر بعد اس کا نائب تحریر کردہ دونوں صفحے لے گیا اور کمپوزنگ کے لئے دے دیئے۔

اخبار میں پریس میں دیا جا چکا تھا۔ اس دن کوئی خاص خبر نہیں آئی تھی۔ وہ پانچ بجے اٹھ کر حسب معمول اپنے گھر کے لئے پہلی بس میں روانہ ہو گیا۔ صبح سارے شہر میں اخبار تقسیم ہو چکے تھے۔

شہر میں ہنگامہ برپا تھا۔ ہنگامہ اس خبر کے لئے، جو خبر صفحہ اول پر انتہائی نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی، اخبار کے آفس میں لگے فون کی گھنٹی زور زور سے بج اٹھی۔ دفتر میں عملہ بھی پریشان ہو گیا کہ آخر کیا معاملہ ہے؟ سب کا ایک ہی سوال ہوتا۔ ''یہ آپ نے کیسی خبر شائع کی ہے؟ سارے شہر میں ہنگامہ اور افراتفری مچی ہوئی ہے۔ کیا آپ ایسی غیر ذمہ دارانہ خبر شائع کرتے ہیں؟''

ایڈیٹر، پبلشر، مالکان، سبھی دفتر میں آ گئے۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر کس خبر کے لئے اتنا ہنگامہ برپا ہے۔ انہوں نے فوراً اخبار کی تازہ کاپی منگوائی اور اس خاص خبر کا جائزہ لیا تو ان کے اوسان جاتے رہے۔ انہیں پیروں تلے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔ حیرت سے ان سبھی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ فوری طور پر نیوز ایڈیٹر کو دفتر طلب کیا گیا۔ وہ اپنے گھر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ دفتر کے چپراسی نے اسے جگایا اور ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔ کیا بات ہے، بھئی۔ اس طرح صبح سویرے کیسے آ گئے؟ اس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر پوچھا۔ ''دفتر چلئے صاحب نے ارجنٹ بلایا ہے۔'' چپراسی مزید کچھ نہ بولا۔ وہ کار میں بیٹھ کر دفتر پہنچا۔ تو سارے دفتر میں افراتفری مچی تھی۔ اس کے کیبن میں داخل ہو کر سلام کیا۔ تو ششدر رہ گیا۔ اتنی صبح یعنی دس بجے اخبار کے تینوں اہم ستون دفتر میں موجود ہیں۔ اسے حالات کی سنگینی کا علم بخوبی ہو چکا تھا۔ اس سے وضاحت طلب کی گئی۔

''آپ نے یہ خبر کیسے اور کہاں سے حاصل کی ہے؟ اس سے شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا ہے، حکومت اور پولس ہمیں گرفتار کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کس خبر کی بات کر رہے ہیں؟'' نیوز ایڈیٹر نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مالکان نے اسے تازہ شمارہ دیا۔ اس کے خاص پہلے کالموں میں وہ سنسنی خیز خبر شائع ہوئی تھی۔ خبر میں تحریر تھا، مدراس ۲۱ر دسمبر اس شاندار شہر میں ۲۶ر دسمبر کو ایک زبردست سمندری طوفان آئے گا۔ اس طوفان کی سونامی لہریں لاکھوں لوگوں کو ڈبو دیں گی۔ سارا شہر تباہ برباد ہو جائے گا۔ خاص طور پر سمندری ساحل کے قرب و جوار جو لوگ رہتے ہیں، انہیں وہاں سے ہٹ جانا چاہئے۔

سمندری طوفان اتنا شدید ہوگا کہ اس شہر میں کچھ نہ بچے گا۔ لہٰذا اس خبر کو سنجیدگی سے لیں اور اسے افواہ نہیں سمجھیں اور فوری طور پر شہر خالی کر کے محفوظ مقامات پر چلے جائیں۔'' وغیرہ وغیرہ۔

نیوز ایڈیٹر یہ پڑھ کر چونک گیا اور مالکان سے اپنی صفائی میں کہا۔ ''یہ سچ ہے کہ یہ خبر میری تحریر کردہ ہے لیکن یہ خبر نہیں تھی۔ یہ میرا انتہائی ڈراؤنا خواب تھا۔ جو گذشتہ رات میں نے دیکھا تھا۔ میں نے اسے ہو بہو لکھ دیا تھا۔

یہ خبر ہرگز ہرگز نہیں تھی۔ کیونکہ ہر خبر کے نیچے میں باقاعدہ دستخط کرتا آیا ہوں۔ شاید میرے نائب نے اس پر غور نہیں کیا اور اسے خاص نیوز کی شکل میں چھپوا دیا۔ بھلا آپ بتائیے، میں اس ہولناک خواب کو اخبار میں کیوں شائع کروں گا؟ اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے؟'' نیوز ایڈیٹر صفائی دے کر خاموش ہو گیا۔

چیف ایڈیٹر نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ''ہم تمہاری کسی بات سے مطمئن نہیں ہیں۔ حکومت نے ہمیں ہدایت دی ہے کہ اس نیوز ایڈیٹر کو فوری ڈیوٹی سے علاحدہ کر دیا جائے۔ جس نے ایسی ہولناک غلطی کی ہے۔ یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے۔''

اس نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا۔ پر سب بے سود ثابت ہوا اور بالآخر اسے اپنا استعفیٰ اسی وقت ٹائپ کر کے دینا پڑا۔ ان سبھی کے چہرے جذبات سے عاری تھے۔

وہ بوجھل بوجھل قدموں سے اپنے گھر گیا اور گہری سوچ میں غرق ہو گیا، دوسرے روز ہی اس نے اپنا سامان باندھا اور مع اہل وعیال دوسرے شہر میں منتقل ہو گیا۔ اس نے وہاں جا کر بہت تگ ودو کی اور ایک اخبار کی ایڈیٹر کی ملازمت حاصل کر لی۔

ملازمت پا کر وہ بے حد مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ بڑی کسمپرسی کی حالت میں اس شہر میں وارد ہوا تھا۔ اب اسے دو وقت کا کھانا بآسانی میسر ہو گا۔

لیکن پانچویں روز اس شہر میں جہاں سے اس نے فرار اختیار کیا تھا۔ ایسا زبردست سمندری طوفان آیا کہ سارا شہر نیست ونابود ہو گیا۔

ساحل سمندر کے آس پاس کے باشندے طوفان میں بہہ گئے تھے اور دیگر سمندر کی آغوش میں سما گئے تھے۔ کوئی بھی ذی ہوش نہیں بچا تھا اور وہ نیوز ایڈیٹر اپنی کرسی پر بیٹھا، اس خواب کے متعلق سوچ رہا تھا، جس کی ہولناکی اس نے پانچ روز قبل خواب میں دیکھی تھی۔ کاش اس کا یہ خواب محض خواب ہی رہتا۔

☆☆☆

صابر فخر الدین
Mb:08088140850

مختصر کہانیاں

آنکھوں دیکھی

جب اس نے اپنی نجی ڈائری پڑھنی شروع کی، تو گذرے ہوئے شب روز اس کے سامنے آئینہ ہو گئے، اُس کا وہ ماضی جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا، اس کے آگے آ کر کھڑا ہو گیا اور اسے لگا کہ اس کا ماضی ہی اس کا حال بھی ہے اور اس کا مستقبل بھی۔

☆

زمانہ ہی بدل گیا

اُس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے وہ ہاتھ پاؤں جن کے لئے اس نے دن رات ایک کر دئے تھے، اس کے ہی مقابل آ جائیں گے اور وہ کف افسوس ملتا رہ جائے گا مگر ہوا تو ایسا ہی تھا کیا پتہ یہ اس کے کرموں کا پھل تھا یا زمانہ ہی بدل گیا تھا۔

☆

روشن راتیں کالے دن

مانگے کا اجالا وہی تو ہے جس سے راتیں روشن اور دن کالے ہو جاتے ہیں، اس لئے

دست خود اور دہان خود ہو تو بات کچھ اور ہی ہوتی ہے، جہد مسلسل سے اپنے مستقبل کو تابناک بنایا جاسکتا ہے، ورنہ روشن راتیں اور کالے دن مقدر بن جاتے ہیں۔

☆

فُقدان

اُسے آج بھی اس بات سے انکار نہیں تھا کہ اس نے کچھ وعدے کئے تھے، وہ آج بھی ان وعدوں پر سختی سے قائم تھا مگر وہ کیا کرے کہ ان وعدوں کو پورا کرنے کے لئے جو قوت ارادی چاہئے تھی ، وہی اس کے پاس نہیں تھی۔

☆

کارگاہ

لگتا ہے اس کے لئے زمین تنگ ہوگئی ہے کیوں کہ اس نے جھوٹ کی زمین پر سچ کا پودا لگانا چاہا تھا۔

☆

حاضر غائب

یکا یک آنکھیں کھل گئیں، پھر نیند آنکھوں سے بہت دور چلی گئی، کوسوں دور، اس نے لاکھ کوشش کی کہ کسی طرح نیند کی دیوی کو واپس لائے مگر وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھی اور خوابوں نے سر پیٹ لیا تھا۔

☆

پیش بندی

کیا زندگی ایسے بھی گذاری جاسکتی ہے جیسے وہ گذار رہا تھا، لگتا ہے کہ مرنے کی تیاری کر رہا

ہو۔

☆

تجسیم لفظ

لفظ بذات خود اک اکائی ہوتے ہیں، جب ان کی تجسیم عمل میں آتی ہے، تو ساری وسعتیں اس میں سما جاتی ہیں، زندگی اپنے راز ہائے سربستہ کھولنے لگتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ کُن نے فیکون ہو کر ہفت اقلیم کو گھیر لیا ہے۔

☆

نوکِ قلم

ایک وقت تھا کہ قرطاس و قلم ہاتھ سے چھوٹ جاتے تھے اور جب اس نے لکھتے لکھتے اپنے ہاتھ قلم کر لئے تو دنیا قلم کی نوک پر آ گئی تھی۔

☆

زنجیر تسمہ پا

قافلے معلوم منزلوں کی طرف تیزی سے رواں دواں تھے، ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ خوف بھی لاحق تھا کہ کہیں وہ نامعلوم منزلوں کا شکار نہ ہو جائیں لیکن انھیں پتہ نہیں تھا کہ راستے زنجیر تسمہ پا بن کر ان کی نگہبانی کر رہے ہیں۔

☆☆☆

سیفی سرونجی

کشمیر کا ایک یادگار سفر: قسط نمبر ۲

جھیل میں دو گھنٹے کی تفریح کرتے وقت ہمیں یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ وہ ڈل جھیل جس کی شہرت ساری دنیا میں ہے، جسے دیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ اب وہی جھیل کئی اور دیگر پیڑ پودوں کی وجہ سے اور صفائی نہ ہونے کی وجہ سے کچرے کا انبار محسوس ہوتی ہے۔ وہ کشمیر جسے ہندوستان کی جنت کہا جاتا ہے۔ جسے دیکھنے کا خواب ہر شخص کا رہتا ہے، جس سے گورنمنٹ کروڑوں روپئے کماتی ہے، کئی جگہ تو ٹکٹ سے سب کچھ دکھایا جاتا ہے لیکن اس کی صفائی اور خوبصورتی قائم رکھنے کے لئے گورنمنٹ کچھ نہیں کرتی۔ گل مرگ جایئے تو وہ گل مرگ سے زیادہ گھوڑوں کا اصطبل لگتا ہے۔ ہر جگہ گندگی لیکن ابھی ہم گل مرگ تک نہیں گئے تھے کہ آج ہمارا پہلا دن تھا کشمیر میں آنے کا، اس لئے ڈل جھیل میں دو گھنٹے تک تفریح کے بعد نو بجے سب کھانے پر جمع ہو گئے، ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ وحشی سعید کے علاوہ مظفر ایرج، نور شاہ، وحشی سعید کے بھائی ظہور صاحب اور ہمارے دوست ایڈیٹر تحریر نو ظہیر انصاری، ڈاکٹر اشرف آثاری، شیخ بشیر احمد، عمر فرحت، احمد شناس، جیسے شاعروں ادیبوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ نوجوان ادیبوں میں ہمارے ساتھ عرفان عارف، قسیم اختر، عمر فرحت بہت ہی سمجھدار اور ذہین تھے۔ وہیں دوسری طرف بزرگ شاعروں میں اصغر ویلوری، علی منیر، جیسے پختہ کلام کے ماہر اپنے تجربات کی روشنی میں نوجوانوں کو زیادہ شرارتیں کرنے سے روکتے رہتے۔ ہمارے پورے قافلے کی اب تک رہنمائی جاوید انور کرتے رہے تھے لیکن سری نگر آتے ہی انہوں نے ہمیں دوسروں کے حوالے کر دیا۔ ظہیر انصاری، احمد شناس اور عمر فرحت نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ یہ رات ہم نے شہر کے دیگر خوبصورت علاقوں کو دیکھنے کی تمنا میں گذار دی۔ دوسرے دن صبح اٹھ کر جیسے ہی فریش ہوئے، ناشتے کے لئے گھنٹی بجی اور سب ناشتے کی میز پر جمع ہو گئے۔ آج ہمیں گل مرگ دیکھنے جانا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر سب لوگ بس میں گل مرگ جانے کے لئے اٹھ گئے۔ گل مرگ سری نگر سے دو گھنٹہ کی دوری پر تھا۔ دس بجے ہم لوگ روانہ ہوئے۔ کھانے کے لئے وحشی سعید نے کھانے کے بہترین پیکٹ رکھوا دیئے، اس قافلے کی

رہنمائی مشہور شاعر احمد شناس اور تحریر نو کے مدیر ظہیر انصاری کر رہے تھے۔ دو گھنٹے تک بس چلتی رہی۔ بلند پہاڑی راستوں سے گذرتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے ہم چاند پر جا رہے ہوں، سینکڑوں فٹ اونچے پہاڑوں پر بس ایک گھنٹے تک چلتی رہی، تب جا کر ہم لوگ بلند سبزہ زار پر پہنچے۔ ہمارے دوست انتساب کے سرپرست انل اگروال بہترین کیپ پہنے ہوئے تھے، جس سے وہ ایک افسر معلوم ہوتے تھے، سب سے پہلے بس سے اترے تو گھوڑے والوں نے انھیں افسر سمجھ کے گھیر لیا۔ وہ چاروں طرف سے زور ڈالنے لگے کہ ہمارے گھوڑے پر آیئے۔ انھوں نے گھبرا کر احمد شناس صاحب کی طرف اشارہ کر دیا کہ وہ اس ٹیم کے قافلہ سالار ہیں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ چاروں طرف سے لوگوں نے احمد شناس صاحب کو گھیر لیا اور احمد شناس صاحب بار بار انکار کرتے رہے۔ دو چلے جاتے تو چار دوسرے آجاتے۔ آخر تنگ آ کر احمد شناس صاحب نے انہیں گالیاں دے ڈالیں کہ سالے ابھی میں پولس کو بلاتا ہوں، تمہارا سب گھوڑوں پر بٹھانے کا نشہ دور ہو جائے گا۔ جتنی وہ بحث کرتے گھوڑے والے انھیں اور گھیر لیتے۔ وہ گالیاں دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے، تو گھوڑے والوں نے ہمیں پکڑ لیا کہ صاحب آپ صرف دو سو روپے دے دینا جبکہ ہم پانچ سو روئے لیتے ہیں۔ جب ہم سے وہ زیادہ اصرار کرنے لگے تو ہم نے احمد شناس صاحب کی طرف اشارہ کر دیا کہ ابھی ہمارے صاحب غصے میں ہیں، کہیں واقعی وہ پولس کو نہ بلا لیں۔ احمد شناس صاحب ویسے بھی ایک افسر رہ چکے ہیں، انھیں دیکھ کر گھوڑے والے سہم گئے اور ہم خدا خدا کر کے ان سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔

ابھی تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ کچھ دوسرے گھوڑے والوں نے انہیں گھیر لیا پھر تو احمد شناس صاحب غصہ میں لال پیلے ہو گئے مگر پتہ نہیں کیوں جتنا انھیں غصہ آتا، اتنے ہی گھوڑے والے صرف انہیں سے کہتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے گھوڑے والوں کو احمد شناس صاحب کچھ زیادہ ہی پسند آ گئے تھے۔ ہماری ٹیم کے کچھ لوگ گھوڑوں پر دور دور تک نکل چکے تھے۔ ہم لوگ گل مرگ کی حسین وادیوں میں ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ ایک صاحب نے کہا کہ گل مرگ میں کئی فلموں کی شوٹنگ ہو چکی ہے، یہیں راجیش کھنہ پر ایک گانا 'کانٹا لگے نہ کنکر' فلمایا گیا تھا۔ کشمیر کی سب سے خوبصورت جگہ گل مرگ کہی جاتی ہے لیکن ہمیں یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا کہ کشمیر جسے ہندوستان کی جنت کہا جاتا ہے جسے دیکھنے کے لئے لوگ دوسرے ملکوں سے آتے ہیں۔ اب وہ کشمیر کشمیر نہیں رہا۔ گل مرگ جو پھولوں اور خوبصورت پہاڑوں کی بلندیوں پر واقع ہے۔ اب وہ گھوڑوں کا اصطبل معلوم ہوتا ہے۔ ہر طرف گندگی اور کچرے کا ڈھیر۔ گورنمنٹ کروڑوں روپے کماتی ہے لیکن اس کی خوبصورتی کو قائم رکھنے کے لئے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھاتی۔ دوپہر تک سب لوگ تھک گئے اور ایک ہوٹل میں بیٹھ کر وحشی سعید

کی طرف سے دئے گئے کھانے کے پیکٹوں سے کھانا نکال کر کھانے لگے لیکن ہماری ٹیم کے دو آدمی غائب تھے، ایک بنارس والے مولانا دوسرے عرفان عارف ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر واپسی کے لئے تیار تھے لیکن ان دونوں کی وجہ سے انتظار کرتے رہے۔ صبح دس بجے سے لے کر شام کے پانچ بج گئے لیکن ان دونوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ احمد شناس صاحب کو تین بجے تک واپس جانا تھا۔ وہ بہت بے چین تھے کرشن کمار طور بھی بور ہو چکے تھے۔ دور سے جب کوئی گھوڑا یا کسی کی ٹوپی نظر آتی تو فوراً احمد شناس چیخ پڑتے کہ وہ آ گئے۔ جب شام کے چھ بج چکے تو سب لوگ بھی غصے میں آ گئے اور کہنے لگے کہ انہیں یہیں چھوڑ کر چلتے ہیں۔ اب ان سے کچھ نہیں کہنا بلکہ ان سے کہنا ہے جنہوں نے ان دونوں کو بلایا ہے۔ اس کو چل کر پکڑیں گے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک صاحب نے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ شاید وہ آ گئے، مجھے ایک ٹوپی نظر آ رہی ہے، احمد شناس صاحب بولے کہ آج تو مجھے ہر مولانا کے سر پر ٹوپی نظر آ رہی ہے، بہر حال خدا خدا کر کے شام ساڑھے چھ بجے یہ لوگ آئے، سارے لوگ غصے میں تھے، کسی نے ان سے کوئی بات نہیں کی، احمد شناس صاحب غصے میں تھے مگر ہم انھیں گھوڑوں سے متعلق جب بھی بات کرتے تو ان کا غصہ دور ہو جاتا۔ پہاڑ سے اترنے کے بعد ہم تھوڑی دور ہی بس میں چلے تھے کہ ہمیں ایک لاری میں گھوڑا کھڑا نظر آیا، تو ہم نے فوراً احمد شناس صاحب سے کہا۔ احمد شناس صاحب دیکھئے، وہ لاری میں گھوڑا، یہ بھی شاید آپ کے ساتھ ساتھ چلنے کے لئے بے تاب ہے۔ ہم نے آج تک گھوڑوں کو کسی سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا۔ یہ کوئی اگلے جنم کا معاملہ تو نہیں، ہم نے انھیں کچھ شعر بھی فی البدیہہ سنائے۔ گل مرگ کا یہ ایک یادگار سفر ختم کر کے ہم لوگ رات نو بجے اپنی قیام گاہ یعنی شہنشاہ ہوٹل آ گئے۔ وحشی سعید صاحب واقعی ایک نامور فکشن نگار تو ہیں ہی لیکن وہ بحیثیت انسان بھی بہت بڑے ہیں۔ ان کی پیار بھری شخصیت سے سب ہی بہت متاثر تھے، بار بار وہ سب سے پوچھتے کہ کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کشمیر میں اتنی محبتیں ملیں کہ جنھیں بیان کرنا مشکل ہے۔ نور شاہ، مظفر ایرج، وحشی سعید، ان کے بھائی ظہور تنویر، اشرف آثاری، احمد شناس، قدم قدم پر اپنی محبتوں سے نواز رہے تھے اور ہم شاعروں کا قافلہ کشمیر کی سیر کا لطف اٹھا رہا تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک شخصیت تھی۔ نئی نسل کے شاعر مصدق اعظمی، ظہیر انصاری - ایڈیٹر تحریر نو، عرفان عارف، عمر فرحت، قسیم اختر، کے علاوہ بزرگ سینئر شاعروں میں علی منیر، کرشن کمار طور، ہماری رہنمائی کر رہے تھے، طور صاحب تو بہت ہی معتبر شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ حال ہی میں انھیں ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ بھی ملا ہے۔ سرسبز جیسے معیاری رسالے ایڈیٹر ہیں۔

دوسرے دن ہمیں پروفیسر حامدی کاشمیری سے ملنا تھا اور ہم اکیلے جا نہیں سکتے تھے۔ اس

لئے یہ سارا کام ہمارے دوست نئی نسل کے شاعر صحافی عمر فرحت کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ آج ہم لوگ شالیمار باغ دیکھنے جائیں گے اور وہیں سے حامدی کاشمیری صاحب کے پاس چلے جائیں گے کہ وہ شالیمار کے قریب ہی رہتے ہیں۔ شالیمار، مغل گارڈن اور دیگر تفریح گاہوں کو دیکھنے کا ٹکٹ لگتا تھا۔ جو عمر فرحت کبھی ظہیر انصاری لیتے۔ کوئی دو گھنٹے تک شالیمار باغ کی سیر کرتے رہے۔ جہاں عہد جہاں گیر کی کئی یادگار نشانیاں تھیں۔ اسی زمانے کے بنے ہوئے فوارے اور دیگر جھرنے ہیں۔ جو مغلیہ دور کی یاد دلاتے ہیں۔ شالیمار گارڈن کا یہ نظارا واقعی قابل دید تھا۔ ہم نے سب لوگوں کو وہیں چھوڑا اور چند ساتھیوں کے ساتھ پروفیسر حامدی کاشمیری سے ملنے چلے گئے۔ جو کہ بہت دیر سے منتظر تھے۔ عمر فرحت نے انہیں فون پر مطلع کر دیا تھا۔ انل اگروال، آفاق سیفی، کرشن کمار طور، عرفان عارف وغیرہ۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد ہم پہنچ گئے۔ حامدی صاحب گیٹ کے باہر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ یہاں یہ بات بتا دینا ضروری ہے کہ پروفیسر حامدی کاشمیری اس وقت کشمیر کی شان اور اس کا وقار ہیں۔ ایک نامور نقاد شاعر ادیب کی حیثیت سے دنیائے ادب میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ یہی نہیں وہ ایک با اخلاق اور اپنے چھوٹوں سے شفقت سے پیش آتے ہیں۔ ان سے یوں تو پہلے ساہتیہ اکاڈمی کے انٹرنیشنل سیمینار میں ملاقات ہو چکی تھی۔ ان کی بیگم بھی ایک بلند پایہ ادیبہ ہیں۔ انھوں نے کشمیر آنے کی دعوت بھی دی تھی اور یہ تک کہہ دیا تھا کہ میرے گھر ہی قیام کریں۔ اتنی بڑی شخصیت نے اپنی محبتوں سے اتنا نوازا تھا۔ ان سے کشمیر میں ملاقات نہ ہو تو گویا کشمیر ہی نہ دیکھا ہو۔ ایک گھنٹے تک حامدی کاشمیری صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ کچھ سوالات بھی کئے، جن کے جواب انھوں نے بہت تفصیل سے دیئے۔ ہم ان پر بہت پہلے سے انتساب کا خاص نمبر نکالنے کا سوچ رہے تھے کہ اس درمیان شیرازہ اور دیگر رسائل کے نمبر آ گئے۔ ان سے بات نہ ہو سکی۔

ایک گھنٹے کے بعد ہم شالیمار سے ہوتے ہوئے مغل گارڈن پر آ گئے، جہاں ہمارے باقی ساتھی موجود تھے۔ آج جمعہ کا دن تھا، ہمیں نماز پڑھنا تھی۔ ظہیر انصاری، مصداق اعظمی، علی منیر، اور دیگر ساتھی قریب کی مسجد میں پہنچ کر نماز پڑھنے گئے اور کچھ سیر و تفریح میں مشغول رہے۔ تین بجے اپنی قیام گاہ یعنی شہنشاہ ہوٹل پہنچ کر کھانا کھایا اور آرام کرنے لگے۔ اسی طرح ہم تین دن تک سری نگر اور اس کے آس پاس کی خوبصورت جگہوں پر تفریح کرتے رہے۔ بادام واری، حضرت بل، مغل گارڈن، اور دیگر تفریح گاہوں کی سیر کرتے ہوئے تین دن کا پتہ ہی نہیں چلا کہ ۱۰ تاریخ آ گئی۔

آج وحشی سعید صاحب کی چار کتابوں کا اجراء اور ان پر سیمینار ہونا تھا۔ صبح ہی سے لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ ہم بے تابی سے اپنے دوستوں کا انتظار کر رہے تھے۔ نذیر آزاد، شفق سوپوری،

بلکہ کسی نہ کسی قدر کی علامت کے بطور ہمارے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہوجاتا ہے۔ سو! فیض شناسی بھی عین قدر شناسی ہے اور یہ ہماری تہذیبی اقدار کی آئینہ دار ہے۔

صاحبو! فراق کا یہ دعویٰ غلط تو نہیں تھا کہ ایک دن آنے والی نسلیں اس پر فخر کریں گی کہ فراق کو دیکھا تھا۔ وہ میری خوش نصیبی کا دن تھا جب ''جشن فیض'' کے موقع پر بھوپال میں نہ صرف میں نے فیض کو دیکھا تھا بلکہ ان سے ملاقات اور گفتگو کا شرف بھی مجھے حاصل ہوا تھا۔ فیض نے بھرے جلسہ میں بار بار کہا تھا ''ہم تو محبت بانٹتے ہیں، ہم محبت کی بات کرتے ہیں۔'' یعنی فیض کا پیغام انسان کے نام محبت کا پیغام تھا، ۱۹۹۲ء کی اس مختصر ملاقات میں فیض کے چہرے کی ملائمت اور شفافیت، گفتگو میں پھول جھڑنے کی علامات ان کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ میں موجود تھیں، آج بھی ان کی نرم نرم باتوں کی خوشبوؤں سے دل و جاں معطر معطر ہے۔

فیض محبت کے شاعر تھے اور واقعی ان کی شاعری محبت کا حوالہ ہے۔ اردو تنقید کی عام روش کے مطابق فیض نے اپنی شاعری کا سفر غم جاناں سے شروع کیا تھا، اسے غم دوراں کی منزلوں تک بھی جاری رکھا۔ بعض ناقدین نے فیض کو خالص رومانی شاعر کہا ہے تو بعض کے نزدیک ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' کے حوالہ سے انھیں ترقی پسند شاعر اور ایک معنی میں نجات دہندہ قرار دیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فیض کے یہاں رومانیت اور اشتراکیت شیر وشکر نظر آتی ہیں۔

رومانیت اور اشتراکیت یا ترقی پسندی کے حوالہ سے میری خواہش ہے کہ میں ایک طویل بحث کا اعادہ کروں لیکن کئی وجوہ سے اس بحث کے لئے یہ موقع مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ فیض کی شاعری کے نکات کو سمجھنے کے لئے 'فیض شناسی' کے ایک مضمون سے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحریر کے اقتباس یہاں درج کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی رقم طراز ہیں کہ:

> ''فیض کی شاعری کے حوالے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خارجی واقعات اور ماحول کے ظلم وتشدد کے اثرات جب ان کے ذہن کو پوری طرح سے مشتعل کر چکے اور ان کی اندرونی دنیا کو منقلب کر چکے، تب انہوں نے اپنی قلبی واردات کو شعر میں ڈھالا۔ فیض نے صرف خارجی اثرات کو منظوم نہیں کیا بلکہ ان تجربوں اور مشاہدوں سے پیدا ہونے والے داخلی اور قلبی جذبات کو نظم کیا، جس کا اثر تیز وتند ہونے کے ساتھ ساتھ دیرپا اور بیدار رہا اور فیض کا یہی تخلیقی عمل انہیں ایک خاص مقام اور ایک خاص لہجہ عطا کرتا ہے۔'' (ص:۶۹)

رفیق راز، اور ڈاکٹر ظفر حیدری، سلیم سالک، فاروق نازکی، پرویز مانوس، شیخ بشیر احمد وغیرہ۔ اشرف آثاری، نور شاہ، ظہور تنویر، وحشی سعید، سید مظفر ایرج صاحب سے تو برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ لیکن باقی لوگ صرف مشاعرے کے دن آئے۔ سلیم سالک صاحب 'شیرازہ' جیسے معیاری رسالے کے ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے ہمیں بہت چھاپا ہے، جب ان سے ملاقات ہوئی تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ ان کی محبت ہے کہ وہ شیرازہ میں ہمیشہ اہتمام سے شائع کرتے رہے ہیں۔ یہاں بھی انھیں دیکھ کر اور ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی کہ ہم ان کو بزرگ سمجھتے تھے لیکن وہ نوجوان نکلے۔ اس سے ان کی شخصیت کا اور بھی اثر ہوا کہ انھوں نے چھوٹی عمر میں بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ 'شیرازہ' کا مکمل سیٹ ہمیں اور دوستوں کو دیا۔ شفق سوپوری، نذیر آزاد، مشتاق احمد وانی، مشتاق احمد کنی اور دیگر حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ افسوس ڈاکٹر ظفر حیدری اور پرویز مانوس سے ملاقات نہ ہو سکی جبکہ وہ تشریف لائے تھے۔ صبح دس بجے سے سیمینار ہونا تھا۔

۱۰ بجے جب پروگرام شروع ہوا تو سب سے پہلے وحشی سعید صاحب کی چار کتابوں کا اجراء ہوا، پروفیسر حامدی کاشمیری کے ہاتھوں۔ انھوں نے وحشی سعید کی فکشن نگاری پر جامع تقریر فرمائی، اس کے بعد وحشی سعید کے افسانوں اور ناول پر سب نے مقالے پڑھے۔ کسی نے صرف تقریر کی۔ یہ فہرست خاصی طویل تھی۔ شان بھارتی، جاوید انور، علی منیر، ظہیر انصاری، مظفر ایرج، کرشن کمار طور، احمد شناس، فاروق نازکی اور دیگر کئی قلم کاروں نے وحشی سعید صاحب کی فکشن نگاری پر مقالے پڑھے، اظہار خیال کیا۔ ای۔ ٹی۔ وی اور عالمی سے اور دیگر چینل والوں نے رکارڈنگ کی۔ نظامت کے فرائض جاوید انور صاحب نے انجام دیے، جو اس پروگرام کے کنوینر بھی تھے۔ جاوید انور صاحب 'تحریک ادب' کے ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے کئی ایسے شاعروں ادیبوں کو کھوج نکالا ہے، جن کے نام اور ادبی کارناموں سے ہم واقف نہیں تھے۔ کئی بیرون ممالک کے شاعروں، ادیبوں کی کتابیں چھاپی ہیں۔ خاص طور پر نقشبند قمر نقوی، زبیر فاروقی، اور اب وحشی سعید کی چار کتابیں ایک ساتھ چھاپی تھیں۔ جنھیں پڑھ کر وحشی سعید کے بارے میں اور ان کی فکشن نگاری سے آشنائی ہوئی۔ پروگرام کے بعد کھانے کا دور چلا۔ اس درمیان بہت سے شاعروں ادیبوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ نذیر آزاد، شفق سوپوری، مشتاق احمد کینی، شیخ بشیر احمد وغیرہ۔ یہ پورا دن پروگرام میں صرف ہوا۔ ۱۱ اگست کو مشاعرہ ہونا تھا۔ شام پانچ بجے کا وقت تھا، اس دن بھی خوب تفریح رہی، شام پانچ بجے جب مشاعرہ شروع ہوا تو اسٹیج پر شاعروں کی تعداد دیکھ کر ہم کانپ اٹھے کم از کم پچپن شاعر تھے۔ مشاعرہ ۶ بجے شروع ہوا تو بارہ بجے تک چلا۔ مائک خراب تھا، جس کی وجہ سے آواز صاف نہیں

آرہی تھی، شاید یہ ہمارے کم سننے کی وجہ سے لگ رہا ہو بہر حال مشاعرہ پر لطف تھا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مشاعرہ گویوں کا نہیں تھا۔ تمام شاعر سنجیدہ اور پڑھنے لکھنے والے تھے اور کئی تو بڑے نامور لٹریری شاعر تھے۔ کشمیر کے فاروق نازکی، مظفر ایرج، شفق سوپوری، نذیر آزاد، پرویز مانوس، شیخ بشیر احمد، احمد شناس، شبنم عشائی۔ ہندوستان کے معتبر شاعر ساہتیہ اکاڈمی انعام یافتہ کرشن کمار طور، عمر فرحت، نذیر آزاد، رفیق راز۔ غرض کہ ایک سے بڑھ کر ایک شاعر موجود تھا۔ وحشی سعید صاحب نے واقعی ہر طرح کا اہتمام کیا تھا۔ ڈھیر سارے شاعروں کو ایک جگہ جمع کرنا مشکل تھا لیکن وحشی سعید اور ان کی ٹیم نے واقعی کمال کیا تھا کہ کشمیر کے تمام معتبر شاعروں کے علاوہ انھوں نے شان بھارتی، علی منیر، اصغر ویلوری، مصداق اعظمی، کاش کچھ اور سنجیدہ ادیبوں کو اس میں شامل کرلیا جاتا۔ اس لئے کہ کچھ تو برائے نام بھرتیے کے شاعروں کو اس میں بلایا لیا گیا تھا۔ جن کا ادب میں کوئی نام نہیں تھا۔ نہ وہ مشاعروں ہی کے شاعر تھے۔ پھر بھی جاوید انور صاحب نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے ویسے بھی یہ کام بہت مشکل تھا جسے جاوید انور نے بڑی ایمانداری سے، محنت سے انجام دیا۔ کشمیر میں ایک ہفتہ یوں ہی گذر گیا، سب لوگوں کو تیرہ تک رکنا تھا لیکن ہمیں بارہ تاریخ کو آنا تھا کہ یوم آزادی کے مشاعرے میں ہمیں دہلی آنا تھا۔ جاوید انور صاحب نے ہمیں ۱۲/تاریخ کو ایک ٹیکسی میں بٹھا دیا۔ اس طرح ہم رات آٹھ بجے تک جموں آگئے۔ ہماری ٹرین پونے بارہ بجے تھی، حالانکہ ہمارا بہت دل چاہا کہ ہم اپنے دوست مشہور کہانی کار بلراج بخشی جو کہ اودھم پور میں رہتے تھے، رک جائیں لیکن بہت کوشش کے بعد بھی ان سے رابطہ نہ ہوسکا اور جموں کی تیز گرمی میں ہم لوگ پلیٹ فارم پر پسینے میں نہاتے رہے۔ دوسرا غضب یہ ہوا کہ عین وقت پر ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے دوست انل اگروال نے جو ریزرویشن کروایا تھا۔ اس کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ شاید وہ ہوا ہی نہیں تھا۔ اب بہت مشکل ہوگئی تھی۔ مشکل سے کرنٹ میں الگ سے ٹکٹ لیا۔ رش بے حد تھا کہ لوگ رتھ یاترا سے آرہے تھے۔ اتفاق تھا کہ ہمیں ٹکٹ مل گیا۔ ۱۳/کی دوپہر کو ہم دہلی آگئے۔ دہلی میں ہمیں محسن کرم فرما پروفیسر خالد محمود وائس چیرمین دہلی اردو اکیڈمی نے یوم آزادی کے مشاعرے میں بلایا تھا۔ آٹھ بجے شب ہم لوگ ایوان غالب پہنچ گئے، جہاں خالد صاحب کے علاوہ سکریٹری دہلی اردو اکیڈمی انیس اعظمی، راغب الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے تمام قابل ذکر شاعروں نے شرکت کی۔ وسیم بریلوی، اظہر عنایتی، انا دہلوی، مسلم صدیقی، انیس صدیقی، شمین۔ کاف نظام، عبدالاحد ساز اور دیگر کئی معتبر شاعر موجود تھے۔ افتتاحی خطبہ پروفیسر خالد محمود نے دیا اور ایس ایم خان نے شمع جلا کر مشاعرے کا آغاز کیا۔ جب ہمارا غزل سنانے کا نمبر آیا تو بہت دل چاہا

کہ خالد محمود صاحب جو کہ اردو اکیڈمی کے وائس چیئر مین ہیں، سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ہمارے لئے کیا کچھ کیا ہے، وہ سب یہاں بیان کر دیں، ہماری پڑھائی میں تربیت میں، جب ہمارے پاس ڈگری نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور ایک کارخانے میں بیڑی بناتے تھے، ہاں ہماری غزلیں اس زمانے میں ہر رسالے میں چھپ رہی تھیں۔ ایک نظم ہماری زبان میں بہت اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ جب اس کے ایڈیٹر آل احمد سرور تھے۔ خالد محمود سرونج تشریف لائے تو انھوں نے مبارکباد دی اور کہا تمہارے چھپنے کا سلسلہ اچھا ہے لیکن چھپنے سے زیادہ مطالعہ کو اپنی عادت بنالیں۔ یقیناً تم نے ادب کی اہم کتابیں باغ و بہار، مقدمہ شعر و شاعری، شعر العجم، جیسی کتابیں پڑھی ہوں گی۔ اب آگے شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ کی کتابوں کے نام بتائے، تو ہم حیرانی سے ان کا منہ تکتے رہے۔ اس لئے کہ ہم نے یہ سب نام ہی پہلی مرتبہ سنے تھے یعنی ہم نے اب تک ادب کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھی تھی اور سینکڑوں غزلیں چھپ چکی تھیں۔ اس پر خالد صاحب ہمارا منہ تکتے رہے اور انھوں نے ادب سے متعلق ایک گھنٹے تک تقریر کی اور ہمارے دوست محمود ملک کو ہدایت کی کہ اس کا ادیب ماہر کا فارم بھرا دو، اس طرح ہماری پڑھائی شروع ہوئی۔ یہ سب باتیں ہمیں دہلی اکاڈمی کے اس مشاعرے میں پڑھتے وقت یاد آرہی تھیں اور سوچ رہے تھے کہ سب کچھ یہاں بیان کر دیں کہ یہ موقع ان کے شکریہ ادا کرنے کا اچھا تھا لیکن مشاعرے میں پڑھنے سے پہلے ہی ناظم مشاعرہ نے صرف ایک ایک غزل پڑھنے کی ہدایت کر دی۔ اس طرح دہلی کے یوم آزادی کا مشاعرہ پڑھنے کے بعد ۱۵/اگست کو ہم دہلی سے روانہ ہو کر ۱۶/کو سرونج آگئے اور کشمیر کا یہ یادگار سفر بہت سے نقوش دل پر چھوڑ گیا۔ یہاں آکر ہم کشمیر کے تمام محسنوں کا شکریہ ادا کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے۔ کچھ احباب کا شکریہ ادا بھی کیا جیسے مظفر ایرج، نور شاہ، وحشی سعید، جاوید انور، شیخ بشیر احمد، سلیم سالک، احمد شناس، عمر فرحت، شفق سوپوری وغیرہ کا ابھی ہمیں کشمیر سے آئے ہوئے صرف پندرہ دن ہی ہوئے تھے کہ کشمیر میں اتنی کثرت سے بارش ہوئی کہ پورا کشمیر باڑھ کی زد میں آگیا۔ ہماری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور دل تڑپ اٹھا کہ جس جگہ ہم گئے اب اس جگہ پانی بھرا ہوا ہے۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ ان سے رابطہ ہو جائے، ان کی خیریت کے لئے دعائیں کیں لیکن وہاں تو بجلی فون سب بند تھے۔ کوئی دس دن کے بعد ہم نور شاہ اور مظفر ایرج صاحب سے بات کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وحشی سعید سے رابطہ اب تک نہ ہو سکا، حالات اب بھی نازک ہیں۔ خدا ان سب کی حفاظت فرمائے۔ جہاں کشمیر کی حسین وادیوں کے تصور سے ہم خوش تھے کہ اب سیلاب کے منظر کے تصور کانپ اٹھتے ہیں۔

☆☆☆

سیفی سرونجی

کشمیر کا ایک یادگار سفر

ایک درجن شاعروں کا جب چلا یہ قافلہ
دور تک پھیلا ہوا تھا بادلوں کا سلسلہ
آسماں سے کر رہے تھے بات سب اونچے پہاڑ
گا رہے تھے پیار کے مستی بھرے نغمے پہاڑ
چل پڑے حسرت لئے ہم وادیٔ کشمیر کو
دن تھا وہ اتوار کا پہنچے وہاں پر پیر کو
یاد رکھیں گے ہمیشہ وہ پہاڑی راستہ
آج تک دیکھا نہ تھا نا پڑا تھا واسطہ
دیکھ کر حیران تھیں سب کی نگاہیں دوستو
تک رہی تھیں دور سے سب کی نگاہیں دوستو
ایک ڈھابے پر ملی چائے انوکھی روٹیاں
لے رہے تھے سب مزے سے ہلکی ہلکی چسکیاں
وادیٔ کشمیر میں کیا کیا ہمیں اچھا لگا
اونچے نیچے راستوں کا سلسلہ اچھا لگا
ہر طرف کشمیر میں پھیلا اجالا پیار کا
جس طرف ڈالی نظر دیکھا نظارا پیار کا

چل پڑے پھر وہاں سے گہری ندی کے گھاٹ پر
آگے چل کر دم لیا ہم نے پرانی کھاٹ پر
کھل رہے تھے پھول ہر سو وادیٔ کشمیر میں
دیکھتے رہتے تھے ورنہ اب تلک تصویر میں
وادیٔ کشمیر میں جس وقت رکھا ہے قدم
دل خوشی سے جھوم اٹھا بھول بیٹھے سارے غم
لگ رہا تھا یوں ہمیں کہ آگیا ہو روز عید
جس کے ہم مہمان تھے وہ نام تھا وحشی سعید
منتظر بیٹھے تھے کب سے میزباں وحشی سعید
تھے مظفر نور شاہ اور مہرباں وحشی سعید
ہوٹلوں کا بادشاہ وہ کنارا جھیل کا
ہر نظارا تھا ہمارے خواب کی تکمیل کا
سامنے ڈل جھیل تھی ہوٹل بھی عالیشان تھا
جس طرف بھی جایئے پھولوں بھرا میدان تھا
مل گئے پھر تو ہمیں اشرف قسیم اور طور بھی
ساتھ میں ان کے ملے وحشی سعید اور نور بھی
تھے شفق موجود اور جاوید انور ساتھ میں
اور ظہیر انصاری بھائی شان اصغر ساتھ میں
دوستوں میں تھے ہمارے اک عمر شاعر ادیب
ان سے مل کر یوں لگا جیسے ہمارے ہوں رقیب
یاد ہے گل مرگ کا منظر سہانا یاد ہے
گھاس چرتے گھوڑے کا وہ ہنہنانا یاد ہے
درمیاں گھوڑوں کے جب شاعر ہوئے احمد شناس
جیسے گھوڑوں کے بہت ماہر ہوئے احمد شناس
مسکرا کر دیکھتا جب بھی کوئی گھوڑا انہیں
آرہا تھا کیوں مگر ہر بات پر غصہ انہیں

کہہ رہے تھے سب انہیں سے آیئے صاحب ادھر
اور وہ غصے میں سب کو کہہ رہے تھے جانور
تھے ہمارے دوستوں میں شاعر بڑے احمد شناس
گھڑ سواروں سے مگر جم کر لڑے احمد شناس
تھا بڑا پر کیف منظر اور پہاڑوں کا سلسلہ
ہلکی ہلکی دھوپ میں اترا ہمارا قافلہ
ہر طرف بکھری ہوئی تھیں ساتھیوں کی ٹولیاں
بھر رہی تھی سب یہاں خوشیوں سے اپنی جھولیاں
دو بجے تک تھک گئے سب گھومتے پھرتے ہوئے
رفتہ رفتہ سب اکٹھے ایک جا ہونے لگے
واپسی گل مرگ سے مشکل ہماری ہوگئی
اک بنارس والے مولانا کی ٹوپی کھو گئی
سب اکٹھے ہوگئے جب لوٹ کے آنے کے لئے
دو مسافر کم ہوئے تو رہ گئے سب حیراں کھڑے
ایک تھے مولانا کوئی دوسرے عرفان تھے
وقت گذرا جارہا تھا لوگ سب حیران تھے
لے گئے گھوڑے انہیں جانے کہاں پر دور تک
منتظر بیٹھے رہے اصغر علی اور طور تک
دیکھ کر ٹوپی ہر اک احمد میاں یوں بولتے
آگئے وہ آگئے دروازہ جھٹ سے کھولتے
شام جب ڈھلنے لگی آئے نظر وہ دور سے
چھوڑ کر جانے کی ضد کرنے لگے سب طور سے
کہہ رہے تھے سب یہی کس نے بلایا ہے تمہیں
ہم اسی کو پکڑیں گے جس نے بلایا ہے تمہیں
منتظر بیٹھے رہے سب شام تک گل مرگ پر
فاتحہ پڑھتے رہے سب شام تک گل مرگ پر

جب ہوا گل مرگ سے واپس ہمارا قافلہ
دور سے دیکھا تو لاری میں تھا اک گھوڑا کھڑا
کہدیا ہم نے بہت جذبات میں اچھا شناس
آج تک ہم نے نہ دیکھا آپ سا گھوڑا شناس
کیا سہانی شام تھا چشمہ رواں تھا پیار کا
کم نہیں تھا دوستو منظر وہ شالیمار کا
آج حضرت بل کا بھی دیدار ہم نے کر لیا
یوں سمجھ لیجئے کہ پھر دامن خوشی سے بھر لیا
حامدی کشمیری تو ہیں بادشاہ تنقید کے
منتظر تھے ہم بہت مدت سے ان کی دید کے
مل گیا ان سے ہمیں یارو دفینہ علم کا
حامدی کشمیری ہیں بے شک خزینہ علم کا
باغ تھا بادام کا بادام واری نام تھا
گھومنا پھرنا ہمارے دوستوں کا کام تھا
ایک سیمینار تھا دولہا بنے وحشی سعید
ہار پھولوں سے کیا سب نے انہیں خوش آمدید
تھے مظفر ساتھ میں اور بھائی تھے ان کے ظہور
پیچھے تھے آثار واشرف چل رہے تھے آگے نور
جب ہوا اجرا جناب حامدی کے ہاتھ سے
کھل گئے چہرے سبھی کے حامدی کی بات سے
اک صحافی تھے میاں جاوید انور ساتھ میں
تھی کتابیں چار بھی وحشی کی ان کے ہاتھ میں
شاعری کا دور بھی پھر آگیا بالکل قریب
رونق محفل ہوئے چھوٹے بڑے شاعر ادیب
شاعری کا دور جب اسٹیج پر چلنے لگا
دل پر اک جھٹکا لگا اک خوف سا لگنے لگا

دیکھ کر اسٹیج پر اتنی بڑی تعداد کو
کون سنتا اب ہماری دکھ بھری فریاد کو
ذکر کس کس کا کروں کیا کیا نہ دیکھا جھیل میں
کون جائے دوستو اتنی بڑی تفصیل میں
یاد آتے ہیں بہت کشمیر کے احمد شناس
دیکھتا ہوں جب کسی گھوڑے کو میں تنہائی میں
ذکر ہوتا ہے اگر جب بھی کہیں کشمیر کا
ڈوبنے لگتا ہوں میں ڈل جھیل کی گہرائی میں
ہے بڑا احسان اس کا بخشے تحفے پیار کے
گارہے ہیں ہم خوشی سے آج نغمے پیار کے
عزت وشہرت کا مالک ایک ہے رب جلیل
سامنے اس کے نہیں چلتی کبھی جھوٹی دلیل

☆☆☆

تمام تخلیق کار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ :Email سے تخلیقات مندرجہ ذیل پتے پر اور Inpage میں بھیجنے کی زحمت فرمالیا کریں۔ کیوں کہ اسکین کے ذریعہ بھیجی ہوئی تخلیقات کبھی کبھی صاف طور پر پڑھنے میں بھی نہیں آتیں۔
دونوں Email. میں سے کسی پر بھی بھیج سکتے ہیں۔

Email:

saifi_sironji@rediffmail.com

mateennadvi1975@gmail.com

غزل

یہ بشارت تیرے لب کے پہلے تاب لمس کی ہے
منجمد ظلمات سے گزرو تو بہتی روشنی ہے
برف کا کوئی نشان تک بھی نہیں ہے وادیوں میں
دست و پا پتھرائے ہیں، چہروں پہ تاریکی جمی ہے
وہ برہنہ تن پہ کالے بال کھولے آئے گی
خواب آور سبز راہوں میں منور تیرگی ہے
کتنے قد آور صنوبر کھائیوں میں گر رہے ہیں
معبدوں سے اس پہر نکلو، یہ منظر دیدنی ہے
آئیں گے زریں پرندے ساحلی بستی کی جانب
چاندنی خفتہ دریچوں پر اکیلی جاگتی ہے
اب بھی مرجانی جزیرے میں وہ مہ رو منتظر ہے
موج کے رتھ پر پری یہ مژدہ لے کے آئے گی
کس کو اب آواز دوں، کیسے گزر اوقات ہوگی
کھڑکیاں ٹوٹی پڑی ہیں بام و در بے رونقی ہے

☆

بلا

موج در موج
رقص جنوں
تشنہ لبی
اندھیرے کی تھکن
رشتۂ صوت و صدا
آبلہ پائی کا سماں
اور اماوس کی گھٹا
صبح سے شام تلک
نسل آدم کا قہر
دیدۂ خواب کا درد
ریشہ ریشہ سا بدن
جمیل کنول !
سب تہہ تیغ ہوئے
زندہ جلائے بھی گئے
جو بچے کیمپ میں ہیں
نہ رہا رنگ شفق
نہ رہا لمس خیال
نہ رہا نقش و نگار
بسکہ زندہ ہیں وہ
دست فطرت سے ضیا بار ہوئے
زیست کا عنوان ملا ہے ان کو
ہاں ! مگر سوچتا ہوں
فرقہ پستی کی بلا
ہے کیوں ساتھ بھلا ؟

کرشن کمار طور

غزلیں

کچھ ایسے اب اس سے رابطا ہے
طوفان میں جیسے اک دیا ہے
ہے چاروں طرف زوال جاری
دنیا میں کب کوئی رہا ہے
آنکھوں پہ اٹھا لیا ہے غم کو
یہ خوب خزانہ خواب کا ہے
روشن تھا اک چراغ دل میں
دیکھیں تو اس کو کیا ہوا ہے
کوچوں میں بہت ہے شور ماتم
خارج کوئی زیست سے ہوا ہے
اس نے اپنوں کا دوسروں سے
ہر راز کو فاش کر دیا ہے
یہ زیست کبھی تو راس آئے
اے طور تجھے مری دعا ہے

☆

اک نقش سا ابھارتا رہتا ہوں ہر طرف
خود کو بہت پکارتا رہتا ہوں ہر طرف
لوگوں کو یہ لگے کہ فقط ان کی بات ہے
وہ داستاں اتارتا رہتا ہوں ہر طرف
یہ شوق میری ذات کا ہے ایک آئینہ
دنیا میں سب ہارتا ہوں ہر طرف
جس سے اسے پتہ نہ چلے میرے اصل کا
دشمن کو ایسے مارتا رہتا ہوں ہر طرف
کرتا ہوں سارے شہر میں خود کو وصل باب
اک لفظ کو سنوارتا رہتا ہوں ہر طرف
کس سے بھلا امید مجھے ہے جواب کی
کس کو یہاں پکارتا رہتا ہوں ہر طرف
جس بات کا یقین مجھے خود نہیں ہے طور
لوگوں میں وہ گزارتا رہتا ہوں ہر طرف

☆

تاہم اس مضمون (فیض کی شاعری، تجزیہ وتبصرہ) صفحہ ۶۷ پر سید تقی عابدی نے فیض کی ایک نظم کو سامنے رکھتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ: ''فیض نے یہاں رومان کا سفر کیا ہے، یہ مجاز سے انقلاب کا راستہ ہے، یہاں غم جاناں اور غم دوراں کی آزمائش ہے۔'' لیکن انھوں نے فیض کی شاعری کے بارے میں جو یہ مشہور ہے کہ ''ولے بفروختم جانے خریدم'' کے تناظر میں یہ ضرور کہا کہ فیض نے ''خالص رومانی نظمیں اور غزلیں بھی نہیں کہیں، غلط ہے۔'' میرے خیال میں صحیح یہی ہے کہ فیض انسانی جبلتوں کے شاعر تھے اور فطری شاعر تھے اور اردو شاعری کی تہذیب نے انہیں رومان وحقیقت کے وہ آئینے دئے کہ جن میں فیض نے انسانی اقدار کے نقوش تلاش کئے اور انھیں کو اپنی شاعری میں اولیت دی، یہی خوبیاں ان کے فن کی پہچان بنی ہیں۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ ''فیض شناسی'' میں فیض احمد فیض اور اختر شیرانی کی مشترکہ قدروں کو بھی تلاش کیا گیا ہے۔ اس معنی میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی نگاہ سخن شناس کے ساتھ ساتھ ان کی دروں بینی، نکتہ رسی اور دور اندیشی کا بھی قائل ہونا پڑا ہے۔ اختر شیرانی اور ان کی رومانیت کے حوالے سے مختصراً میں اپنی بات بھی رکھنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ

(۱) اختر شیرانی کی رومانیت محض مغرب کی دین نہیں ہے بلکہ بہت کچھ مشرقی ادبیات کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

(۲) اختر شیرانی کی رومانی شاعری میں زیریں لہر کی طرح انقلابی رنگ وآہنگ بھی موجود ہے۔

(۳) اختر کے عہد میں جو نئی نسل ادب میں اپنی پہچان بنانے کی کوشش میں تھی، ان میں سے بیشتر نے اختر شیرانی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ استفادہ کیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی، ن۔م۔ راشد اور ناصر کاظمی نے تو باقاعدہ ان سے اصلاح سخن کا معاملہ رکھا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے اسی سرچشمہ سے اپنی راہ الگ نکالی۔

''فیض شناسی'' میں شامل ایک نادر مضمون ''فیض اور اختر شیرانی کی مشترکہ قدریں'' ڈاکٹر سید تقی عابدی کی منصف مزاجی اور حق گوئی کی دلیل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ بات تعجب خیز ہے کہ اختر شیرانی جیسے شاعر کو اردو شعر وادب نے صرف ان کے نام تک محدود کر دیا اور خواص بھی ان کے کلام سے سطحی طور پر آشنائی رکھتے ہیں، تنگ نظر ادیب نما مختسبوں، رقیبوں اور واعظوں نے ان کے کلام کو رومانی شاعری بلکہ معمولی درجہ کی سیتی، چوما چاٹی کی شاعری کہہ کر ان کی شاعری کا بہیمانہ

ڈاکٹر نریش

پرتپال سنگھ بیتابؔ

غزلیں

کیا بتائیں کہ رواداری میں کیا رکھا ہے
ہم نے تہذیب کو سینے سے لگا رکھا ہے

قتل کا حکم ہی دینا ہے جو ان کو آخر
فیصلہ کس لئے کل ول پہ اٹھا رکھا ہے

چاک داماں لئے ہم پھرتے ہیں گلیوں گلیوں
کوئی پوچھے کہ یہ کیا حال بنا رکھا ہے

اس قدر بھوک سے بے حال تھے صیّاد کہ ہم
دیکھ پائے ہی نہیں جال بچھا رکھا ہے

ان کے انصاف پہ آئے نہ کوئی حرف نریشؔ
ہم نے دامن پہ خود اک داغ لگا رکھا ہے

☆

اندھے گونگے بہرے لوگ
یہ اونچے سے اونچے لوگ

تن کی دوڑ میں شامل ہیں
من کے ہارے مارے لوگ

رستہ بھول گئے اکثر
آکر چوک چوراہے لوگ

چلتے ہیں رک جاتے ہیں
چابی بھرے کھلونے لوگ

خیمہ خیمہ بستی ہے
چہرہ چہرہ اجڑے لوگ

جانتے سب کچھ ہیں بیتابؔ
چپ ہیں ڈر کے مارے لوگ

☆

رفیق جعفر

ہو کے رہے گا ہونا ہو گا
جو بھی ہوگا اچھا ہوگا

سُن کر میری پریم کہانی
بچہ بچہ ہنستا ہوگا

چھوڑ کے بس تک واپس جاتے
مُڑ کر اس نے دیکھا ہوگا

تم پر مجھ پر کیا کیا بیتی
جب بھی ملیں گے چرچا ہوگا

یاد کی خوشبو جس میں ہوگی
پھول نہیں وہ کانٹا ہوگا

آج ہی اپنی بھیگی پلکیں
کل کیا جانے کیا ہوگا

چھوڑ دو جعفر پیار کا چکر
پیار کرو گے دھوکا ہوگا

☆

شاہد عزیز

غزلیں

بلا رہے ہیں مجھے دور کے نظارے بھی
سلگ رہے ہیں مرے ساتھ یہ ستارے بھی

پلٹ کے آنا تو ممکن نہیں مگر پھر بھی
میں چاہتا ہوں مجھے کاش تو پکارے بھی

تو میرے ساتھ نہیں ہے تو کیا ہوا پھر بھی
گذر ہی جائیں گے یہ خشک دن ہمارے بھی

کسی کے درد کا احساس اب نہیں ہوتا
کٹے پھٹے ہیں بہت دور تک کنارے بھی

یہ اور بات میں زندہ ہوں اب تلک لیکن
جلا رہے ہیں مجھے وقت کے شرارے بھی

☆

حفیظ انجم کریم نگری

گیت غزل

کس کو آیا راس سکھی ری!
آنکھوں کا بن باس سکھی ری!
من کو نہیں وشواس سکھی ری
چھوڑ چکی ہوں آس سکھی ری
انترگت تک پیاسی ہوں میں
کیسے بجھے گی پیاس سکھی ری
وہ آیا نہ نیند ہی آئی
ٹوٹ گیا وشواس سکھی ری
کب بانہوں کے جھولے ہوں گے
آیا ساون ماس سکھی ری
ڈار ڈار پر پھول کھلیں گے
ہوتا ہے آبھاس سکھی ری
تیاگ دوں اس بیری جیوں کو
یا لے لوں سنیاس سکھی ری
کنچن کایا مدھو شالا ہوں
دوں گی میں اُلاس سکھی ری
اندر باہر گولا ہل ہے
جان ہوئی ہے ناس سکھی ری
انتم ہچکی آنے کو ہے
یار نہیں پاس سکھی ری
پھر مجھ کو رچنا ہے انجم
ایک نیا اتہاس سکھی ری

اختر کاظمی

غزل

تماشگی کے ہر ایک منظر مری نظر سے گذر چکے ہیں
شباب نے اپنی راہ لے لی نشے کے دریا اتر چکے ہیں
پرندۂ عمر اڑ گیا ہے سمیٹ کر اپنے بال و پر کو
خلا میں جاتے ہی بازو و پر کھلی ہوا میں بکھر چکے ہیں
فضاؤں میں وہ دمک نہیں ہے ہواؤں میں وہ خنک نہیں ہے
نگاہ پتھرا گئی ہے یا پھر تمام منظر ٹھہر چکے ہیں
نوائے ساز دل حزیں میں نہ لے ہے نہ کوئی سُر ہے
اجل کے سائے کی جنبشوں سے تمام نغمے سنہر چکے ہیں
نہ اب وہ افکار میں رمق ہے نہ اب تخیل کے سلسلے ہیں
سخن میں جن سے ہما ہمی تھی وہ سارے اثرات مر چکے ہیں
ہم اپنی فطرت بدل نہ پائے کسی کے سانچے میں ڈھل نہ پائے
نہیں رہا کوئی عذر باقی تو سارے پیمانے بھر چکے ہیں
کتاب دل کے کسی ورق پر ذرا بھی داغ زیاں نہیں ہے
حروف ہیں فکر آگہی کے تمام صفحات بھر چکے ہیں
کبھی بھی اختر سجے گی ڈولی برات نکلے گی زندگی کی
حیات ہے سرخ پیرہن میں فنا کے گیسو سنور چکے ہیں

☆

قیصر عزیز

جمال قدوسی

غزلیں

ہیرے کبھی فٹ پاتھ پہ بیچا نہیں کرتے
فن کار کبھی فن کا تماشا نہیں کرتے

وہ لوگ جو ہوتے ہیں طلبگار محبت
دنیا کی کسی شئے کی تمنا نہیں کرتے

اخلاص کی بارش نہ وفاؤں کی ہیں کرنیں
الفت کے شجر ایسے میں پنپا نہیں کرتے

رہنے دو شبِ ہجر تھرکتے ہوئے آنسو
ٹوٹے ہوئے تاروں سے اُجالا نہیں کرتے

ماحول شگفتہ ہو تو خاموشی ہی اچھی
سچ بول کے ماحول کو گندا نہیں کرتے

چوکھٹ پہ امیروں کے بیکار ہے جانا
یہ پیڑ کھجوروں کے ہیں سایہ نہیں کرتے

اللہ پہ ہوتا ہے یقیں جن کو بھی قیصؔر
انسان کے تلوے کبھی چاٹا نہیں کرتے

☆

مشکل میں ایمان اے رب ہے
ہر جانب طوفان غضب ہے

قاتل کو دستارِ فضیلت
وقت کا بھی دستور عجب ہے

بہک رہے ہیں پی کر اوچھے
دل والا ہی تشنہ لب ہے

جس کا ہورا اس کا کورا
مثل یہ سچی کتنی اب ہے

آج جمالؔ اکثر کے لب پر
تیرا کیا ہے میرا سب ہے

☆

شارق عدیل

دوڑ

وقت کی رفتار بہت تیز ہے
اس کے ہمراہ چلنے کے لئے
دوڑ ناضروری ہے
اور اگر
تم دوڑنے کے ہنر سے
ناواقف ہو تو لوٹ جاؤ
اپنے ماضی کے بوسیدہ کھنڈر میں
جہاں زندگی آج بھی
گھڑی کی سوئیوں سے
کہیں زیادہ
سست چلتی ہے

☆

حنیف ساحل

غزل

غم سے رشتہ ہے ابھی تک میرا
زخم تازہ ہے ابھی تک میرا
کچھ تغافل بھی ہے پیہم اس کا
کچھ گلہ بھی ہے ابھی تک میرا
عین ممکن ہے وہ بھی آجائے
جی یہ کرتا ہے ابھی تک میرا
ٹوٹ جائے گا سنبھالو اس کو
دل یہ شیشہ ہے ابھی تک میرا
ایک لمحے کی رفاقت تھی مگر
وہ شناسا ہے ابھی تک میرا
اس سے بچھڑا تو کسی سے نہ لگا
دل یہ تنہا ہے ابھی تک میرا
اس لئے زندہ ہے سخن ساحلؔ
رنگ سادہ ہے ابھی تک میرا

☆

رفیق شاہین

غزلیں

مرے دل کی یہ محبت کوئی لے سکے تو لے لے
مری قیمتی یہ دولت کوئی لے سکے تو لے لے
مری عاشقی ملامت ہے گلے میں طوق لعنت
یہی جو ہے مری عظمت کوئی لے سکے تو لے لے
میں جلا کے زخم دل کے کروں قصر جاں کو روشن
مرے ذوق غم کی لذت کوئی لے سکے تو لے لے
یہی لوح اور قلم ہیں مری مملکت میں شامل
مری اپنی یہ ریاست کوئی لے سکے تو لے لے
مرا کام حق پہ چلنا ، مجھے دار پر ہے چڑھنا
مرا حوصلہ یہ جرأت کوئی لے سکے تو لے لے
مرا گھر سڑک کی پٹری ، مرا پیشہ بوجھ ڈھونا
یہ مجھے ملی وراثت کوئی لے سکے تو لے لے
مراتن ہے نیم عریاں میں ہوں بھوک سے پریشاں
مری نیم جاں شرافت کوئی لے سکے تو لے لے

☆

ہو سکتے ہیں گیسو بھی کسی مہ جبیں کے سانپ
اچھا ہے پالئے نہ اگر آستیں کے سانپ
ہے دور کے سانپوں سے تو کم جان کا خطرہ
مہلک ہیں مگر زیادہ ہی قرب وقریں کے سانپ
ممکن ہی نہیں پہنچے ہمیں غیر سے ضرر
احباب ڈسا کرتے ہیں بن کر یقیں کے سانپ
ہیں سانپ تو پھر سانپ تحفظ ہے لازمی
خشکی کے ہوں تری کے ہوں یا ہوں کہیں کے سانپ
پھنکار سے زمیں کو ہوا میں اچھال کر
برباد ہی نہ کردیں جہاں کو زمیں کے سانپ
جب بھی نمود پاتا ہے شہکار فن مرا
تنقید بن کے مجھ کو ڈسیں شکستہ جبیں کے سانپ
شاہین کتنی لاشیں بچھا کر بنے وزیر
ایوان حکومت میں یہی شہہ نشیں کے سانپ

☆

ممنون حسن خاں ممنون

ڈاکٹر مہتاب عالم

غزل

(چند اشعار)

میری خواہش ہے غزل کو اک نیا انداز دوں
زندگی لفظوں سے جھانکے وہ صدا وہ ساز دوں

دن تو گزرا ہے مسائل کی سلگتی دھوپ میں
فکر یہ ہے اے شبِ غم کیا تجھے اعزاز دوں

تیری آنکھیں پہلے ہی اشکوں سے ہیں بھیگی ہوئی
اور اک تازہ خبر کیسے تجھے اے ہمراز دوں

طائرِ بے حوصلہ اونچی اڑانوں کے لئے
اپنے شہپر دوں تجھے ، آ جرأت پرواز دوں

میں نے تجھ کو متاعِ جان ودل بھی بخش دی
اور کیا اس کے سوا تجھ کو سراپا ناز دوں

حرف منت کے مگر ہونٹوں تلک آئے نہیں
جی بہت چاہا اسے روکوں اسے آواز دوں

کوئی ملتا ہی نہیں ممنونؔ ایسا میں جسے
گوشۂ دل میں جو پوشیدہ ہے حرفِ راز دوں

☆

تیری قربت تو میسر نہیں مجھ کو لیکن
میں اگر جھوٹ نہ بولوں تو اکیلا ہوجاؤں

میں تو پتھر سے گیا گزرا تھا لیکن ایک رات
جانے کیا سوچ کے ان آنکھوں میں آنسو آئے

چھوڑ کر جارہے ہو جاؤ مگر
واپسی کا بھی سلسلہ رکھنا

زندگی ہر لمحہ رنگ اپنا بدلتی جائے ہے
ریت جیسے بند مٹھی سے پھسلتی جائے ہے

رہیں گی دل کی سرائے میں حسرتیں کب تک
یہاں سے کوچ کرے اب یہ کارواں جائے

☆

گوشۂ احمد شناس

سیفی سرونجی

کچھ احمد شناس کے گوشہ سے متعلق

یوں تو احمد شناس کی شاعری اکثر رسالوں میں پڑھتا رہتا تھا، چند مہینے پہلے ان کی کتاب 'صلصال' پر جب اتر پردیش اردو اکیڈمی نے انعام سے نوازا تو ان کی کتاب دیکھنے کا بھی اشتیاق پیدا ہوا، ادھر ہمارے دوست 'تفہیم' کے ایڈیٹر عمر فرحت کے رسالے میں 'صلصال' کا بھر پور تعارف اور اشتہار نظر سے گذرا تو اس کتاب کو دیکھنے کی اور بھی تڑپ پیدا ہوئی، قدرت خدا کی دیکھئے کہ پندرہ دن کے بعد کشمیر کے مشہور فکشن نگار وحشی سعید کی کتابوں کے اجراء میں انھوں نے کشمیر آنے کی دعوت دی، تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کشمیر میں یوں تو انتساب بڑی تعداد میں جاتا ہے اور وہاں کے تمام معتبر شاعر ادیب انتساب میں چھپتے رہے ہیں، ان سے خط و کتابت بھی رہی ہے۔ مثلاً پروفیسر حامدی کاشمیری، شفق سوپوری، نور شاہ، مظفر ایرج، ڈاکٹر اشرف آثاری، فاروق نازکی، شیرازہ کے ایڈیٹر سلیم سالک، رفیق راز، نسرین نقاش، ہمدم کاشمیری، ابن اسماعیل، پرویز مانوس وغیرہ۔ جموں دو ایک بار مشاعروں میں شرکت کی وجہ سے ان سب سے ملاقات بھی ہو چکی ہے لیکن اس بار جس شاعر سے ملنے کی تمنا تھی، اس کا نام احمد شناس ہے اور واقعی احمد شناس صاحب سے مل کر خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور جب انھوں نے اپنی کتاب 'صلصال' سے نوازا، تو یہ شاعری

پڑھ کر میں ہی نہیں جس نے بھی اس کتاب کو دیکھا، وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، میں نے کتاب پڑھتے ہی یہ فیصلہ کرلیا کہ اس شاعر پر 'انتساب' کا گوشہ ضرور آنا چاہئے اور میں نے احمد شناس کی اجازت کے بغیر گوشہ کا منصوبہ بنالیا لیکن مشکل یہ تھی کہ انھوں نے کتاب صرف ایک دی تھی، میں ان پر مضامین کیسے لکھواتا، کتاب کا ایک نسخہ کس کس کو بھیجتا۔ اتفاق سے پندرہ دن کے بعد یعنی ۲۰/۲۱ ستمبر کو ہمارے دوست انل اگروال نے سدبھاونا منچ اور انتساب پبلی کیشنز کی جانب سے سرونج میں دوروزہ سیمینار کا اعلان کر دیا۔ جس میں ہندوستان کے معتبر شاعروں، ادیبوں کو شرکت کی دعوت دی گئی اور سب نے منظوری بھی دیدی۔

اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے محمد متین ندوی صاحب نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ احمد شناس صاحب کی کتاب 'صلصال' پر ایک مباحثہ کرلیا جائے تا کہ احمد شناس پر ایک اچھا اور ان کے شایان شان گوشہ شائع کیا جاسکے۔ سیمینار میں شرکت کرنے والے کوئی ایسے ویسے نہیں تھے۔ ڈاکٹر جانکی پرساد شرما، پروفیسر مختار شمیم، پروفیسر محمد نعمان خان، رشید انجم، ضیاء فاروقی، احد پرکاش، ڈاکٹر آصف سعید، محمود ملک، ڈاکٹر صادق علی، محمد متین ندوی، وغیرہ۔

ڈاکٹر نعمان خان این سی آر ٹی دہلی میں پروفیسر ہیں، مشہور ناقد، محقق کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اسی طرح پروفیسر مختار شمیم ایک نامور محقق، نقاد اور 'اردو بلچل' کے ایڈیٹر ہیں۔ رشید انجم ہندوستان کے مشہور ڈرامہ نگار، افسانہ نگار اور مشہور صحافی ہیں۔ احد پرکاش ہندی اور اردو کے مشہور ادیب اور صحافی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ضیاء فاروقی یوپی کے نامور ادیب اور شاعر ہیں، جو آج کل بھوپال میں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر آصف سعید گورنمنٹ ایجوکیشن کالج میں لیکچرر ہیں۔ محمود ملک ماڈل ہائیر سیکنڈری اسکول میں لیکچرر ہیں۔ اچھے ادیب ہیں۔ ڈاکٹر صادق علی گرلس ہائیر سیکنڈری اسکول میں لیکچرر ہیں۔ محمد متین ندوی نئی نسل کے نقادوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

طے یہ کیا گیا کہ سب کو فرداً فرداً کتاب پڑھوائی جائے اور سیمینار کے آخری دن 'صلصال' پر مباحثہ کیا جائے، اس طرح صلصال کے مطالعہ کے بعد جو تاثرات اہل قلم نے پیش کئے وہ اس گوشہ میں شامل ہیں۔

☆☆☆

سیفی سرونجی

یوپی اردو اکیڈمی سے انعام یافتہ شاعر احمد شناس کی کتاب 'صلصال' پر ایک مباحثہ

شرکاء

پروفیسر محمد نعمان خان، پروفیسر مختار شمیم، رشید انجم، ضیاء فاروقی، احد پرکاش، سیفی سرونجی، محمد متین ندوی، ڈاکٹر صادق علی، محمود ملک، ڈاکٹر آصف سعید، انل اگروال، آفاق سیفی

گذشتہ دنوں سیفی لائبریری سرونج میں ایک آل انڈیا سیمینار ''سرونج کی تاریخی وادبی حیثیت'' کے عنوان سے منعقد کیا گیا۔ جس میں ہندوستان کے معتبر شاعروں، ادیبوں، پروفیسروں نے شرکت فرمائی۔ جن میں ڈاکٹر جانکی پرساد شرما، پروفیسر محمد نعمان خاں، پروفیسر مختار شمیم، رشید انجم، ضیاء فاروقی، احد پرکاش، محمود ملک، ڈاکٹر آصف سعید، اور کئی معتبر حضرات نے شرکت فرمائی۔ اس موقع پر غزل کے معتبر شاعر احمد شناس کی کتاب 'صلصال' پر مباحثہ کیا گیا۔ جس میں بیرونی شاعروں ادیبوں کے علاوہ ڈاکٹر صادق علی، انل اگروال، محمد متین ندوی، آفاق سیفی، نے بھی اظہار خیال کیا اور احمد شناس کی کتاب 'صلصال' کو سینکڑوں کتابوں کی بھیڑ میں ایک اہم کتاب قرار دیا۔ سب سے پہلے سیفی سرونجی نے احمد شناس کا تعارف کرایا اور کشمیر میں ملاقات کے کئی واقعات سنائے۔

پروفیسر محمد نعمان خان نے 'صلصال' پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا:

''اردو شاعری ابتدا ہی سے داخلی اور خارجی معاملات ومسائل کی آئینہ دار رہی ہے، بقول آل احمد سرور۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

غزل میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی ہے
ہماری بات بھی ہے اور تمہاری بات بھی ہے

احمد شناس جدید نسل کے جدید لب ولہجہ کے باکمال شاعر ہیں۔انھوں نے اپنے نجی احساسات وخیالات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اپنے عصر کے حالات کو بھی سادگی ،سچائی اور اثر انگیزی کے ساتھ اپنے اشعار میں ڈھالا ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کا مشاہدہ، پڑھنے والے کا تجربہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور قاری ان کی فکر وخیال سے ہم آہنگ ہوکر محسوس کرتا ہے کہ۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شعراء کے ہجوم میں اپنی انفرادیت قائم رکھنا آسان کام نہیں ہے۔

احمد شناس کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔

(پروفیسر محمد نعمان خان این سی آر ٹی - دہلی)

مشہور محقق ،نقاد، شاعر اور افسانہ نگار پروفیسر مختار شمیم ایڈیٹر 'اردو ہلچل'' بھوپال، نے احمد شناس کے شعری مجموعہ 'صلصال' پر یوں اظہار خیال کیا:

''احمد شناس ہمارے عہد کے ان نامور شعراء میں سے ہیں، جنھیں نہ صرف حرف ولفظ کی معنویت کا احساس ہے، بلکہ وہ احترام حرف ولفظ کو تہذیب کے لئے اور شعرو سخن کی تطہیر کے لئے ناگزیر جانتے ہیں۔

احمد شناس کی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان کا شعر عصری حسیت سے معمور ہے تاہم ان کا غم زندگی کی قوت نمو بن کر ہجر ووصال کی لذتوں سے آمیز ہوکر شعریت کو نئے افق بخشتا ہے۔

میں احمد شناس کی شاعری کا اس لئے بھی مداح ہوں کہ ان کے اشعار میں طہارتِ حیات اور پاکیزگی نفس کی خوشگوار فضا موجود ہے۔''

(پروفیسر مختار شمیم)

مشہور ڈرامہ نگار اور صحافی رشید انجم - معاون مدیر 'صدائے اردو' بھوپال نے احمد شناس کے شعری مجموعہ 'صلصال' پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا :

''اردو شاعری کا تعلق فرد یعنی شاعر کے افکار، محسوسات، مزاج اور بصیرت افروز

خیالات سے ہوتا ہے۔نظریۂ حیات کی ترجمانی کا ایک فن فنِ شاعری بھی ہے۔

'صلصال' قرآن حکیم کی سورہ رحمٰن کی جس آیت کے ترجمے سے ماخوذ ہے، اس مجموعہ کلام کو اگر مذکورہ سطور کے تناظر میں دیکھا اور پرکھا جائے، تو یقیناً احمد شناس کی شاعری میں ندرتِ خیال بھی ہے اور وسعت بیان بھی۔احمد شناس کی شاعری کو صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔اس کو ہمیشہ قاری اپنے زیر مطالعہ رکھے اور ان کے اشعار کو اپنے لاشعور میں اس طرح جذب کرلے کہ کوشش کے باوجود بھی ان اشعار کو محو نہ کیا جاسکے ۔احمد شناس کے مجموعہ کلام 'صلصال' کی بیشتر شاعری انہیں محسوسات کی غماز ہے۔''

(رشید انجم سیکریٹری اقبال لائبریری بھوپال (ایم۔پی۔)

رشید انجم کے بعد اظہار خیال کرتے ہوئے مشہور شاعر اور ادیب ضیاء فاروقی صاحب نے کہا۔

''اردو کی شعری روایات میں ادھر تیس چالیس سال کے عرصہ میں جو سرمایہ سخن ہمارے مطالعہ میں آرہا ہے۔اسے نہ تو کسی ازم کی عینک سے دیکھا نہ کسی تحریک کے خانے میں رکھا جاسکتا ہے کہ ادھر گلوبلائزیشن کے طفیل اب حیات انسانی کسی مسئلے کو علاقائی یا جغرافیائی حدود میں دیکھنا ممکن نہیں ہے۔اسپین کا مسئلہ ہو ایران، عراق، شام کی صورت حال یا پھر خود اپنے ملک کے ٹوٹتے بکھرتے اور ہنستے سنورتے سماجی، معاشی یا سیاسی مسائل ہوں، سب کا اثر بہر حال ادب پر بھی پڑتا ہے۔

احمد شناس کشمیر کی اس فضا میں سانسیں لے رہے ہیں جہاں کی فضائیں کافی عرصہ سے گرد آلود ہیں۔اس لئے ان کی شاعری پر اس کا اثر بہر حال نظر آتا ہے اور اسی طرح کے شعر ان کے حافظہ سے باہر آتے ہیں۔

میں نے بھی بچوں کو اپنی نسبت سے آزاد کیا
وہ بھی اپنے ہاتھوں سے انسان بنانا بھول گیا

احمد شناس کے یہاں غم دنیا بھی ہے اور غم عقبیٰ بھی۔علامتوں اور استعاروں کے حوالے سے انھوں نے جو شعری پیکر تراشے ہیں وہاں خود کلامی بھی ہے اور معاشرے سے احتجاج بھی۔یہ شعر دیکھئے۔

ہر رنگ بے قرار ہوں ہر نقش ناتمام
مٹی کا درد ہوں کہ ستاروں کا پیار ہوں

نہیں ہے خواب سی تصویر جس کی
تو پھر اس خواب کی تعبیر کیا ہے

یہ دنیا بے خبر لوگوں کی احمد
وہ دنیا کا نہیں جو جانتا ہے

عمر کی فصلیں کاٹ رہا ہے
لمحہ لمحہ مرنے والا

سچ خاموشی کا رکھوالا
جھوٹ تماشہ کرنے والا

یہ اوراس طرح کے بہت سے اشعار یقیناً ہمارے اذہان کو متاثر کرتے ہیں اور ہم 'صلصال' کے مطالعہ پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔''

(ضیافاروقی-بھوپال)

ضیاء فاروقی صاحب کے بعد مشہور شاعر اور صحافی احد پرکاش نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:

''احمد شناس ایک جگہ لکھتے ہیں۔

جہالت روگ تھا جو دل کے اندر
وہی مذہب ہمارا ہوگیا ہے

وہ خدا کے واسطے بولا ہمیشہ
اسلئے مذہب سے خارج ہوگیا ہے

کیا اُن کے یہ اشعار آپ کو بھی پریشان نہیں کرتے؟

اُداسی یہاں چاند کا استعارہ
تبسم ہے مرگ خزانی کی صورت

ان کا فنکارانہ انداز بہت خوبصورت ہے۔ جو پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا

ہے۔انھوں نے سچ ہی کہا ہے ۔

غاروں کا سفر ہے کہ مکمل نہیں ہوتا
میں اپنی خبر آپ ہی ڈھونے کے لئے ہوں

'صلصال' کا غذ کتابت قابل ستائش ہے۔ اِس کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (احد پرکاش-بھوپال)

سیفی سرونجی نے کہا کہ:

''احمد شناس کی شخصیت نے بے حد متاثر کیا، انھوں نے 'صلصال' جیسے خوبصورت شعری مجموعے سے نوازا اور بہت عرصے کے بعد ایک اچھے شاعر کا شعری مجموعہ پڑھنے کو ملا، جس نے شعری مجموعوں کی بھیڑ میں خود کو پڑھوانے پر مجبور کر دیا۔ مجھے ان کی غزلوں سے زیادہ نظموں نے متاثر کیا ہے کہ ان میں زندگی کی تلخ سچائیاں اور ایک گہری معنویت نمایاں ہے۔'' (سیفی سرونجی)

سیفی سرونجی کے بعد نئی نسل کے نقاد محمد متین ندوی نے احمد شناس کے شعری مجموعے 'صلصال' پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:

''شاعری ایک خداداد ملکہ ہے، مطالعہ، مشاہدہ، تجربات اور مشق کی بنیاد پر اس میں نکھار آتا ہے۔ شاعر کی فکر اور اس کی سوچ بھی شاعری میں موجود ہوتی ہے۔ احمد شناس ایک ایسے منفرد شاعر ہیں، جن کی شاعری، پڑھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ ان کا شعری مجموعہ 'صلصال' شعری سرمایہ میں ایک خوشگوار اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ اس میں موجود غزلوں ہی نہیں بلکہ نظموں میں بھی انفرادیت اور قوتِ تاثیر موجود ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ احمد شناس عصر حاضر کے ایک باکمال شاعر ہیں جنھیں شعر گوئی پر قدرت حاصل ہے۔''

محمود ملک صاحب نے یوں اظہار خیال کیا:

''احمد شناس نئی غزل کا ایک معتبر نام ہے۔ میں نے ان کی غزلیں اکثر رسائل میں پڑھی ہیں۔ ان کے ہاں ایک گہری فکر ہے، جو قاری کو دعوت فکر دیتی ہے اور متاثر بھی کرتی ہے۔ 'صلصال' میں شامل غزلیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور قاری کو کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ مجھے کوئی شاعر متاثر کرے اور میں اس کے شعروں کا ذکر کروں۔ میں نے ان کے کئی شعر اپنی ڈائری میں نوٹ کئے ہیں، جنھیں میں اکثر موقع بہ موقع دوستوں کو سناتا رہتا ہوں۔ خاص طور سے یہ شعر۔

بس اک جہان تحیر سے آنے والا
وہ اجنبی مجھے اپنا بنانے والا
سمیٹوں گا خود کو کسی داستاں میں
بکھر جاؤں گا پھر نشانی کی صورت

(محمود ملک-بھوپال)

ڈاکٹر صادق علی نے کہا:

''احمد شناس کا شعری مجموعہ 'صلصال' اپنے آپ میں ایک فکر کا حامل ہے۔ جس میں ماضی، حال، مستقبل، سبھی کچھ شامل ہے۔ جہاں درد ہے وہاں پر مسکرانے کی ادا بھی احمد شناس کی شاعری میں موجود ہے۔

میں پیاسا ہوں پرانے موسموں کی طرح
مگر اب وہ زمانہ جاچکا ہے

احمد شناس کے اس شعر میں شدت احساس اپنے عروج پر ہے، یوں لگتا ہے ان کا درد قاری کا درد ہوگیا ہے۔ جب درد میں رشتوں کے دھاگے جڑ جاتے ہیں تو ایک نئی فکر جنم لیتی ہے۔ ان کا شعری مجموعہ 'صلصال' پڑھنے کے بعد میرے ذہن کے دریچے کھل گئے۔'' (ڈاکٹر صادق علی-لیکچرر گرلس ہائر سیکنڈری سرونج)

ڈاکٹر آصف سعید نے احمد شناس کے شعر مجموعے 'صلصال' پر اظہار کرتے ہوئے کہا:

''صلصال' احمد شناس کا وہ شعری مجموعہ ہے، جس کے حوالے سے وہ اپنے اندر کے فکری اضطراب کو ظاہر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

'صلصال' کے اوراق ان کی غزلوں، نظموں کے ذریعہ ان کے نجی جذبات ومحسوسات کی لسانی اور شعری تشکیل کی بھرپور گواہی دیتے ہیں۔ ان کے اندر کا شاعر خدشکن کے بجائے خود پرستی پر اعتماد کا قائل ہے۔ جس کی تصدیق ان کے ذیل اشعار سے کی جاسکتی ہے۔

میں نے خود جسم تراشا اپنا
اس نے جنگل میں اتارا تھا مجھے
میں خوابوں کے محل بنانے والا
وہ میری دیوار گرائے کیا کیا

ترے قلم نے فقط ایک نام لکھا تھا
مرے بیاں نے مجھے ناتمام لکھا تھا

رات بھر احمؔد سرابوں کا سفر
صبح پھر تیار میری کشتیاں ''

(ڈاکٹر آصف سعید خاں- گورنمنٹ ایجوکیشن کالج بھوپال)

ڈاکٹر آصف سعید کے بعد سدبھاؤنا منچ کے صدر انل اگروال نے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا:

''احمد شناس صاحب سے کشمیر میں ایک ہفتے تک ملاقات رہی، ساتھ بھی رہا، ان سے گفتگو بھی ہوئی، انہیں مشاعرے میں سنا بھی، واقعی ان کی شخصیت ایک منفرد شخصیت ہے۔ حال ہی میں انہیں یوپی اردو اکیڈمی سے انعام ملا ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر ہی نہیں ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ انہیں صلصال پر مبارکباد تو کشمیر میں ہی دے چکا ہوں لیکن اس مباحثہ کے دوران ان کے شعروں نے متاثر کیا۔''

(انل اگروال-صدر سدبھاؤنا منچ سرونج)

آفاق سیفی جو انتساب کے مدیر تو ہیں ہی، ابھی حال ہی میں انھوں نے 'سچ کا راجا' کے نام سے ایک ہفتہ واری اخبار ہندی میں بھی نکالنا شروع کر دیا ہے۔ انھوں نے احمد شناس کے شعری مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:

''کشمیر میں احمد شناس صاحب سے مل کر جو خوشی ہوئی، وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ان کے اخلاق اور شخصیت نے مجھے ہی نہیں سب کو متاثر کیا ہے۔ انہیں مشاعرے میں بھی سنا اور ان کے ساتھ ایک ہفتے تک رہے، ان سے گفتگو کر کے مجھے بہت کچھ حاصل ہوا اور جب ان کی کتاب صلصال پڑھی تو واقعی دل کو چھو گئی کہ اس میں میری پسند کے ایسے شعر ملے، جنھیں پڑھ کر مجھ میں ترقی کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، یوپی اردو اکیڈمی سے انعام یافتہ یہ مجموعہ 'صلصال' دیگر مجموعوں سے بہت مختلف ہے۔''

(آفاق سیفی-ایڈیٹر انتساب سرونج)

☆☆☆

پروفیسر قدوس جاوید

احمد شناس 'صلصال' اور بصیرتوں کا چراغاں

زبان کی گیلی مٹی کا ایسا تخلیقی برتاؤ لفظ لفظ وجود کے صلصال ہونے کی گواہی دے شاعر سے 'پس وپیش آشکار' آدم خاکی کے حدود وامکانات کا پورا شعور چاہتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ شاعر-عمدہ شاعری جب ظہور پذیر ہوتی ہے تو صرف اور محض شاعری نہیں ہوتی، شاعری سے ماورا بھی بہت کچھ ہوتی ہے۔ اس 'بہت کچھ' سے ہی شاعر اور اس کی شاعری کی آواز کا انفراد و امتیاز قائم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے احمد شناس کے تازہ ترین شعری مجموعہ 'صلصال' کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ احمد شناس کی شاعری -شاعری ہونے کے ساتھ ساتھ ''صلصال وجود'' کی معنویت کی جستجو سے بھی عبارت ہے۔

دراصل اس جہان رنگ و بو میں انسانی وجود ایک 'صلصال' کا ہی حکم رکھتا ہے۔ انسان کے افکار و اعمال کی صداؤں میں ہی اس کائنات کی ترنم ریزی، آشفتہ سری اور مسئلہ خیزی کے تمام اسرار مضمر ہیں بلکہ دیکھا جائے تو انسان اپنی سرشت میں ایک 'صلصال' ہی ہے۔ کتاب الفرقان میں درج ہے: خلق الانسانَ مِن 'صَلْصَالٍ کاالفَخّار (اللہ نے انسان کو بنایا بجتی مٹی سے)۔

(پارہ ۲۷-سورہ رحمٰن، آیت ۱۴)

عرفان وادراک کی یہی وہ منزل ہے، جس نے احمد شناس کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ

زمین کے اظہار رنگ و بو میں شرار مٹی کا بولتا ہے

نگار وحرف ونوا کی صورت خمار مٹی کا بولتا ہے
اسی کی چاہت اس کی حسرت پروں سے لپٹی ہوئی ہے میرے
اڑان بھرنے لگوں تو گردو غبار مٹی کا بولتا ہے

'صلصال' احمد شناس کے اولین شعری مجموعہ 'پس آشکار' کی شعری ولسانی توسیع ہے فرق یہ ہے کہ پس آشکار میں شاعر سلوک کے پہلے حیرت واستعجاب تک پہنچ کر وجود آدم خاکی کی بے بضاعتی، خالی پن اور صفریت پر اصرار کرتا نظر آتا ہے۔

پس خیال ہوں کتنا ، ظہور ہوں کتنا
خبر نہیں کہ ابھی خود سے دور ہوں کتنا

ریزہ ریزہ اعتبار جسم وجاں ہوجائے گا
ایک دن یہ واقعہ وہم وگماں ہوجائے گا

سنا تھا تجھ سے اپنا نام تو 'شہکار' میں نے
'زمیں کا بوجھ' لکھا خود کو آخر کار میں نے

لیکن جذبہ جستجو کی جڑی ایمانی وایقانی شعور میں پیوست ہوں تو سالک، وجود حقیقی کے عرفان وادراک کی جانب جیسے جیسے قدم آگے بڑھاتا ہے، اس پر اپنے وجود خاکی کے اسرار بھی کھلتے جاتے ہیں۔ احمد شناس 'پس آشکار' میں ہی اس مرحلہ شوق کے قریب چہل قدمی کرتے نظر آتے ہیں۔

کسی کو حامل 'اقرء' قرار دیتا ہے
کسی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے

جہاں جہاں میرا وہم وگماں نہیں جاتا
وہاں وہاں سے وہ سورج نکال دیتا ہے

'صلصال' میں شاعر اس 'بیکراں ذات' سے وابستگی کو ہی اپنے وجود کے عرفان کا وسیلہ بنانے پر اصرار کرتا نظر آتا ہے۔

کچھ تو میرے وجود کا حصہ ہے تیرے پاس
ورنہ میں اپنے آپ میں کیوں انتظار ہوں

خود کو پایا تھا ، نہ کھویا میں نے
بیکراں ذات کنارا تھا مجھے

یقین دشت سے پھوٹے گا آبجو کی طرح
کہ حرف لا کی گواہی بحال کر دیکھو

کیسے کھڑا ہوں کس کے سہارے کھڑا ہوں میں
اپنا یقین ہوں کہ تیرا اعتبار ہوں

شب وروز نخل وجود کو نیا ، ایک برگِ انا دیا
ہمیں انحراف کا حوصلہ بھی دیا تو مثل دعا دیا

'صلصال' احمد شناس کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ غزلیں زیادہ ہیں، نظمیں چند ایک ہیں لیکن انتخاب 'صلصال' کی غزلیں، سادہ اور لطیف روحانیت اور پر آشوب عصری سماجی ثقافتی صورت حال کے حوالے سے انسان کو سیاسی انتشار، مذہب کی جاہلانہ توضیح، ایمانی وایقانی زوال اور وجودی بحران کے جبر سے نبرد آزما ہونے کا شعور جگاتی ہیں۔ 'جزو' کے 'کل' کے ساتھ نادیدہ لیکن ناگزیر رشتوں سے منور احمد شناس کی غزلیں، غزل کی شعریات میں سنجیدہ اور تقدس مآب زاویوں کا اضافہ کرتی ہیں۔ کیونکہ ان غزلوں سے 'شعور جسم' (Body consciousness) کی صدائیں آتی ہیں۔ حکایات آدم کے نقطہ آغاز میں ہی جب آدم اور حوا کا شعور جسم بیدار ہوا تھا۔ تو اس کا نتیجہ ہبوط آدم (یعنی آسمانوں سے آدم اور حوا کے اخراج کی صورت میں سامنے آیا تھا) تب سے انسان زمین پر اپنے وجود کی معنویت کی جستجو میں سرگرداں ہے۔ آج بھی انسان جسم کے تقاضوں کا اسیر ہے اور کچھ اس شدت کے ساتھ کہ پورا معاشرہ جیسے 'گوشت کے سمندر' میں تبدیل ہوا گیا ہو۔ جہاں صرف جسم ہی جسم اور جسم کے تقاضوں کی بے لگام اندھی لہریں ہیں۔ لیکن زندگی کے ضابطے ایمانی واخلاقی قدروں کی شمعوں سے روشن ہوں تو اس بیداری جسم کا احساس واظہار بھی تعمیری صورت میں سامنے آتا ہے۔

محبتوں کو کہیں اور پال کر دیکھو
متاع جاں کو بدن سے نکال کر دیکھو

بدل کے دیکھو کبھی نسبتوں کی دنیا کو
بدن کو روح کے خانے میں ڈال کر دیکھو

جسم کے سارے تقاضے ہیں ادھورے احمدؔ
یہ تصور کبھی بھر پور نہیں ہوسکتا

بدن کی پیاس بھی اک ماورا کہانی ہے
ہر ایک بوند کو دریا خیال کر دیکھو

اور پھر جسم و جاں کی حقیقت اور حیثیت کا اظہار کچھ اس انداز میں ہوا ہے۔

ہر بار یہ شیشے کا بدن ٹوٹ گیا ہے
ہر بار نئے ایک کھلونے کے لئے ہوں

ہر ایک جسم یہاں روح کی علامت ہے
یہ ریگزار بھی نغمہ سنانے والا ہے

جسم بھوکا ہے تو ہے روح بھی پیاسی میری
کام ایسا ہے کہ دن رات کا کارندہ ہوں

اگر دیکھا جائے تو احمد شناس کی اس نوع کی شاعری، انسان، انسانی معاشرہ اور ایمان وایقان کی کی حرارتوں کے ساتھ ساتھ جسم کی بلوغت بانگتگی سے بے نیاز 'شعور روح' کے دروازے پر دستک دیتی شاعری ہے، جو اپنی انتہائی فنی و جمالیاتی وحدت کی صورت میں تصوف کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔

'صلصال' کی غزلیہ شاعری، ذات، زمیں، زمانہ اور خالق زمان ومکان کے ایک وحدت میں ڈھل کر مادی اور روحانی بصیرتوں کا چراغاں کرنے والی شاعری ہے۔ اور یہی 'صلصال' کی غزلیہ شاعری کی شناخت، انفراد و امتیاز ہے۔ احمد شناس کی غزلوں میں غزل کی شعریات کا احترام بھی ہے اور التزام بھی لیکن وہ اظہار بیان کی کلاسیکی رسومیات کے برتاؤ سے انحراف بھی کرتے ہیں اور اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جدید غزل کی شعریات سے انحراف کا یہ عمل احمد شناس کے پہلے شعری مجموعے

قتل کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شاعر اور اس کی رومان انگیز شاعری، جس میں درد جاناں کے ساتھ درد جہاں کے مسائل اور وطن سے محبت کے جذبات بھرے تھے، صرف نام ونمود کا ہلکا سا نقش بن کر رہ گئی۔ اختر شیرانی کے ساتھ نہ ان کی عمر نے وفا کی اور نہ اردو تنقید نے وفا کی۔ اختر شیرانی کا انتقال ۴۳ رسال کی عمر میں ہوا اور آج ان کے انتقال کے ساٹھ سال بعد بھی کوئی ایسا کام جوان کے فن کے شایان شان ہو، سامنے نہیں آیا۔'' (ص: ۱۴۷)

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے جن تلخ حقائق کو بیان کیا ہے، یوں دراصل انھوں نے اردو تنقید کے متعصبانہ رویہ کو آئینہ دکھایا ہے لیکن میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اختر شیرانی کی شخصیت اور فن کے موضوع پر ۶۱-۱۹۶۰ء میں جناب یونس حسنی نے بھوپال میں پروفیسر ابومحمد سحر کی نگرانی میں داد تحقیق دی تھی۔ اس مقالہ پر وکرم یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی اور بعد میں یہی مقالہ انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیا تھا۔ خود یونس حسنی صاحب بھی کراچی منتقل ہو گئے تھے اور وہیں بحیثیت پروفیسر وصدر شعبہ اردو کراچی یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے۔ اختر شیرانی کے سلسلہ میں اس اجمال کی تفصیل ''سوادحرف'' میں پیش کر چکا ہوں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے متذکرہ مضمون میں اختر وفیض کی جن مشترکہ اقدار کو دریافت کیا ہے، ان میں سے کچھ اس طرح ہیں۔

(۱) اختر وفیض کسی کے مقلد نہیں تھے۔ (یعنی تخلیقیت سے سرشار تھے اور بقول مصنف ''یہ تخلیقی عمل کا نیا روپ تھا۔''

(۲) دونوں شاعروں کا اسلوب دلنواز ہے، دل ربائی سے خالی نہیں۔

(۳) خارجی واردات کو قلبی واردات بنا کر پیش کیا اور اعلیٰ جذبات کی فراوانی کا مظاہر کیا۔ یہاں تک کہ ان کے یہاں معنی آفرینی کے جوہر بھی خوب ہیں۔

(۴) دونوں شاعروں کے یہاں زندگی کے اقدار موجود ہیں، جمالیاتی قدر نے عالمی جنگوں کے تناظر میں ایک نئی حسیت پیدا کی اور ان کی آزادی کو بالاتر مقام دیا۔

(۵) زندگی کی ترجمانی میں یقیناً انقلابی صورتیں بھی پیدا ہوئیں۔

(۶) وطن اور دیار وطن کی ہر چیز سے محبت کا احساس جاگا ہے۔

اختر وفیض کے کلام میں دونوں شاعروں کے مابین مشترکہ اقدار تلاش کرتے ہوئے ڈاکٹر سید تقی عابدی اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ:

'پس آشکار' (۲۰۱۰ء) میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس وقت تک سوئیر، دریدا، رولاں بارتھ، رومن جیکب سن، بانتیں، لیوی اسٹراس اور لیوتار کے لسانی وادبی نظریات کے زیر اثر مابعد جدیدیت کا ارتقا ہونے لگا تھا اور ادب کی ساجیت کے ساتھ ساتھ ادب کے ثقافتی کردار کی اہمیت بھی بڑھنے لگی تھی برصغیر کی جدید زبانوں میں اردو نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جدید ادبی تھیوری کے اثرات قبول کئے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بیسویں صدی کی آخری اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک آتے آتے غزل کی شعریات کی تشکیل جدید کا عمل بھی شروع ہو جاتا ہے۔ جس کے آثار ناصر کاظمی، شجاع خاور، باقی، پروین کمار اشک، ظفر اقبال اور حکیم منظور احمد وغیرہ کے یہاں نمایاں ہو چکے تھے لیکن جن نئے شاعروں نے اس عمل کو رفتار اور معیار عطا کی ان میں عرفان صدیقی، اسعد بدایونی، رفیق راز اور شفق سوپوری وغیرہ کے ساتھ ساتھ احمد شناس کا بھی ایک اہم کردار رہا ہے۔

خود فراموشی کے جنگل سے اٹھے گی
آگہی بھی صبح صادق کی ہوا ہے

اب نغموں کے دیپک کون جلائے گا
اب بنجارے پکے گھر میں رہتے ہیں

باہر انسانوں سے نفرت ہے لیکن
گھر میں ڈھیروں بچے پیدا کرتے ہیں

ہے واہموں کا تماشا یہاں وہاں دیکھو
ہمارے پاس مکمل خدا کہاں دیکھو

پھٹا ہوا کسی عریاں سوال جیسا ہے
ہمارے سر پہ یہ رحمت کا سائباں دیکھو

احمد شناس کے یہاں ایسے ڈھیروں غزلیہ اشعار ملتے ہیں، جنھیں مابعد شاعری کے عمدہ نمونے کہہ سکتے ہیں۔ ان اشعار میں احمد شناس نے مابعد جدید معاصر سماجی ثقافتی، معاشی وسیاسی ڈسکورس کے حوالے سے اپنے تجربات ومشاہدات اور کیفیات وتاثرات کی لسانی تشکیل کی ہے۔ احمد

شناس نے تازہ کار مترنم اور معنی خیز الفاظ وتراکیب، تشبیہات واستعارات کے برتاؤ میں ایسی فن کارانہ مہارت کا مظاہرہ کیا ہے کہ ان کی غزلوں کے اکثر وبیشتر اشعار ذہن وضمیر میں فوراً اتر جاتے ہیں اور عام طور پر غزل کے وہی اشعار کامیاب تصور کئے جاتے ہیں، جو پڑھنے یا سننے کے بعد قاری یا سامع کی یادداشت کا حصہ بن جائیں۔ احمد شناس کے یہاں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں مثلاً

نوجوانوں کا قبیلہ اس کے پیچھے چل پڑا
جرم کر کے بھاگنے والا مثالی ہوگیا

ایک بچہ ذہن سے پیسہ کمانے کی مشین
دوسرا کمزور تھا سو ، یرغمالی ہوگیا

پلٹ کے آئیں گے ساون کے رنگ آنکھوں میں
تم اپنے آپ سے رشتہ بحال کر دیکھو

یہ دنیا ایک لمحے کا تماشہ
نہ جانے دوسرا لمحہ کدھر ہے

نام اپنا کسی دیوار پر لکھ کر احمد
میں سمجھتا ہوں ہمیشہ کے لئے کندہ ہوں

میں خود اپنے آپ سے ہوں بیگانہ سا
بستی کے انسان بھی میرے جیسے ہیں

مذہب ہر انسان کی فطرت کا حصہ ہے مگر مذہبی رویہ ہر انسان کا دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ رویوں کا تعلق فرد کے فہم وشعور سے ہوا کرتا ہے۔ مذہب کے ساتھ جذباتی وابستگی ایک چیز ہے۔ مگر جب ہم جذبات سے اوپر اٹھ کر اسے اپنے شعور کا حصہ بناتے ہیں تو پھر مذہب کی غرض وغایت اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت بھی سمجھ میں آنے لگتی ہے۔

'صلصال' کا شاعر شعوری سطح پر خود کو مذہب کے ساتھ Relate کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

وہ مذہب کے اس ڈھانچے یا اس کے Form کے حوالے سے نہیں بلکہ اس کی اصل یعنی اس کی روح کی حوالے سے دریافت کرتا ہے۔ اس لئے اس کے اشعار میں محدود سے لامحدود کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ وہ مذہب کے اندر معنوی اقدار کے فقدان کا گہرا احساس رکھتا ہے۔ اس کے اشعار میں اس کا روحانی کرب صاف جھلکتا ہے۔ شدت احساس کی وجہ سے اکثر اس کا بیان تلخی آمیز ہو جاتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

وہ اذانِ ذات کا اللہ اکبر
اب کسی مسجد کا چھوٹا سا خدا ہے

جہالت روگ تھا جو دل کے اندر
وہی مذہب ہمارا ہوگیا ہے

میری سانسوں میں کہاں ہے ورنہ وہ خوشبوئے جاں
ساری تقریریں ہیں محفل کی حرارت کے لئے

وہ خدا کے واسطے بولا ہمیشہ
اس لئے مذہب سے خارج ہوگیا ہے

احمد شناس کو معلوم ہے کہ غزل کی شعریات کو نئے رنگ میں برتنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ غزل کی سابقہ شعریات کو یکسر رد کر دیا جائے کیونکہ سابقہ بنیادوں پر ہی نئے معیار کی مضبوط و مستحکم تعمیر ہوتی ہے۔ احمد شناس بھی اپنے کئی دہائیوں پر محیط تخلیقی عمل اور مطالعہ و مشاہدہ کی بنا پر یہ جانتے ہیں کہ معاشرتی اور ثقافتی لیل و نہار کے باعث ہر زبان اور صنف کی شعریات کے سابقہ معائر، جدید ترین معائر کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات سابقہ معائر اقدار کی باز آفرینی بھی کوئی نئی بات نہیں۔ مثال کے طور پر آج اردو غزل کی شعریات صد فی صد وہ نہیں ہے، جو فیض احمد فیض، حسرت، مجاز اور جذبی کے زمانے کی شعریات تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے فیض، منیر نیازی اور ان کے معاصرین کی شعریات بھی وہ نہیں تھی، جو اقبال، شاد عظیم آبادی اور فراق وغیرہ کے زمانے کی شعریات تھی۔ اسی طرح ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی وغیرہ کے یہاں میر و سودا کے عہد کی اردو غزل کی شعریات کی باز آفرینی کے چرچے بھی عام رہے ہیں۔ بہر حال 'پس آشکار' اور 'صلصال' کی

غزلیں بھی بحیثیت مجموعی غزل کی نئی شعریات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی نظر آتی ہیں۔اس اختصاص کے ساتھ کہ احمد شناس کی شاعری میں روحانیت یا تصوف کے عناصر کہیں ایمانی وایقانی جذبات کے ساتھ سامنے آتے ہیں تو کہیں عقیدت مندی اور قلبی نسبتوں کے ساتھ۔

اللہ والا ایک قبیلہ میری نسبت
اور میں اپنے نام ، نسب سے ناواقف ہوں

نسبتوں کے بے ثمر جنگل میں سرگرداں ہوں میں
نام احمد رکھ لیا حسنِ سماعت کے لئے

میں نے بھی بچوں کو اپنی نسبت سے آزاد کیا
وہ بھی اپنے ہاتھوں سے انسان بنانا بھول گیا

اگر دیکھا جائے تو اپنی زمین ، ماحول ، اقدار وعقائد اور ایمان وایقان سے نسبت احمد شناس کے تخلیقی عمل کا بنیادی محرک ہے۔اس نسبت کا اظہار 'صلصال' میں شامل نظموں ، ہمارے بچے ، وادی غیر ذی ذرع ، حج ۲۰۱۰ء ، مولانا وحید الدین خان اور خصوصاً ماں اور کتاب میں تو ہوا ہی ہے لیکن یہ نسبتیں مشرقی ، ثقافتی ، روحانی اور صوفیانہ اقدار سے شدید قلبی وابستگی کی عمدہ مثالیں بھی ہیں۔

کشمیر کے مخصوص حالات کے تناظر میں لکھی گئی نظم ہمارے بچے ، اپنی زمین اپنی قوم ، سے احمد شناس کی نسبت کی بڑی سچی زندہ اور متحرک عکاسی کرتی ہے۔

خداوندا وہ خوشبو کے امانت دار بچے
چمن سے منحرف ہیں پھول سے بیزار بچے
دعا کی روشنی آنکھوں میں نہ رشتوں کی شبنم
کہ پھولوں کی جگہ ہیں سنگ کی بوچھار بچے

نظم 'حضرت ابراہیم کی وادی غیر ذی ذرع کے نام' کی پوری فضا اساطیری ہے۔کلیدی استعارہ 'خوشبو' کے حوالے سے احمد شناس نے اسلام اور امت مسلمہ کے عروج وزوال کے اسرار کی جانب بڑے ہی بلیغ اشارے کئے ہیں۔ساربان ، غار ، بیابان ، بجارہ ، شہنشاہ ، فقیر ، وادی ، پھول ، دوسری دنیا جیسے استعاروں اور علامتوں کی مدد سے اس نظم میں اسلامی تاریخ کے ابتدائی باب کی خوشبو کو آج کے تناظر میں محسوس کرنے اور کروانے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔

ہندوستان کی عصری اسلامی تاریخ میں مولانا وحیدالدین خاں ایک بہت ہی محترم نام ہے ، عالم انسانیت کو ایک وحدت کے سانچے میں ڈھالنا ان کا مشن ہے۔ جس پر وہ بڑی دلجمعی کے ساتھ کئی دہائیوں سے کاربند ہیں ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں دنیا کے بیشتر ممالک کے سنجیدہ سیکولر اور باشعور افراد عصر حاضر کے اس عظیم مسلم دانشور مولانا وحیدالدین خاں کے عقیدت مندوں میں شامل ہیں ۔ احمد شناس بھی ان میں سے ایک ہیں ۔ مولانا سے متعلق احمد شناس کا منظوم خراج عقیدت ، مولانا وحیدالدین خاں کی ہمہ جہت دانشورانہ شخصیت اور کارناموں کی بڑی سچی مرقع کشی کی ہے، ایک دو اشعار سے ہی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تو نوع آدم کو ایک وحدت سے جوڑتا ہے
خدا سے انسان کا رابطہ ہے شعور تیرا
ہمیں دکھاتا ہے دھند کے اس طرف کا منظر
طلوع ایماں کا واقعہ ہے شعور تیرا
رکے ہوئے قافلے کی تحریک بن گیا ہے
کہ حق کی دعوت کا واقعہ ہے شعور تیرا
یہ فکر کل کی امید بن کے کھلے گا احمد
کہ آج کی فہم سے بڑا ہے شعور تیرا

مذکورہ نظم کے تمام اشعار میں سچائیوں کی خوشبو ہے۔

اب اگر 'صلصال' کی قرأت کے اگلے مرحلے کی طرف قدم بڑھائیں تو اندازہ ہوگا کہ احمد شناس کی نظم 'ماں اور کتاب' غالباً مولانا وحیدالدین خاں کی فکر اور دین و دنیا کے شعور کے بحر بیکراں کی آبجو ہے۔ جس میں آدم کائنات، اور مظاہر قدرت کی تخلیق اور فنا اور بقا سے متعلق کتاب الفرقان اور ختم الرسل کے ارشادات اور انکشاف کو ماں کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ماں آدم کی جسمانی تخلیق اور کتاب ذہنی و روحانی تعمیر و تطہیر کا استعارہ ہے۔ رب العالمین نے کتاب الفرقان میں حرف حرف وجود آدم، کائنات اور مظاہر قدرت کے جو اسرار بیان کئے ہیں ۔ انھیں رسول پاک کے حوالے سے ماں ہی منکشف کرتی ہے۔ اسم اعظم کا امین، آدم، خدا کی سونپی ہوئی اس امانت کو بھول سا گیا ہے۔ حالانکہ خدا نے آدم پر کائنات کے سارے اسرار کے دروازے کھول رکھے ہیں ۔ کیونکہ خدا نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِی اَحْسَنِ تَقْوِیْم ۔ (بے شک ہم نے آدمی کو اچھی صورت بنایا

)(پارہ ۳۰،سورہ والتین)

احمد شناس نے اس نظم میں 'ماں اور کتاب' کا نہایت خوبصورت اور دلآویز موازنہ پیش کیا ہے۔اس طویل نظم کے جو مختلف ٹکڑے ہیں، وہ دراصل وجود سے عدم تک پھیلی ہوئی انسانی زندگی کے مختلف مراحل اور تاریخ کے مختلف ادوار ہیں۔

انسان کے علاوہ دوسری مخلوق کی دنیا میں ماں کا ایک متعین کردار ہوتا ہے۔مگر انسانی دنیا کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ یہاں ماں جنم داتا کے علاوہ ایک مفکر، مدبر، معلم اور معمار کا کردار بھی ادا کرتی ہے، جس طرح آسمانی کتابیں انسان کو یہ شعور عطا کرتی ہیں کہ زندگی فنا سے بقا کی طرف سفر کر رہی ہے۔اس لئے انسان کی کامیابی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ بقائے حیات کے لئے جدوجہد کرتا رہے، اس طرح ماں بھی اپنی تمام تر محبت، دانائی اور حکمت کام میں لاتے ہوئے بچوں کو دیدہ ونادیدہ جہانوں کے سفر کے لئے تیار کرتی رہتی ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت سے جاری ہے، جب سے آدم نے اس دنیا میں آنکھ کھولی ہے۔نظم کا یہ حصہ دیکھئے۔

روزِ اول سے کلام اس کا تھا
الفاظ میں پوشیدہ معانی کی طرح
جب نہ جلتے تھے ابھی
ظلمت میں کتابوں کے چراغ
خود جلا کرتی تھی ماں
بچوں کی بصیرت کے لئے
ایک کہانی کی طرح

عمر رواں کے عروج یعنی شباب کا زمانہ واقعی کڑی آزمائش کا زمانہ ہوتا ہے۔ جب بچہ عہد جوانی میں قدم رکھتا ہے تو ماں جانتی ہے کہ یہ منہ زور امنگوں اور آرزوؤں کا زمانہ ہے۔ وہ فکرمند ہوجاتی ہے کہ تندی ہوا کہیں بچے کو بکھیر کر نہ رکھ دے۔اس لئے اسے مختلف مذہبی یا تاریخی کرداروں کے حوالے سے بتاتی ہے کہ اسے اپنی عزت وناموس کی حفاظت کس طرح کرنی چاہئے۔نظم کا یہ حصہ دیکھئے کتنی خوبصورتی سے جوانی کے ایام کی تصویر کشی کرتے ہوئے حضرت یوسفؑ کی حیاداری کے قصے کی یاد دلاتا ہے۔

دیکھنا تیرے رگ وپے میں طلوع ہونگے
نئی دھوپ کے چاند

ایک دن
تیری سماعت پہ ابھر آئیں گے
تصویر کے خاموش سرود

.....

جب امنگوں سے شرابور گھٹا چھائے گی
حسن چہروں کا دل و جان سے بھائے گا تجھے
پھر زلیخاؤں کی ہر سازش سے
تیرے اندر کا حیادار
وہ یوسف ہی بچائے گا تجھے

ماں کی نظر میں زندگی کوئی سپاٹ قسم کا معاملہ نہیں بلکہ پیچیدہ اور پراسرار راستوں کا سفر ہے ۔ جب بچہ زندگی کے سفر پر روانہ ہوتا ہے یا عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو ماں اسے ایک مفکر اور مدبر کی طرح رموز حیات سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ نظم کا یہ بند دیکھئے۔

صبح تخلیق سے اظہار کا تشنہ ہے جہاں
ایک سورج ہے نظر میں
تو ہزاروں ہیں نہاں
تیرے سینے میں ہے پیوست
سوالوں کی کسک
پیڑ چھوٹا ہے
تو سایہ ہے افق تا بہ افق
یہاں قطرے میں ہے دریا
تو ہمالہ ہے کسی رائی میں
کھا کے ٹھوکر نہ تو گر جانا کہیں کھائی میں

نظم کا زیادہ تر حصہ ماں کا بچے کے ساتھ مکالمہ کی شکل میں ہے۔ مگر یہ کوئی عام قسم کا مکالمہ نہیں بلکہ اس کے اندر ایک روحانی تپش اور فکری اضطراب پایا جاتا ہے۔ نظم کا سارا ماحول عرفان وآگہی کے ستاروں سے جگمگا رہا ہے اور یہ اس لئے ہے کیونکہ ماں کے علم وآگہی کا سرچشمہ ایک آسمانی کتاب کے اندر سے پھوٹتا چلا جاتا ہے۔ ماں بچے کو آہستہ آہستہ دنیاوی زندگی کے رطب و یابس سے

گزارتی ہوئی ایک اور بہت بڑی خبر کی طرف لے جاتی ہے یعنی موجودہ دنیا کے اندر سے ایک اور دنیا کے برآمد ہونے کی خبر اور یوم الحساب قائم ہونے کی خبر جس کے بارے میں قرآن انسان سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہو۔ حالانکہ یہ ہمارے لئے یوم موعود ہے اور یہ ہوکر رہے گا۔

دراصل قرآن میں قیامت کے واقع ہونے کا بیان کئی ایک جگہ پر نو بہ نو انداز میں ہوا ہے، اسلوب بیان ایسا کہ دنیا کی کوئی دوسری کتاب اس کی مثال پیش نہیں کرسکتی۔ پڑھتے ہوئے بڑے سے بڑا پہاڑ جیسا انسان بھی خود کو ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ نظم میں شاعر نے اس واقع کا ذکر اپنے انداز میں کیا ہے۔ جو کہ خاصا اثر انگیز ہے۔

نظم کے آخری حصہ میں بچہ اپنی کم مائیگی اور سر برہنگی کو یاد کرتے ہوئے غم اور حیرت کی ملی جلی کیفیت سے دوچار نظر آتا ہے۔ وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ آخر وہ ہستی جو اس کے سر پر رحمتوں کا سایہ بن کر رہی ہے۔ روز محشر اسے بے یار و مددگار کیسے چھوڑ سکتی ہے۔ اس لئے وہ علامتی زبان میں ماں سے مخاطب ہوکر سوال کرتا ہے۔

روح فرسا یہ خبر سن کے
میں اس سوچ میں ہوں
کہ سر برہنہ میں کدھر جاؤں گا
ماں
کیا تیرا سایہ صد برگ
اس روز مرے سر سے اتر جائے گا؟

دراصل یہ سوال اپنے آپ میں بڑا معنی خیز ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سوال کرنے والا یقین کے اس مقام پر ہے جہاں آدمی رحمت خداوندی سے مایوسی کا تصور بھی نہیں کرسکتا ہے۔

اس نظم کا راوی 'ماں' کے سایہ صد برگ کی محافظت میں تو ہے لیکن اسے کتاب الفرقان نے فنا اور بقا کی آگہی بھی بخشی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس دن کا آنا طے ہے، جب کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا اور آرائش موجودہ کا طشت الٹ جائے گا۔ اللہ نے اپنی کتاب میں خود اس کی قسم کھائی ہے: فلا اُقسم بالشفق (تو قسم ہے مجھے شام کے اجالے کی)
والیل وما وسق (اور رات کی اور چیزیں اس میں جمع ہوتی ہیں)
والقمر اذا اتسق (اور چاند کی جب وہ پورا ہوجائے)

لا ترکبن طبقا عن طبق (تم کو ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچنا ہے۔)

احمد شناس نے اس نظم میں اسلام کے عظیم تاریخی اور اساطیری کرداروں حضرت محمد مصطفیٰؐ، حضرت خلیل اللہؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ کے حوالے سے اپنے محسوسات کا بڑے یقین کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ نظم ماں اور کتاب پڑھتے ہوئے حفیظ جالندھری کے شاہ نامہ، عمیق حنفی کی نظم 'صلصلۃ الجرس' اور چندر بھان خیال کی تخلیق 'لولاک' کے تاثرات بھی ذہن میں متحرک ہو جاتے ہیں لیکن احمد شناس کی نظم اپنی ایمانی و روحانی تہہ داری اور لسانی و شعری نظام کی بنا پر اس نوع کی دیگر نظموں سے مختلف و منفرد ہے۔

بحیثیت مجموعہ 'صلصال' ایک ایسے پختہ کار اور زرخیز ذہن شاعر کا مجموعہ کلام ہے، جو اپنی تخلیقی خود اعتمادی اور اعتقادی قوت کی بنا پر زمان و مکان کے حدود و مکانات کے آر پار ہوتے ہوئے اپنے جذبات و محسوسات کی لسانی و شعری تشکیل کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

☆☆☆

تجلیات حمد و نعت

امریکہ میں مقیم حمد و نعت کے مشہور شاعر **امان خان دل**

کا حمد و نعت پر مشتمل شعری مجموعہ

.....

دو ماہی نگینہ

چالیس سال کے بعد **وحشی سعید** کی ادارت میں

دوبارہ شائع ہو رہا ہے، جس کا پہلا شمارہ شائع ہو چکا ہے۔

رابطہ: شہنشاہ ہوٹل نیر ڈل جھیل سری نگر

کرشن کمار طور

'صلصال' آواز اور سکوت کا خوبصورت سنگم

یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارا معاشرہ آج کل جس تیزی سے تغیرات کا سامنا کر رہا ہے، اس سے شاعری کی قدر و قیمت اور اہمیت رخ جمال تک محدود نہیں رہ گئی ہے۔ نہ تو یہ دل بہلانے کا وسیلہ ہے اور نہ محض معاشرتی عمل کی تجسیم لیکن مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ شعر کا تعارف کرنا یا پھر کروانا نہایت مشکل ہے۔ واقعی شعر کسی ایک لفظ میں محصور نہیں ہوسکتا۔ شعر جو کہ ایک بسیط حقیقت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایک نئی ذہنی تعمیر کا باعث بنتا ہے۔ ایک نئے ذہنی انقلاب میں مددگار و معاون ہوتا ہے۔ انسان کے اعلیٰ وارفع اقدار کی روشن مثال ہوتا ہے۔ اس بحث سے قطع نظر میرا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ شاعری اُس کے کہنے اور کرنے والے کا ایک بسیط اور مکمل تعارف نامہ ہے، اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہے، اس کے ذہنی ممکنات کی حسین جھلک ہے۔ اس پس منظر میں ہم اگر احمد شناس کی شعری اور ادبی بالیدگی کو رقم کرنے کی کوشش کریں تو اظہار کے مختلف گوشوں کی نشاندہی کے لئے درج ذیل عنوانات قائم کئے جاسکتے ہیں۔

☆ کیا احمد شناس غیر مجسم حسن کا پرستار ہے۔
☆ کیا احمد شناس انسانی ہمہ جہت محبت کا طلبگار ہے۔
☆ کیا احمد شناس کا شعر فراق اور وصل کی رنگا رنگ داستان ہے۔
☆ کیا احمد شناس کا شعری پیکر فانی کا وسیع سرمایہ ہے۔
☆ کیا احمد شناس واقعی آواز اور سکوت کا سنگم ہے۔

''اختر شیرانی اور فیض کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فیض نے رومانی مکالمہ نگاری، تشبیہات واستعارات اور علامات کا عمدہ اور انوکھا استعمال کچھ نہ کچھ اختر شیرانی اور حسرت موہانی سے ضرور سیکھا ہوگا۔'' (ص:۱۵۲)

ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ان اقوال سے یقیناً مجھ حقیر فقیر کے اس خیال کو تقویت ملی کہ اختر شیرانی کے عہد میں جو نئی نسل پروان چڑھی، اس نے ان کی شاعری کے محاسن سے بہر طور استفادہ کیا اور آج بھی کسی نہ کسی طرح ان کے اثرات باقی ہیں۔

ترقی پسند ناقدین اپنی دیرینہ روایتوں کے پیش نظر فیض احمد فیض کی ان نظموں کے تذکرے سے صرف نظر کر جاتے ہیں، جو میرے خیال میں ان کی شاعری اور زندگی کا حاصل کہی جاسکتی ہیں۔ یہ نظمیں کشاکش حیات، ظالم ومظلوم کا مقابلہ اور عظمت کردار کے ذکر کے ساتھ ساتھ عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کے تناظر میں لکھی گئی ہیں۔ نیز اپنے دلکش اسلوب، اختصار و جامعیت، لفظ لفظ معنویت اور دردمندانہ لہجہ کی وجہ سے ہم عصر اردو شاعری میں وجہ امتیاز بنی ہیں۔ میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ذہن رسا کی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے فیض کی ان نظموں کا سیر حاصل تبصرہ اور ان کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ فیض کی ان نظموں میں مذہبی عناصر کے باوجود ان کی تمکنت، انداز واسلوب اور پروقار لہجہ کے ساتھ عالمی برادری میں امن وامان کی صورت گری اور انسانیت کے سوز وغم کو جس طرح پیش کیا ہے، وہ فیض ہی کا حصہ ہے۔ ''شام غربت'' (یا شام غریباں) ''ویبقی وجہ ربک'' (ایران میں اسلامی انقلاب کے سلسلے میں) اور ''مرثیہ امام'' فیض کی شاعری کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ ان نظموں کا عالمانہ تجزیہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی بصیرت، ان کی آگہی وفکری جہت کے ساتھ ہی خیالات کی پاکیزگی وندرت کی روشن دلیل اور کیا ہوسکتی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ ''فیض شناسی'' کا صفحہ در صفحہ ان کی کشادگی قلب ونظر سے منور ہے۔

عجیب واقعہ ہے کہ کنیڈا سے ہی ۱۹۹۴ء میں جناب اشفاق حسین کی دو جلدوں میں ''مطالعہ فیض'' کی پیش کش کے بعد کنیڈا ہی میں رہائش پزیر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ''فیض فہمی'' اور اب ۲۰۱۳ء میں ''فیض شناسی'' کی اشاعت کو روبہ عمل لاکر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ''دیکھو! اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا''۔

☆☆☆

☆ کیا احمد شناس نے غم کی پردہ داری بھی کی اور اسے آشکار بھی کیا ہے۔

یہ اور اس قسم کے کئی مفروضے احمد شناس کی شعری اساس سے اخذ کئے جاسکتے ہیں اور ان پر سیر حاصل بحث وارد ہوسکتی ہے۔ تاہم یہ ممکن نہیں کہ احمد شناس کی شاعری کے لئے کوئی ایک عنوان قائم کیا جاسکے یا ان کے شعر کو کسی ایک زاویے یا مخصوص نکتہ نظر کی مدد سے دریافت کیا جاسکے۔ کیونکہ احمد شناس کی شعری کائنات دیدہ و نادیدہ جہانوں سے عبارت ہے۔ ان کے فکر کی پرواز ماورائیت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ مگر وہ زمین کے ساتھ اپنی گہری وابستگی کو قائم رکھتے ہیں۔ ان کا شعر فکر و جذبے کی خوبصورت آمیزش سے تخلیق ہوتا ہے۔ تخلیقی شعر کی پہچان یہ ہے کہ وہ یک رنگ یا متعین رخ نہیں ہوتا بلکہ اسے پڑھتے ہوئے آنکھوں کے آس پاس خیالوں کی قندیلیں جلنے لگتی ہیں اور ذہن میں لفظ و معنی کے دائرے بنتے چلے جاتے ہیں۔ احمد شناس کا شعر بھی ایسی ہی کیفیت کا حامل ہے۔ شعر کیونکہ منبع انوار ہوتا ہے اور اس کی تلی وجدان سے بوند بوند چھن کر اطراف کو خیرہ کر دینے والی ہوتی ہے۔ اب اگر میں اپنی باتوں کو احمد شناس کے اشعار سے واقعی نہ کروں تو خود پر بھی ظلم کروں گا اور ان پر بھی کہ اشعار کی چمک سے ہی دل اور ذہن کے اندھیرے فنا ہوتے ہیں۔

اک اور آسمان چمکتا ہے خواب میں
اک اور کائنات کا آئینہ دار ہوں

گم شدہ ہے کون میری حیرتوں میں
کس کی خاطر غار کا سینہ کھلا ہے

کوئی چہرہ نہیں خوشبو کا لیکن
تماشا پھول والوں کا لگا ہے

ابھی چہرہ کا خاکہ بن رہا ہے
ابھی کچھ اور بھی میرے سوا ہے

میں اس کی پہچان ہوں یا وہ میری
کیا سمجھوں اور وہ سمجھائے کیا کیا

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ شعری کتابوں کے نام شعری شخصیت کے آئینہ دار نہیں ہوتے اور ہو بھی نہیں سکتے کیونکہ شعر میں تمام ممکنات کی جھلک ہوتی ہے۔ سارے رخ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جبکہ شاعر کی زندگی کم وبیش یک رنگ اور متعین رخ کی ہوتی ہے لیکن شاعر ہر صورت میں محبت کا شاعر نظر آنے میں مسرت کا احساس کرتا ہے اور محبت کی ہمہ جہتی اور اس کی ذہنی اور روحانی بالیدگی کا اشاریہ بن جاتی ہے۔ یہی وہ احساس ہے جو کہ اعلیٰ اور ارفع وقار کے مماثل نظر آتا ہے۔

انسانی ہمہ جہت محبت کے لئے کیا کسی شاعر کا تجربہ علم ہونا ضروری ہے یا پھر محض خیال آفرینی اور جذباتیت اس اجتماعی مقصدیت کے لئے کافی وشافی ہے۔ دنیا بھر کی قدیم اور جدید شاعری اپنی فکر اور تجربہ سے ہزار ہا تکلف کے باوجود اس قدر کی پاسدار ہے۔ اگر چہ محبت کے لئے کسی پیمانہ بلکہ ناقدانہ پیمانہ کی ضرورت اس کی نفسی، اخلاقی اور معاشرتی اہمیت کے یکسر منافی ہے۔ احمد شناس سے اپنے شعری کارگاہ میں محبت کے لازوال حسن اور گہرائیوں کو بڑے عالمانہ شان اور وسعت سے برتا ہے اور اس کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے ہاں انسانی ہمہ جہت محبت کا پیمانہ صرف اور صرف ایک ہے۔ وہ ہر طرح سے اسے ایک نئے رخ پر پیش کرنے پر قادر ہیں اور اگر از راہ منصفی دیکھا جائے تو وہ ان لطیف مضمرات سے نبرد آزما ہونے میں پوری طرح وسیع الرخ ہیں اور کامل القادر ہیں، آیئے ان کے چند اشعار سے لطف اندوز ہوں اور اس امر کا ثبوت بہم پہونچائیں۔

بدل کے دیکھو کبھی نسبتوں کی دنیا کو
بدن کو روح کے خانے میں ڈال کر دیکھو

چاند میں درویش ہے جگنو میں جوگی
کون ہے وہ اور کس کو کھوجتا ہے

سینے میں کوئی زخم کہ کھلنے کے لئے ہے
آنکھوں میں کوئی اشک کہ رونے کے لئے ہوں

مٹا دیتا ہے ہر تصور میری
مجھے اپنا بنا رکھا ہے اس نے

امیر اس کی امانت اٹھا نہیں سکتا
فقیر اصل میں اس کا خزانے والا ہے

فراق ووصل دراصل آفرینش سے شاعری کا موضوع رہے ہیں، اگرچہ ہر شاعر نے اپنی توفیق، فنی صلاحیت، معروضیت اور جانب داری سے انہیں مختلف حالات اور پس منظر میں مختلف انداز میں رقم طراز کیا ہے۔ احمد شناس نے بھی ان کی گہرائیوں کا بہ استحسان مطالعہ اور مکاشفہ کیا ہے اور اپنے اشعار میں ان کی تعمیر کی ہے۔ احمد شناس نے اپنی شاعری میں ان کے محض لغوی معنی بتانے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کی اہمیت اور تطہیر کو ایک خاص زاویے اور خصوصیت سے ترتیب دیا ہے۔ اس سے بادی النظر میں ایک خاص فائدہ ان کی شاعری کو یہ ہوا ہے کہ ان کا آہنگ بلکہ شعری آہنگ ہمارے خون کی گردش سے متصل ہو کر گردش کرنے لگتا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے، ان کا شعری آہنگ اور فکری انداز ایک خاص انداز سے فراق ووصل کے نظریے اور عقیدے سے بھرپور لطافت اور حسن سے گرفت میں آجاتا ہے۔ فراق ووصل کا موضوع کچھ ایسا سطحی اور سامنے کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے لئے شاعر کی ہمہ گیر گرفت نہایت ضروری ہے۔ یہ شاعرانہ ارتقاء کے لئے ضروری بھی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ احمد شناس اس پیمانے پر کھرے اترے ہیں اور تکلف کے باوجود ان کا شعر ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ کیوں نہ احمد شناس کے چند اشعار سے اپنے قلب کو اطمینان بخشیں۔

اسی ہوا میں محبت کا دیپ جلتا ہے
اسی جہاں کو جہانِ وصال کر دیکھو

جب تک لہو کی آگ سلگتی ہے جسم میں
آئے گی بار بار مرے امتحان کی رات

میں اس کی بارشوں کا منتظر ہوں
وہ مجھ سے میرے آنسو مانگتا ہے

کون قطرے میں اٹھاتا ہے تلاطم
اور انتر آتما تک سینچتا ہے

ہر وہ شخص جسے یہ احساس ہے کہ وہ اس ناپائیدار دنیا میں چند ساعتوں کا مہمان ہے اور کسی

بھی لمحے اس کا ناتا اس فانی دنیا سے ٹوٹ سکتا ہے۔ اگر وہ اپنی تحریر میں حزن وملال کا اظہار نہیں کرتا، اس کے شعر میں شکست خوردگی یا پھر پست ہمتی کا شائبہ نظر نہیں آتا، اگر ہماری داد کا مستحق نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ احمد شناس کی شاعری بھی بہت سے شاعروں کی مانند روح عصر کا بے حد فنکارانہ انداز ہے ، وہ اپنی شاعری میں اپنے کرب ذات کو بے حد سکون کے ساتھ شعر آمیز کرتے ہیں۔ وہ خود اپنے ذہن نارسا کی رفعت اور جذبہ کی مجسمیت میں رطب اللسان ہیں۔ ان کا شعر ایک ایسی دستاویز ہے، جہاں انسانی نفسیات کی بڑی خوبصورت تفسیر موجود ہے۔ احمد شناس مرگ طلب نہیں، نہ وہ ڈرتے ڈرتے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے ہاں شعر میں صحت مند تنقیدی مطالعہ کی توسیع نظر آتی ہے اور یہ تمام انسانیت کے لئے ایک مثال کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لطف کو اس فرحت کو آپ خود طلبی کا نام بھی دے سکتے ہیں اور لطف ذات کا بھی۔ آیئے احمد شناس کے کچھ اشعار کے ساتھ اس حسن اور خوبی سے بہرہ ور ہوں۔

غاروں کا سفر ہے مکمل نہیں ہوتا
میں اپنی خبر آپ ہی ڈھونے کے لئے ہوں

زندہ انساں اسے آباد کیا کرتے ہیں
گھر کسی خواب سے معمور نہیں ہوسکتا

تو نے مجھے خیال کیا تھا اس طرح
گردو غبار میں بھی ستارہ شعار ہوں

جینے کا تقاضا مجھے مرنے نہیں دیتا
مرکر بھی سمجھتا ہوں کہ ہونے کے لئے ہوں

پھول باہر ہے کہ اندر ہے میرے سینے میں
چاند روشن ہے کہ میں آپ ہی تابندہ ہوں

شعر محض عروضی قواعد کی پابندی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک وسیع تر چیز کا نام ہے۔ شعری آہنگ شعر کی وہ تمام حرکات ہیں، جنہیں الفاظ میں قید کیا جاتا ہے۔ لفظی استعمال سے شاعراتی اور

تصوراتی حسن باعمل ہو جاتا ہے اور ایسے ہی تجربات شاعر کے ذہن میں Images کی شکل میں رونما ہوتے ہیں اور جذباتی شدت کے مظہر بھی، مختلف آہنگ نغمگی کا احساس رکھتے ہیں اور تخلیق میں اس آہنگ، اس موسیقیت کا خلق ہونا، بیدار ہونا ایک قدرتی واردات کا مظہر ہے۔ احمد شناس نے اپنے شعری اور تخلیقی ضابطہ میں اس بات کا بے حد خیال کیا ہے کہ ان کا شعر محض وارد نہ ہو بلکہ اس کا نزول محسوسات کی ایسی ساکن سطح پر ارتعاش کے در وا کر دے، جو بصارت اور بصیرت کے دامن کو تھام لے۔ ان کا شعر جامد اشیا اور سرسری گزرتے ہوئے دل کے واقعات کو زبان دینے پر قادر ہوتا ہے۔ آیئے ان کے اشعار سے اپنے خیال کے وجود میں نیا وزن پیدا کرنے کی کوشش کریں ۔

سات قلزم ہیں مرے سینے میں
ایک قطرے سے ابھارا تھا مجھے

کھو گیا وہ اشتہاروں کے سفر میں
روز اخباروں میں خود کو ڈھونڈتا ہے

میرے اندر بھی ترے نام کی چنگاری ہے
تو مرے واسطے کیوں طور نہیں ہوسکتا

پھر اس کے بعد بس حیرانیاں ہیں
خبر والا بھی خاصا بے خبر ہے

بغیر جسم بھی جسم کا احساس زندہ
یہ خوشبو بانٹنے والی ہوائیں بھی قیامت

ایسی واردات میرے خیال میں ہر شاعر کے ساتھ ہوتی ہے، جہاں اس کا تجربہ شعر کی جذباتی شدت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کا شعر گذرتے ہوئے دل کے واقعات کو زبان دینے پر قادر ہوتا ہے۔ شعر میں تخئیل مائل بہ کلام ہونے لگتا ہے اور اپنی روشنی سے چار دانگ عالم کو روشن کر دیتا ہے۔ اکثر و بیشتر شاعر موضوع صورت حال سے ہٹ کر معروضی انداز میں اپنے اکناف میں رونما ہونے والی تبدیلی کو اپنے منفرد انداز سے دیکھتا ہے۔ اس میں فینٹسی اور تخئیل کا دخل ناگزیر ہوتا ہے۔ وہ بات کو

ظاہر کرنے کے بجائے اس کے نزول پر ایک قسم کا مہین پردہ ڈال دیتا ہے۔ شاعری میں شعر کی موجودگی یا عدم موجودگی اس بنیاد کی حامل ہوتی ہے کہ شاعر نے کیا کچھ ظاہر کیا ہے اور کیا کچھ پردہ اکفاء میں رکھا ہے۔ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کہی بات ہی ذہنی تغیر کو نشان زد کرتی ہے۔ ایسا فن جو خاموشی کا تحرک ہے، ہماری غزل کا بے حد طاقتور پہلو ہے۔ بلکہ میں تو اسے شاعری کی مرکزی حیثیت کا ہی نام دوں گا۔ آج کے فنی دور میں یہی ایک پہلو ہے، جو ہمیں ہمارے عظیم ورثہ اور روایت سے ہم کنار کرتا ہے۔ اپنے ماضی کے رشتے سے جوڑتا ہے۔ احمد شناس کا شعر بھی اپنے اس بنیادی مقصد کو ایک صوفی شاعر کی طرح موجودات سے تعلق شناس کراتا ہے۔ ایک کم حیثیت حباب کو سطح دریا پر سر اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

وہ میرے علاوہ مجھے چاہتا ہے
بڑی مختلف ہے کہانی کی صورت

سورج کیا کیا رنگ دکھاتا رہتا ہے
کیا کیا منظر اس پردے کے پیچھے ہیں

بنا دیکھے گواہی مانگتا ہے
سوال اپنا جدا رکھا ہے اس نے

بس اس کی پہچان یہی ہے
آنکھ میں آنسو بھرنے والا

پر شکستہ ہے پرندہ اس سفر میں
اور سایہ ہے کہ اڑتا جارہا ہے

میں نے احمد شناس کے بصیرت افروز شعر پر یہ ایک تجریدی تحریر رقم کی ہے۔ جس میں یقیناً ان کے شعر کے کئی پہلو تشنہ رہ گئے ہوں گے، جن پر تفصیل سے لکھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ ان کی غزل میں تمثال کاری کے بہترین نمونے ہیں۔ ان کے اشعار کی ماہیت میں نئے فکری عوامل کو تلاش کرنا اور انہیں برسر عام لانا ابھی باقی ہے۔ جنہیں میں ان کے دیگر پسند کرنے والوں پر چھوڑتا ہوں۔

'صلصال' میں 'ماں اور کتاب' کے عنوان سے طویل نظم شامل ہے۔ اس نظم کا اپنا ایک مخصوص مزاج اور منفرد انداز ہے۔ جس کے بارے میں یقیناً اہل علم سیر حاصل بحث کریں گے۔ احمد شناس کے شعر کی قوت لامحدود ہے۔ ان کا تحرک بے پایاں ہے۔ ان کی روایت فراز آشنا ہے۔ میں ان کے ایک شعر سے اپنی شعری تجسیم کو وقفہ دیتا ہوں۔

تو نے کس شوق سے لکھا ہے تعارف میرا
میں کسی لفظ میں محصور نہیں ہوسکتا

☆☆☆

ماہنامہ "**تخلیق**"-ایک قدم اور آگے

دوستوں کرم فرماؤں اور تارکین وطن ادیبوں کے ارشادات کی روشنی میں

تخلیق اشاعت گھر قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔

☆ 'تخلیق اشاعت گھر' آپ کی کتابیں خوبصورت کمپیوٹر کتابت میں اعلیٰ سفید کاغذ پر شائع کرے گا۔

☆ دلکش اور بامعنی علامتی سرورق نامور مصوروں سے بنوایا جائے گا۔

☆ کتاب کی فروخت کا انتظام ملک کے ممتاز کتب فروش اداروں کے ذریعہ کیا جائے گا۔

☆ ہر کتاب ملکی اور بین الاقوامی اخبارات و رسائل کے لئے ارسال کی جائے گی۔

☆ مصنف کی خواہش پر رونمائی کی تقریبات کا اہتمام بھی کیا جائے گا۔ پریس اور میڈیا کی سہولت بھی فراہم کی جائے گی۔ ☆ 'تخلیق اشاعت گھر' باہمی معاونت کے اصولوں پر کام کرے گا اور مصنف کا اعتماد ہر صورت میں قائم رکھا جائے گا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد اظہر جاوید مرحوم کے اشاعتی نصب العین کی توسیع ہے، اردو ادب کی ترقی اور مصنفین کا وسیع پیمانے پر تعارف ہے۔

تخلیق اشاعت گھر کی پہلی کاوش

اظہر جاوید کی کہانیاں (زیر ترتیب)

پنجابی سے اردو میں ترجمہ: حنیف باوا - کہانیوں کا جائزہ، پیش لفظ: ڈاکٹر انور سدید

اظہر جاوید کے خاکوں کا مجموعہ (زیر ترتیب)

اظہر جاوید کے پرانے کاغذات سے بازیافت (غیر مطبوعہ خاکے)

اپنا مسودہ بھیجئے - رابطہ کیجئے

سونان اظہر جاوید- جنرل منیجر 'تخلیق اشاعت گھر'، پاکستان Mb:03218899007

سیفی سرونجی

احمد شناس اور 'صلصال'

احمد شناس اردو کے معتبر شاعروں میں ایک نمایاں نام ہے۔ان کا تازہ شعری مجموعہ 'صلصال' حال ہی میں شائع ہوا ہے اور اسے یوپی اردو اکیڈمی سے انعام بھی ملا ہے۔ایک سو نوے صفحات کے اس مجموعے میں احمد شناس کی غزلوں کے علاوہ کئی نظموں کی ایک نظم ماں اور کتاب کے عنوان سے شامل ہے۔اس نظم میں شاعر کا پورا قد اس کی شخصیت، اس کی سوچ اور فکر نمایاں نظر آتی ہے۔یہ نظم اس کتاب کی جان ہے، جس کے ایک ایک لفظ میں احمد شناس کی قوت پرواز نظر آتی ہے اور کتاب کا ماحصل یہی شاہکار نظم ہے کہ جس میں شاعر ایک مفکر نظر آتا ہے اس لئے کہ دنیا میں رونق اگر ہے تو صرف ماں سے ہے، ماں کے وجود سے ہی یہ کائنات جگ مگا رہی ہے جتنے بھی رنگ نظر آتے ہیں، وہ ماں سے ہیں۔'صلصال' جو کہ کتاب کا نام ہے، اس کی معنویت بھی اس نظم میں کھلتی چلی جاتی ہے۔یہاں نظم کا ایک اقتباس پیش ہے۔

میں صحیفہ قرآں کی
آیت صلصال سے تعبیر
کھنکھناتی ہوئی آواز کا ایک پیکر تھا
میری آرائش باطن کے لئے
فکر لقمان کے کئی دشت کھنگالے تو نے
اور روشن کئے
ان گنت

شب خیز دعاؤں کے چراغ
وہ تری
مرمریں انگلیاں
جن میں دیکھا ہے فروزاں میں نے
گیلی مٹی کا ہنر
تری سانسوں کی تگ وتاز میں
سونگھی میں نے
اپنی خوشبوئے وجود

احمد شناس کی یہ نظم پوری نسل آدم کی تاریخ ہے، جس میں کائنات کے وجود اور انسانیت کے کئی رنگ بھر دئے گئے ہیں، کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ شاعر کا قد تب باہر نکلتا ہے جب وہ اپنے زمین خود نکالے اور احمد شناس نے یہ شاہکار نظم کہہ کر ایک بڑے تخلیق کار ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ شاید اسی لئے پروفیسر قدوس جاوید نے لکھا ہے:

''زبان کی گیلی مٹی کا ایسا تخلیقی برتاؤ کہ لفظ لفظ وجود کے صلصال ہونے کی گواہی دے، شاعر سے، پس وپیش آشکار، آدم خاکی کے حدود وامکانات کا پورا شعور چاہتا ہے، سبب یہ ہے کہ شاعری، عمدہ شاعری جب ظہور پذیر ہوتی ہے تو شاعری اور محض شاعری نہیں ہوتی، شاعری سے ماوراء بھی بہت کچھ ہوتی ہے، اس بہت کچھ سے ہی شاعر اور اس کی شاعری کی آواز کا انفراد وامتیاز قائم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے احمد شناس کے تازہ ترین شعری مجموعہ 'صلصال' کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ احمد شناس کی شاعری شاعری ہونے کے ساتھ ساتھ صلصال وجود کی معنویت کی جستجو سے بھی عبارت ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ احمد شناس نے اپنی شاعری میں فکر کے ایسے در چے وا کئے ہیں کہ پوری کائنات اور اس کے وجود کی تلاش میں نسل آدم کے وجود کو تلاش کیا ہے، اور ماں اس کا استعارہ ہے۔ 'صلصال میں احمد شناس کی غزلیں بھی کم درجہ کی نہیں ہیں۔ وہ بھی اعلیٰ معیار کی ہیں کہ ان میں شاعر نے زبان وبیان کی نزاکتوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور تخلیقی رنگ بھی بھرے ہیں، جس سے ان کی پوری شاعری ہمارے عہد کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔ زندگی سے جڑے مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔

کہاں سے آئے گی اب روشنی محبت کی
بہت دھواں ہے مکانوں کے درمیاں

اب اپنے گھر کے لئے اک نئی زمیں سوچو
زمیں کے سر پہ کوئی تازہ آسماں دیکھو

کون میرے راز سارے جانتا ہے
بند خوشبو کے دریچے کھولتا ہے

کون مجھ سے میرے آنسو مانگتا ہے
کس سے میرا واسطہ اظہار کا ہے

زندگی کا ہر حسیں منظر خیالی ہوگیا
آئینہ بھی خوش نما چہروں سے خالی ہوگیا

کیا خبر کتنے جہانوں سے گذرنا ہے مجھے
اس جہاں میں میرا ہونا احتمالی ہوگیا

نوجوانوں کا قبیلہ اس کے پیچھے چل پڑا
جرم کر کے بھاگنے والا مثالی ہوگیا

یہ دنیا ایک لمحے کا تماشا
نجانے دوسرا لمحہ کدھر ہے

یہ چاند اور ستارے تو اک بہانہ ہیں
کچھ اور ہے جو یہاں جگمگانے والا ہے

فہرست

حمد و نعت	سیفی سرونجی، مصداق اعظمی	۴
اکیسویں صدی اور اردو ناول: قسط:۹	سیفی سرونجی	۵
مضامین:		
ڈاکٹر سید تقی عابدی اور فیض شناسی کے چند پہلو	پروفیسر مختار شمیم	۱۳
پنجاب میں اردو افسانہ آزادی کے بعد	نور الحسنین	۱۹
سعادت حسن منٹو بحیثیت افسانہ نگار	معین الدین عثمانی	۳۱
ناصر بغدادی کی افسانہ نویسی	علیم صبا نویدی	۳۸
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں	رؤف خیر	۴۵
مجتبیٰ حسین	ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی	۵۳
اشتیاق سعید 'حاضر غائب' کے تناظر میں	محمد بشیر مالیر کوٹلوی	۵۸
امکان و ایقان کے درمیان	مراق مرزا	۷۰
خواجہ احمد عباس کی ڈرامہ نگاری	ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری	۷۶
غزل کی آبرو کا محافظ پی پی سریواستوا رند	ڈاکٹر لطیف سبحانی	۸۳
قاضی نذر الاسلام عظیم انقلابی شاعر	شمس الہدیٰ انصاری	۸۸
سرد موسم کی دھوپ	اسلم چشتی	۹۲
قمر گوالیاری قمر کی طرح روشن فنکار	احسن امام احسن	۹۷
طنز کیا ہے مزاح کیا ہے؟	رؤف خوشتر	۱۰۲
محمد ہارون سیٹھ سلیم بنگلوری کی مزاحیہ شاعری	عبداللہ سلمان ریاض	۱۰۶
گوپی چند نارنگ اور غالب شناسی	سیفی سرونجی	۱۱۳
چند سیپیاں سمندروں سے پروین شیر کا نیا کارنامہ	سیفی سرونجی	۱۱۷
۱۱ افسانوی ادب پر عبدالصمد سے مکالمہ (انٹرویو)	نثار احمد صدیقی	۱۲۲
بیرونی شعراء کی تخلیقات-		۱۳۰

سوہن راہی، رشیدہ عیاں، مسعود تنہا، وصی مکرانی، ساحر شیوی۔

نورالحسنین
1-12-31 , Pragati colony
Ghati , Aurangabad
431001 (M.S)

پنجاب میں اردو افسانہ آزادی کے بعد

پنجاب کے نام کے ساتھ ہی دل میں گدگدیاں سی ہونے لگتی ہے۔ پانچ بڑی ندیوں سے سیراب ہونے والی یہ سرزمین ،لہلہاتے کھیتوں ،سرسبز وشاداب وادیوں ،اور مہمان نواز میزبانوں ، سیدھے سادھے سچے انسانوں کا یہ مسکن محنت کشوں ، بہادروں اور مضبوط جیالوں ،فوجیوں ،منچلوں ، رانجھا جیسے عاشقوں اور ہیر جیسی الھڑ باوفا ،حسین ترین دوشیزاؤں کی یہ بستی اپنے اندر افسانوں کی ساری زرخیزیاں رکھتی ہیں ۔ یہی وجہ رہی ہے کہ پنجاب کا اردو افسانہ ہر عہد میں اپنی برتریوں کا احساس دلاتا رہا ہے۔ سعادت حسن منٹو ،کرشن چندر ،احمد ندیم قاسمی ،اُپندر ناتھ اشک ،راجندر سنگھ بیدی ،دیویندر ناتھ ستیارتھی ،کرتار سنگھ دُگل ، مہندر ناتھ ،بلونت سنگھ ،جوگندر پال ،سریندر پرکاش ، گربچن سنگھ ،رتن سنگھ ، شرون کمار ورما ،رام لال ،نند کشور وکرم ،کیول دھیر ،بلراج کومل ،ہیرانند سوز ، وغیرہ سے محمد بشیر مالیر کوٹلوی تک اور محمد بشیر مالیر کوٹلوی سے سالک جمیل براڑ تک ایک کہکشاں نہیں بلکہ کئی کہکشاؤں پر مشتمل ہے۔

آزادی کے بعد پنجاب میں اردو افسانے کا احوال بیان کرنا اور وہ بھی کسی مختصر سے مضمون میں ،یہاں کے فن کا سرسری جائزہ تو ہوسکتا ہے لیکن مکمل احاطہ نہیں ۔ یہ موضوع تو پوری ایک کتاب کا

خواب کی صورت دنیا میرے ہاتھ نہ آئی
ہار گیا میں ایک سہانا گورکھ دھندا

اس طرح کے فکر سے بھرپور اشعار احمد شناس کے یہاں موجود ہیں۔ جو انھیں اس عہد کے معتبر شاعروں کی فہرست میں ایک نمایاں مقام دلانے کے لئے کافی ہیں۔ اس لئے کہ آج کل شاعری بس ایک ڈھرے پر چل رہی ہے، وہی قوافی، وہی ردیفیں، کوئی انفرادیت دور دور تک نظر نہیں آتی۔ لیکن احمد شناس کے یہاں نہ صرف ایک گہری سوچ ہے، بلکہ ایک انوکھا انداز بھی ہے، بات کہنے کا سلیقہ ہے، زبان و بیان پر مہارت حاصل ہے، جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں ایک تاثیر بھی پیدا ہوگئی ہے۔ 'صلصال' میں غزلوں، نظموں کے علاوہ پروفیسر قدوس جاوید، اور کرشن کمار طور کے مضامین بھی شامل ہیں لیکن سب کی رائے دینے کے بجائے میں نے شاعر کے کلام کو پیش کیا ہے تاکہ قارئین خود فیصلہ کریں کہ ہمارے درمیان کیسے کیسے خوبصورت شاعر موجود ہیں، میں اپنے دوست عمر فرحت کا مشکور ہوں کہ انھوں نے اتنے پیارے شاعر سے نہ صرف ملاقات کرائی بلکہ اس کتاب کو پڑھ کر احمد شناس کی شخصیت کے کئی نمایاں پہلو بھی سامنے آئے، آخر میں اپنی پسند کے چند شعر پیش کرتا ہوں۔

ریت کی چادر اوڑھ کے سویا
دریاؤں پر چلنے والا

کچھ تو ہے جو ٹال رہا ہے
شام سویرا کرنے والا

کس کا موتی سیپ کے اندر
کون حفاظت کرنے والا

بس اس کی پہچان یہی ہے
آنکھ میں آنسو بھرنے والا

☆☆☆

محمد متین ندوی

احمد شناس ایک منفرد اور معتبر شاعر

عصر حاضر میں کتابوں کی اشاعت کی سہولیات کی وجہ سے ہر کسی کے شعری مجموعے منظر عام پر آرہے ہیں، ہر کسی کو صاحب مجموعہ اور صاحبِ دیوان شاعر کہلوانے کا شوق ہے، جسے صحیح طریقہ سے ایک شعر بھی کہنا نہیں آتا وہ بھی اس دوڑ میں شامل ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایسے شعری مجموعے بھی منظر عام پر آرہے ہیں، کہ صاحبِ مجموعہ کو سرے سے شعر کہنا ہی نہیں آتا نہ وہ وزن قافیہ اور ردیف کا شعور رکھتے ہیں، لیکن شہرت کی تمنا انھیں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ ویسے بھی اکثر شعری مجموعے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں اور ان میں اس قدر مماثلت اور یکسانیت ہوتی ہے کہ اگر شاعر کا نام تبدیل کر کے کسی دوسرے شاعر کا نام لکھ دیا جائے، تو وہ اسی کا سمجھ لیا جائے، انفرادیت اور اعتبار حاصل کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اس کے لئے فطری طور پر شاعر ہونا اور مطالعہ و مشاہدہ اور تجربات کے ذریعہ ہی شاعری میں انفرادیت پیدا کرنا ممکن ہے۔ احمد شناس ایک ایسے ہی معتبر اور منفرد شاعر ہیں، جنھیں خدا نے شعر گوئی کا شعور بھی عطا کیا ہے اور انھوں نے اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کے ذریعہ اپنی شاعری میں انفرادیت بھی پیدا کی ہے۔ انھیں عصری آگہی بھی حاصل ہے اور شعر گوئی میں مہارت بھی۔ دیکھئے ان کے چند اشعار جن میں عصری آگہی موجود ہے اور شعری حسن بھی ؎

یہ دنیا بے خبر لوگوں کی احمد
وہ دنیا کا نہیں جو جانتا ہے

نوجوانوں کا قبیلہ اس کے پیچھے چل پڑا
جرم کر کے بھانے والا مثالی ہوگیا

پیٹ کی خاطر مشرق سے مغرب کی دوڑ لگاتا ہوں
ایسی بھوک لگی ہے احمد روٹی کھانا بھول گیا

اس دنیا نے میرے سندر سپنے چھین لئے
پھول سے ملنا جلنا ، چاند سے باتیں کرنا بھول گیا

خزاں دیدہ گلابوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں
کتابوں کی حفاظت میں تھے کو پُرکار بچے

موجودہ دور میں جو اخلاقی ، سیاسی ، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیاں ہوئیں ہیں اور ہورہی ہیں ، ان کا اثر احمد شناس کی شاعری پر بھی پڑا ہے ، احمد شناس صرف کشمیر ہی نہیں بلکہ پوری ادبی دنیا میں شہرت و مقبولیت اور اپنا ایک مقام رکھتے ہیں ۔ ان کی شاعری میں شعری حسن بھی ہے اور عصری آگہی اور سسکتی و بلکتی انسانیت کا درد بھی ۔ دیکھئے ان کے چند شعر ۔

اب اپنے گھر کے لئے اک نئی زمیں سوچو
زمیں کے سر پہ کوئی تازہ آسماں دیکھو

کہاں سے آئے گی اب روشنی محبت کی
بہت دھواں ہے مکانوں کے درمیاں دیکھو

رشتوں کا آشوب انھیں کھاجائے گا
ہم سے کتنے دور ہمارے بچے ہیں

میں خود اپنے آپ سے ہوں بیگانہ سا
بستی کے انسان بھی میرے جیسے ہیں

ہماری مشرقی تہذیب، ہماری اپنی پہچان مغربیت کا شکار ہوگئی ہے، شاعر کو اس کا شدت سے احساس ہے، ہماری اخلاقی قدریں، ہمارا آپسی بھائی چارہ، ہماری مل جل کر رہنے کی عادت، ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہونے کی فطرت ہم سے رخصت ہورہی ہے۔ گنگا جمنی تہذیب ہماری شناخت تھی، اردو زبان اور مشرقی تہذیب کی پہچان تھی لیکن یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ ہماری پہچان ختم کی جارہی ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم خود اپنی پہچان ختم کرنے پر کمربستہ ہو چکے ہیں، کیونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہمیشہ ہی دوسروں کے مقابلے میں اپنوں سے نقصان زیادہ پہنچا ہے، اور آج بھی پہنچ رہا ہے، دوسروں کے وار سے تو بچا جاسکتا ہے لیکن جب اپنا ہی بھائی غیروں کا کردار نبھانے پر آمادہ ہو تو اس سے بچ پانا آسان نہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال سے ہماری تہذیب اور ہماری زبان بھی دوچار ہے۔

موجودہ دور کا انسان بہت سے مسائل اور مصائب سے دوچار ہے، تہذیبی قدریں کھوگئی ہیں، انسانیت کا جنازہ نکل رہا ہے، ایک دوسرے کی راحت کا خیال رکھنے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں، ورنہ تو عام طور پر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور خود کو بلند و بالا مقام پر پہنچانے کی کوششیں ہی دکھائی دیتی ہیں۔ مادیت کا غلبہ، جاہ پرستی، زر پرستی، عیش پرستی، شہوت پرستی اور حیوانیت کا دور دورہ ہے۔ ایسے میں احمد شناس صاحب جیسے انسانی درد رکھنے والے، انسانیت کا احترام کرنے والے کم ہی نظر آتے ہیں۔ احمد شناس صاحب بحیثیت شاعر تو مشہور و معتبر ہیں ہی بحیثیت انسان بھی، ان کے کارنامے قابل تعریف ہیں۔ احمد شناس صاحب نے اپنے تجربات و مشاہدات اور فکر کو براہ راست بیان کرنے کے بجائے علامتی اظہار کو اپنایا ہے، کیونکہ وہ شاعری میں براہ راست اظہار بیان کو شعری حسن کے منافی سمجھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ 'صلصال' میں شامل اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''تخلیقی ادب زندگی کے دوسرے علوم سے مختلف ایک چیز ہے۔ دوسرے علوم میں چیزوں کو براہ راست معلومات کا موضوع بنایا جاتا ہے مگر شاعری میں مشاہدے میں آنے والی چیزیں زیادہ تر علامتی اظہار کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ ایک تخلیقی شاعر جب درخت کو دیکھتا ہے تو وہ اس کی شاخوں اور پتوں کی بات نہیں کرتا۔ بلکہ وہ درخت کی اصطلاح میں ماورائے درخت کسی چیز کی بات کرتا ہے۔ ایک سائنس داں جب یہ کہتا ہے کہ نظر آنے والے ستاروں کے علاوہ بھی اس خلا میں بے شمار دوسرے ستارے موجود ہیں۔ تو ظاہر ہے وہ ستاروں ہی کے بارے میں بات کر رہا ہوتا ہے مگر ایک شاعر جب یہ کہتا ہے کہ

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تو یہاں شاعر کا موضوع گفتگو ستارے نہیں ہیں بلکہ وہ ستاروں کے حوالے سے زندگی کے نہ ختم ہونے والے تسلسل کی بات کر رہا ہے۔

جہاں تک شاعر کی ذاتی محرومیوں یا ان سے وابستہ دکھوں کا تعلق ہے، تو ایک اچھا شاعر کبھی انہیں طشت از بام نہیں ہونے دیتا۔ میں سمجھتا ہوں شاعر زندگی کے ڈرامے میں ایک ایسے کردار کی طرح ہے جو کہانی میں antidote کا کام کرتا ہے۔ وہ زندگی کی تلخیوں اور ناخوشگواریوں کو اپنی جان پر سہن کر کے ایک خوش آئند اور خوش ذائقہ چیز دوسروں کو دیتا ہے۔ وہ ماحول میں بسے ہوئے زہر کو اپنے اندر جذب کر کے بادِ صبا کے نرم و نازک جھونکوں کی طرح خوش احساس نغموں کی تخلیق کرتا ہے۔''

'صلصال' احمد شناس کا دوسرا شعری مجموعہ ہے، جو سال گذشتہ ریور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے میں غزلوں کے علاوہ کئی نظموں کی ایک نظم 'ماں اور کتاب' بھی موجود ہے، جس سے اس مجموعہ کا نام ماخوذ ہے۔ 'صلصال'' کہتے ہیں، ایسی مٹی کو جس میں کھنکھناہٹ ہو، جو بجتی ہو، سڑی ہوئی مٹی کو بھی صلصال کہا جاتا ہے۔ احمد شناس نے اپنے شعری مجموعہ کا نام 'صلصال' رکھ کر انسان کی خلقت اور اس کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس موقع پر احمد شناس کی کئی نظموں کی ایک نظم 'ماں اور کتاب' کی چند لائنیں پیش ہیں۔

میں صحیفۂ قرآں کی
آیت 'صلصال' سے تعبیر
کھنکھناتی ہوئی آواز کا اک پیکر تھا
میری آرائش باطن کے لئے
فکر لقماں کے کئی دشت کھنگالے تو نے
اور روشن کئے
ان گنت
شب خیز دعاؤں کے چراغ

اس نظم میں احمد شناس نے انسان کی حقیقت اس کی ابتدا، انتہا، قیامت اور حشر و نشر تک کے حالات کے بیان کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ اس نظم میں احمد شناس کی فکر بھی ہے اور پیغام بھی۔

نظم کی چند لائنیں اور پیش ہیں، جن میں قیامت کا منظر پیش کیا گیا ہے۔

جان رکھو کہ
یہ آرائش موجود کا طشت
ہے الٹنے کے لئے
آنے والی ہے وہ چیز
کھڑکھڑانے والی
اور ہوا
ارض وسما کی ہے
اکھڑنے والی
یہ توانائی کا سورج
یہ بلندی کے ستارے
یہ پہاڑ
اک دھماکے سے بکھر جائیں گے
خاشاک کی مانند
پراگندہ غبار

اس نظم میں احمد شناس صاحب نے انسان کی حقیقت، مقصد حیات، اس کی ابتدا، انتہا، ماں کی عظمت، قیامت، اور حشر ونشر کے تک کا ذکر بڑے سلیقے سے شعرائے پیرائے میں کیا ہے۔ اس نظم میں شاعر کی علمی پختگی اور فکری استقامت تو موجود ہے ہی، شعری حسن بھی قابل تعریف ہے۔ یہ نظم ایسی ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے اور اس سے استفادہ کیا جائے۔

☆☆☆

احمد شناس کی غزلیں

ایک نعتیہ غزل

لوگ اُس کا نام لیتے ہیں سیاست کے لئے
وہ کہ آیا لفظ و معنی کی شہادت کے لئے

ہم سرابوں کے لئے لڑتے ہیں مرتے ہیں یہاں
وہ سمندر پیاس والوں کی ضرورت کے لئے

آدمی کو مُکت کر ڈالا تھا اس نے خوف سے
مجھ کو دیکھو آج بھی زندہ ہوں دہشت کے لئے

فائدوں کا رخ بدل کر رکھ دیا اُس نے یہاں
حوصلہ درکار ہے ایسی تجارت کے لئے

فکر کا سورج ، خبر کا آسماں اُس نے دیا
اور آزادی بھی دی مجھ کو بغاوت کے لئے

میری سانسوں میں کہاں ہے ورنہ وہ خوشبوئے جاں
ساری تقریریں ہیں محفل کی حرارت کے لئے

حسن اس میرے آئینے میں کھلتا ہی نہیں
ذکر اس کا میرے ہونٹوں پر ہے برکت کے لئے

وہ بھی میرے ریگزاروں کے لئے ہے اجنبی
اجنبی ہوں میں بھی اس بارانِ رحمت کے لئے

اس کو انساں نے قبیلوں کے حوالے کر دیا
جو یہاں آیا تھا انسانوں کی وحدت کے لئے

درد کی فصلیں اگاتا ہے وہ دل کے کھیت میں
اشک کے موتی لٹاتا ہے محبت کے لئے

نسبتوں کے بے ثمر جنگل میں سرگرداں ہوں میں
نام احمد رکھ لیا حسنِ سماعت کے لئے

☆

محبتوں کو کہیں اور پال کر دیکھو
متاعِ جاں کو بدن سے نکال کر دیکھو

بدل کے دیکھو کبھی نسبتوں کی دنیا کو
بدن کو روح کے خانے میں ڈال کر دیکھو

سنو اسے تو سماعت سے ماورا ہوکر
جو دیکھنا ہو تو آنکھیں نکال کر دیکھو

یقین دشت سے پھوٹے گا آبجو کی طرح
کہ حرفِ 'لا' کی گواہی بحال کر دیکھو

نفس نفس ہے یہاں مقبرہ عقیدت کا
یہ مقبروں کا جہاں پائمال کر دیکھو

اسی ہوا میں محبت کا دیپ جلتا ہے
اسی جہاں کو جہانِ وصال کر دیکھو

وہ سنگ دے تو حرارت نچوڑ لو اپنی
جو پھول دے تو نگاہِ کمال کر دیکھو

پھر اس کے بعد کوئی ڈر نہیں طلاطم کا
اس ایک بوند کے غم کو وشال کر دیکھو

بدن کی پیاس بھی اک ماورا کہانی ہے
ہر ایک بوند کو دریا خیال کر دیکھو

پلٹ کے آئیں گے ساون کے رنگ آنکھوں میں
تم اپنے آپ سے رشتہ بحال کر دیکھو

وہ بولتا ہے پہاڑوں کی اوٹ سے اکثر
کسی پہاڑ سے اس کا سوال کر دیکھو

یہ راز اور کہاں تک ہمیں نبھانا ہے
کبھی تو رات میں سورج نکال کر دیکھو

تم اپنے گوہر یکتا کو اس طرح ڈھونڈو
کہ خود کو بے سر و ساماں خیال کر دیکھو

جو دیکھنا ہو کبھی دوستوں کا دل احمؔد
کھرے اصول کا پتا اُچھال کر دیکھو

☆

یہاں ہر لفظ معنی سے جدا ہے
حقیقت زندگی سے ماورا ہے

ابھی چہرے کا خاکہ بن رہا ہے
ابھی کچھ اور میرے سوا ہے

ہمیں جو کچھ ملا ناقص ملا ہے
مگر خوش فہمیوں کی انتہا ہے

کوئی چہرہ نہیں خوشبو کا لیکن
تماشا پھول والوں کا لگا ہے

میں اس کی بارشوں کا منتظر ہوں
وہ مجھ سے میرے آنسو مانگتا ہے

یہی باعث ہے میری تشنگی کا
سمندر مجھ سے پانی مانگتا ہے

مقدس ہوگیا ہے جھوٹ میرا
مجھے تو اب اسی کا آسرا ہے

میں پیاسا ہوں پرانے موسموں کا
مگر اب وہ زمانہ جاچکا ہے

کہانی برگِ سوزاں سے عبارت
وگرنہ بحر وبر بھی حاشیہ ہے

نہیں ہے خواب سی تصویر جس کی
تو پھر اس خواب کی تعبیر کیا ہے

گماں ہنگامہ آرائی کا عادی
یقیں تنہائیوں میں بولتا ہے

یہ دنیا بے خبر لوگوں کی احمؔد
وہ دنیا کا نہیں جو جانتا ہے

☆

جہالت روگ تھا جو دل کے اندر
وہی مذہب ہمارا ہوگیا ہے

زندگی کا ہر حسیں منظر خیالی ہوگیا
آئینہ بھی خوش نما چہروں سے خالی ہوگیا

اس نے پورے چاند کی صورت تراشا تھا مجھے
میں سیہ راتوں میں کرنوں کا سوالی ہوگیا

یہ سفر کی آخری منزل ہے پانی کے بغیر
ایک چشمہ تھا پسِ دیدہ کہ خالی ہوگیا

آئنوں کے بیچ اس نے رکھ دئے کتنے سوال
ساعتِ اظہار میں وہ بھی سوالی ہوگیا

کیا خبر کتنے جہانوں سے گزرنا ہے مجھے
اِس جہاں میں میرا ہونا احتمالی ہوگیا

کوئی رانجھا تھا حقیقت میں نہ کوئی ہیر تھی
سارا قصہ ہی محبت کا خیالی ہوگیا

نوجوانوں کا قبیلہ اس کے پیچھے چل پڑا
جرم کرکے بھاگنے والا مثالی ہوگیا

ایک بچہ ذہن سے پیسہ کمانے کی مشین
دوسرا کمزور تھا سو یرغمالی ہوگیا

حسن اس کا آشکارا ہوگیا احمؔد شناس
درد میرا پتہ پتہ ڈالی ڈالی ہوگیا

☆

تتلیوں کے لمس کی موجِ ہوا ہے
اس جہاں میں اور میرے پاس کیا ہے

بس یہی قصہ فروغِ جسم کا ہے
پیڑ کی چوٹی سے پتہ ٹوٹتا ہے

دیکھنا سننا بھی اک دیوار سا ہے
اُس طرف کوئی خزانہ خواب کا ہے

پرشکستہ ہے پرندہ اس سفر میں
اور سایہ ہے کہ اڑتا جارہا ہے

آسماں چہرہ بدلنے کو ہے شاید
موسموں نے راز افشا کر دیا ہے

وہ خدا کے واسطے بولا ہمیشہ
اس لئے مذہب سے خارج ہوگیا ہے

وہ اذانِ ذات کا اللہ اکبر
اب کسی مسجد کا چھوٹا سا خدا ہے

بجھ گیا آخر یدِ بیضا بھی احمؔد
روشنی والا بھی مجھ سے کھیلتا ہے

☆

متقاضی ہے۔

منشی پریم چند کے اُتر پردیش میں دیہی زندگیوں کے مسائل کی کہانیاں سنانے والا اردو افسانہ جب پنجاب کی زرخیز زمین میں داخل ہوا تو اپنے اندر زندگی کے ہزار ہا رنگوں کو سمیٹ لایا کرشن چندر کے رومانی قلم نے دل و دماغ کو اگر تازگی بخشی تو منٹو کے افسانوں نے انسانی نفسیات کی گرہیں، عزتِ نفس کا احساس اور سماج کی ٹھکرائی ہوئی گندگیوں میں سے کنول کے پھول تلاش کیے، تو احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی اور بلونت سنگھ نے پنجابی وضع داریوں، یہاں کے دیہاتوں، یہاں کی بولی ٹھولیوں، یہاں کے ماحول، یہاں کے رسم و رواج، میلے ٹھیلوں اور یہاں کے انسانوں سے ملاقاتیں کروائیں۔ اوپیندر ناتھ اشک نے شہری زندگی کے مسائل میں جوجھتے ہوئے افراد کا آئینہ دکھایا، دیویندر ستیارتھی نے لوک گیتوں اور دیومالائی کرداروں کی روشنی میں آج کے انسان کو پرکھنے کی کوشش کی، رتن سنگھ نے انسانوں کی بے بسی دیکھی، اُن کی مجبوریوں کو سمجھا اور اُس سیدھے سادھے انسان کو اپنے افسانوں کا محور بنایا جو محض مصلحتوں کی زندگی جی رہا ہے۔ ہیرانند سوز، شرون کمار ورما اور رام لال نے بدلتی قدروں کے ساتھ بدلتے ہوئے انسانوں کے مزاج کو اپنے افسانوں میں پرکھنے کی کوشش کی، نند کشور وکرم ہجرتوں کے کرب میں ماضی کی شاندار روایتوں کی نوحہ خوانی میں اپنے افسانوں کا خمیر تیار کرتے رہے۔ تو، ڈاکٹر کیول دھیر نے اپنے افسانوں کا موضوع ازدواجی زندگیوں میں اُٹھنے والی خلیج کے اُس سرے کو ڈھونڈھنے کو کوشش کی جہاں سے اعتماد اور اعتبار کی فضاء سازی ممکن ہے۔ تو دوسری طرف مذہب کی آڑ میں کھیلے جانے والی عیاریوں، فسادات، اور نفرتوں کے خلاف قلم اُٹھایا تو محمد بشیر مالیر کوٹلوی اپنے افسانوں میں رشتوں کا تقدس، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی جکڑ بندیوں میں گھرے افراد کی عکاسی کرتے ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد اگرچہ سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی پاکستان ہجرت کر گئے لیکن اس کے بعد بھی اُن کے افسانوں میں پنجاب کا دل دھڑکتا رہا۔ میں طوالت کے خوف سے ان عظیم افسانہ نگاروں کی فنی خوبیوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہندوستانی پنجاب کے کچھ افسانہ نگاروں کی طرف آتا ہوں۔ یہ وہ افسانہ نگار ہیں جن کے ذکر کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ کبھی بھی مکمل نہیں ہوسکتی اوپندر ناتھ اشک ابتداء میں پریم چند سے بہت متاثر تھے۔ اسی وجہ سے اُن کے پاس بھی نچلے متوسط طبقے کی معاشرتی زندگیوں کا احوال ملتا ہے۔ ان میں کہیں جنسی استحصال بھی ہے اور کہیں جنسی بے راہ روی بھی کہیں عدم مساوات اور مسائل سے جوجھتے ہوئے کردار ہیں، لیکن آزادی اور تقسیم ملک کے بعد بڑی تبدیلیاں آئیں۔ ایک طرف صنعتی انقلاب دستک دے رہا تھا تو دوسری

ہمارے بچے

(کشمیر کے مخصوص حالات کے پس منظر میں)

خداوندا وہ خوشبو کے امانت دار بچے
چمن سے منحرف ہیں پھول سے بیزار بچے

خزاں دیدہ گلابوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں
کتابوں کی حفاظت میں تھے جو پر کار بچے

وہ کونپل پھوٹنے والی تھی جس سے بوئے اقرأ
اُسی کونپل سے آخر ہوگئے انکار بچے

سکولوں کے درودیوار مرجھائے ہوئے ہیں
نہ جانے کیا ہوئے وہ لفظ کا پندار بچے

کسی نے پھر انھیں لوٹا دیا وحشت کی جانب
ہمیشہ مارنے مرنے کو ہیں تیار بچے

فرشتوں کی سماعت کے رسیلے بول والے
ملیں گے اب کہاں وہ زندگی کا پیار بچے

ملا ہے پرورش میں لفظ کا آشوب ان کو
سیاست کے لئے اچھے ہیں یہ بیمار بچے

سرابوں کے لئے اپنا گلستاں پھونکتے ہیں
امانی داستانوں کے امانت دار بچے

دعا کی روشنی آنکھوں میں نہ رشتوں کی شبنم
کہ پھولوں کی جگہ ہیں سنگ کی بوچھار بچے

وراثت میں ملی ہے پیاس اندھی نفرتوں کی
رگوں میں پالتے ہیں زہر کا انگار بچے

مکمل رہنمائی کا صحیفہ جیب میں ہے
مگر اندھے سفر میں مضمحل ، لاچار بچے

ہمارے عہد کے آتش کدوں کی زندگی ہیں
یہ کچی عمر کے معصوم ، لالہ زار بچے

وہ موسم ہے کہ بنجر ہوگئے خوشبو کے سوتے
نہ غم پھولوں کا احمد نہ کہیں غمخوار بچے

☆

کتابوں کی دنیا

کتاب کا نام : زریں نامہ

شاعرہ: عفت زریں

پبلشر: شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: وسیم بیگم

زیرِ نظر کتاب عفت زریں کا دوسرا شعری مجموعہ ہے، پہلا شعری مجموعہ 'بے ساحل دریا' اردو شعر و ادب میں مقبول و عام ہوا۔ عفت خود بھی ہمارے عہد کی جانی پہچانی شاعرہ ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ ان کی غزلوں پر کلاسیکی اور نو کلاسیکی شاعری کا عکس خاص طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ شاعرہ کی زیادہ تر غزلیں متاثر کن ہیں۔ نیز ایک عورت کے درد و کرب کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔

زریں تمام عمر کی خوش بختیوں کے بعد
وہ مہر دے رہا ہے تو اب زہر کی طرح

عورت کبھی ماں ہے کبھی بیٹی ہے بہن ہے
عورت سی بلندی پہ کوئی ذات کہاں ہے
بے تعلق سا، یہ رشتہ ہے مگر جیسا بھی ہے

ٹوٹتے رشتوں کا سایہ ہے یہ مگر جیسا بھی ہے

ان اشعار میں تانیثی لب ولہجے کے ساتھ تانیثی درد وکرب کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شاعرہ کے یہاں روایت کی پاسداری بھی ملتی ہے اور عورت پر ہونے والے ظلم واستحصال کے خلاف خاموش احتجاج بھی، خواتین پر ہونے والے تشدد کے خلاف ان کی آواز دبی دبی سی ہے، بہت زیادہ کھل کر انھوں نے ان مسائل پر آواز نہیں اٹھائی۔ ساتھ ساتھ غزل کی اشاریت اور غنائیت کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ زیر نظر کتاب میں شاعرہ نے میری بات کے عنوان سے عورت کی شناخت کے متعلق کئی اہم اشارے کئے ہیں:

''اپنی شناخت بنانا اور پھر اس کو قائم رکھنا شاید دنیا کا سب سے مشکل ترین عمل ہے اور یہ کام عورت کے لئے اور بھی دشوار ہے کیونکہ گھر کی چہار دیواری کے باہر قدم رکھتے ہی لوگ اس کے ساتھ اپنوں جیسا سلوک کرنے لگتے ہیں اور بھول جاتے ہیں، یہ عورت بھی ہمارے سماج کا ایک 'انمول رتن' ہے۔ اور یہ کسی سہارے کے بغیر زندہ رہنا چاہتی ہے۔ اس کی ضرورت اور محنت دونوں نے ایک کاوش کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ تمہاری جاگیر نہیں، اس کی اپنی ایک الگ ملکیت ہے، جو آسانی سے نہیں خریدی جاسکتی۔''

یہاں اس عورت کے درد وکرب کو دیکھا جاسکتا ہے، جو ایک شاعرہ ہے، جس کا اپنا تشخص ہے، جس کی اپنی پہچان ہے، جو دوسروں کے نام سے نہیں بلکہ اپنے نام کے سہارے اس دنیا میں جینا چاہتی ہے لیکن اس جہاں کے مرد ٹھیکیدار اس سے اس کا تشخص بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔

غزلوں کے ساتھ ان کی نظمیں بھی بہت اچھی ہیں۔ جو آج کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ 'قلم کار' کے عنوان سے انھوں نے جو نظم لکھی ہے، اس میں ایک عورت کے جذبات واحساسات کو بہ خوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

میں قلم کار ہوں
اور عورت ہوں
سب کے دکھ میرے قلم کو
نظر آتے ہیں مگر صرف
اس ڈر سے کیونکہ پردہ میری فطرت
اور زخموں کا چھپانا طبیعت مری

بس یہ سوچ کے ہر زخم چھپا لیتی ہوں
اپنے ہر درد کو ہونٹوں پہ سجا لیتی ہوں
کیونکہ ہر حال میں جینے کے لئے
میں نے سمجھوتہ دل و جاں سے بھی کر رکھا ہے

نظم 'بوجھ' میں بھی شاعرہ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت گھر اور آنگن دونوں مقامات پر کام کرتے کرتے مشین بن کر رہ گئی ہے۔ گھر، دفتر، بچے اور شوہر جن کے لئے وہ تمام قربانیاں دیتی ہے لیکن شوہر اور بچے دونوں میں سے اس کا اپنا کوئی نہیں۔ جن کو وہ اپنا زخم دکھا سکے، عفت کی نظم 'آئندہ' بھی تانیثی زبان کے ساتھ لب ولہجہ نیز برابری کا سلوک چاہتی ہے۔ یہ بند ملاحظہ کیجئے ۔

میں نے مانا کہ میں عورت ہوں
مگر انسان ہوں
میں بھی خود اپنے لئے سوچ بدل سکتی ہوں
خود بنائے ہوئے رستوں پر بھی چل سکتی ہوں
ناپسندیدہ کو تا زیست نبھاؤں کیسے
کشش اندر کشش شوق ہے

بے راہ رواں

یہاں عورت کی خودداری، اس کی انا اور اس کی بدلتی ہوئی سوچ کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دہشت گردی کی لپٹ میں آج کل پوری دنیا آئی ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اس سے خوف زدہ ہے۔ اسی سلسلے کی ان کی ایک نظم ہے 'کس کے نام' اس میں شاعرہ نے یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ دہشت گردوں کا کوئی دین وایمان نہیں ہوتا، بس ان کی ایک ہی سوچ ہوتی ہے کہ کس طرح چاروں طرف دہشت پھیلائی جائے اور عوام کو ڈر و خوف کے سائے میں رہنے پر مجبور کیا جائے۔

یہ عید کیسی ہے، ملک میں برپا ہونے والے فسادات پر مبنی ہے۔ جہاں کہیں بھی کوئی فساد رونما ہوتا ہے، تو وہ اس خطے کی تمام خوشیاں بھی اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور پھر جب اس علاقے میں عید جیسی خوشی آتی ہے تو پھر وہ والدین کیسے اس عید کو منائیں جن سے ان کے پھل چھن گئے۔ وہ معصوم بچے کیسے عید منائیں جن کا ان فسادات میں تمام مال واسباب لٹ گیا۔ ان کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ بچے اس خوشی کے موقع پر بھی بھیک مانگنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔

ننھے ننھے سے ہاتھ پھیلے ہیں
آنے والوں سے رو کے کہتے ہیں
ہم فسادات کے ستائے ہیں
کچھ تو دے دو بہت ہی بھوکے ہیں
کیا کرشمہ ہے کیا خدائی ہے
عید کیسی یہ اب کی آئی ہے

عفت زریں کی نظموں میں عصری عہد کی عورت سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عورت اپنے تشخص کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اس کو حاصل کر کے رہے گی۔ آج اس اکیسویں صدی میں بھی جہاں عورت نے چاند کا سفر طے کر لیا ہے۔ ہر میدان میں وہ مرد کے شانے سے شانہ ملا کر چل رہی ہے۔ آج بھی عورت کو ایک بے مصرف شئے سمجھا جاتا ہے۔ آج مرد حضرات اس سچائی کا قطعی اقرار نہیں کرتے کہ وہ عورت کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ عورت کے ہی دم سے اس کائنات میں رنگ بھرے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب زریں نامہ اپنی شاعری کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے، جس طرح عفت زریں نے عورت کے درد و کرب کو بیان کیا ہے۔ وہ کرب انفرادی نہ بن کر اجتماعی بن گیا۔ آج اس درد سے ہر مشرقی عورت گزر رہی ہے۔ کتابت کی کچھ غلطیاں راہ پا گئی ہیں، جو ہر کتاب میں ہوتی ہیں، امید ہے شاعرہ کی اس تخلیقی نگارش کو اردو شعر و ادب میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

عفت زریں کی نظم 'عورت' پر اپنی بات ختم کرتی ہوں۔

میں عورت ہوں اگر یہ جرم ہے
تو جرم فطرت ہے
یہی تقدیر ہستی ہے
یہ ہی تخلیق کا مقصد
یہی دنیا کے معنی ہیں
متاع زندگی ہوں میں
میں عورت ہوں
میری رگ رگ سے ٹپکا ہے

محبت کا لہو برسوں
میرے قدموں نے طے کئے ہیں
ہزاروں منزلیں غم کی
میں عورت ہوں
میرے ہاتھوں میں ریشم ہے
میرے پاؤں میں زنجیریں
میری قسمت میں تعذیریں
یہ میری زندگی کا کردار ہے
ماؤں کا بہنوں کا
میں عورت ہوں
میں بیٹی ہوں
جنم دیتی ہوں بیٹوں کو
میں کانٹے چنتی رہتی ہوں
مگر پھولوں کی عاشق ہوں
حکایت ہو شکایت ہو
وہ میرے دل کی دھڑکن ہے
میں عورت ہوں
میں سب کی دوست ہوں مانا
مگر اپنی ہی دشمن ہوں
ہے سایوں کی طرح
گہرے اندھیروں میں سفر میرا
میں عورت ہوں اگر یہ جرم ہے
جو جرم فطرت ہے
کہو میرا گناہ کیا ہے

☆

سیفی سرونجی کے تبصرے

کتاب کا نام: نالہ درد
شاعر: بشیر احمد بشیر

بشیر احمد بشیر مشہور شاعر نشاط کشتواڑی کے صاحبزادے ہیں، جو اپنے والد مرحوم کے صحیح جانشین ہیں کہ انھوں نے اپنے والد کی وراثت کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ ان کے نقش قدم پر چل کر کئی شعری مجموعے تخلیق کئے۔ ان کی ایک کتاب ''نوید سحر'' پر بہت پہلے انتساب میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ اس وقت میرے سامنے ان کی نظموں کا مجموعہ ''نالہ درد'' ہے۔ جو ۳۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب پر لکھنے سے پہلے چند باتیں کرنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے عہد کا شاعر اتنا سہل پسند ہو گیا ہے کہ پابند نظم کہنے میں اسے پسینے چھوٹتے ہیں۔ اس لئے اپنی سہل پسندی میں مہارت کی وجہ سے شاعری میں ایسے تجربات زیادہ کرتا ہے، جس میں بحر، وزن کی مشقت سے بچا جا سکے۔ اس طرح رفتہ رفتہ پابند نظم کہنے والے شاعر اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ جن میں شعریت دور دور تک نظر نہیں آتی۔ قابل مبارکباد ہیں وہ شاعر۔ جو پابند نظم کے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہیں، ان میں ایک نمایاں نام بشیر احمد بشیر کا ہے۔ ''نالہ درد'' ان کی نظموں پر مشتمل ہے۔ مختلف موضوعات پر ان کی یہ نظمیں ان کا واقعی ادبی کارنامہ ہے۔ محبت، مناجات، دور حاضر کی تعریف، درد دل، خون عدل، سراب اور حقیقت، وقت، زندگی اور توکل، آئین فطرت، اے دل مضطر، حقیقت، روز محشر جیسے سیکڑوں عنوانات پر ایک سے بڑھ کر ایک نظم موجود ہے۔ ایک سچے حق پرست تخلیق کار کے دل میں جس طرح کے خیالات آتے ہیں۔ وہ تمام ان کی نظموں میں موجود ہیں۔ حسن اخلاق، تہذیب وتمدن، انسانیت کا سبق، اور حالات حاضرہ کی مکمل تصویریں ان کی ایک ایک نظم میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہاں ایک نظم محبت کے چند شعر پیش کر رہا ہوں۔

محبت زندگی کی ابتدا ہے
یہی ہر ابتدا کی انتہا ہے
محبت حاصل ہر دوسرا ہے
یہی سوز دروں کا مدعا ہے

اسی سے بزم عالم پر فضا ہے

محبت کی کشش شمس وقمر میں
محبت کی خلش قلب وجگر میں
محبت کا ثمر ہے ہر شجر میں
اسی کی داستاں ہے چشم تر میں
یہی علم وعمل کی انتہا ہے

اسی کے دم سے بلبل خوشنوا ہے
یہی تو اصل میں گل کی ادا ہے
حقیقت میں یہی صدق وصفا ہے
یہی درد جگر کی اک دوا ہے
محبت جو نہیں پھر کیا مزا ہے

یہ بشیر احمد بشیر کی وہ نظم ہے، جس سے کہ پوری کائنات جگ مگا رہی ہے۔ معنی محبت، اگر محبت نہ ہوتو یہ دنیا بے رونق ہوجائے۔ محبت سے زندگی میں خوشیاں، امیدیں اور دل روشن رہتا ہے۔ ورنہ یہ دنیا تاریک ہوجائے۔ محبت کے ہزاروں رنگ ہیں اور بشیر احمد بشیر نے اس نظم میں محبت کے سب رنگ پیش کردئے ہیں۔ اسی طرح ان کی دیگر نظمیں ہیں۔ جن میں ہر رنگ موجود ہے۔ محبت کے علاوہ اخلاق کردار، قومی یکجہتی، عقل، جنگ، جبر وتشدد، عمل صالح جیسے کئی موضوعات پر ان کی نظمیں موجود ہیں۔ اور تعریف کی بات یہ ہے کہ نظموں میں روانی ہے۔ نرم ونازک الفاظ سے انھوں نے اپنی نظموں میں جو تازگی پیدا کی ہے۔ وہ قابل تعریف ہے۔ ویسے بھی انھیں شاعری وراثت میں ملی ہے، اسی لئے زبان وبیان پر انھیں عبور حاصل ہے۔ جس ادبی ماحول میں ان کی تربیت ہوئی ہے۔ وہ ان کے ادبی مستقبل کو روشن کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ ایک استاد شاعر نشاط کشتواڑی کے فرزند ہیں، بچپن ہی سے شعروادب کی محفلوں میں بیٹھے ہیں۔ اس لئے فن شاعری سے نہ صرف واقفیت رکھتے ہیں بلکہ فن میں مہارت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ایک ساتھ پانچ شعری مجموعے آئے ہیں، میں نے ان کی صرف ایک کتاب ''نالہ درد'' پر اظہار خیال کیا ہے۔ باقی پر آئندہ کبھی گفتگو کروں گا۔

☆

کتاب کا نام : تجلیات حمد ونعت

شاعر: امان خاں دلؔ

ناشر: مرین ڈرائیو، نیویارک امریکہ

نیویارک میں مقیم حمد ونعت کے مشہور شاعر امان خاں دلؔ کا حمد ونعت پر مشتمل مجموعہ تجلیات حمد ونعت کی اشاعت امریکہ جیسے ملک میں ہوئی۔ دین وایمان کی رمق پیدا کرنے والا، دلوں میں اللہ اور رسول سے تعلق کے جذبات کو پیدا کرنے والا ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جسے دیکھ کر اور پڑھ کر واقعی دل عشق رسول کے جذبات سے سرشار ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی امان خاں دل کی حمد ونعتیں ایک عرصے سے ہندوستانی پاکستانی رسائل میں شائع ہوتی رہیں اور وہ حمد ونعت کے بہترین شعراء میں شمار کئے جاتے رہے ہیں۔ اب ایک ساتھ حمد ونعت کا انتخاب کتابی شکل میں 'تجلیات حمد ونعت' کے عنوان سے آیا ہے۔ اس کتاب میں ان کی ایسی ایسی شاہکار چیزیں شامل ہیں کہ جنھیں پڑھ کر دل میں جذبات کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ دوسو آٹھ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ امریکہ سے ہی شائع ہوا ہے، جو خوبصورت آرٹ پیپر پر ہے۔ تجلیات حمد ونعت میں شامل نعتیں اور حمدیں ہمارے دلوں کو تجلیات، نور کی کرنوں سے بھر دیتی ہیں۔ یہاں چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

یارب ترے کمال کا کیسے شمار ہو
حد ہی نہیں ہے جب ترے کمال کی

شاید اس ادا پہ خدا بخش دے مجھے
روز حساب فکر ہے اپنے مآل کی

رزق حرام کی کبھی اے دلؔ طلب نہ ہو
تاعمر دے خدا مجھے رزق حلال کی

اس کے کرم کا حشر میں ہے آسرا مجھے
نادم ہوں میں گناہ پہ بخشے خدا مجھے

مجھ میں ہنر کہاں کہ کروں میں تری ثنا
یہ تو شعور تو نے کیا ہے عطا مجھے

ذرہ خورشید بنانے والا
تو ہی رحمت کا خزانہ ہے لٹانے والا

تیرے قابو میں ہے ذی روح کا جینا مرنا
مارنے والا بھی تو ، تو ہی جلانے والا

نعتیہ

آپ خلق خدا میں یکتا ہیں
سب سے بہتر ہیں سب سے اولیٰ ہیں

بھر دیتے ہیں ہر سوالی کو
ایسے قاسمؐ ایسے داتا ہیں

اوج پر اب ہماری قسمت ہے
ہم پہ آقاؐ کی چشم رحمت ہے

اک وظیفہ درود کا رکھنا
بیٹھتے اٹھتے میری عادت ہے

آپ کی یاد گر نہیں آتی
روشنی دل میں در نہیں آتی

کس قدر بد نصیب ہے جس کو
یاد خیر البشرؐ نہیں آتی

طرف تعلیمی بیداری کا سُر بھی پھونکا جا رہا تھا، جاگیرداری نظام کا خاتمہ اور جمہوریت کا نیا نیا احساس ذہنوں میں تبدیلیوں کا سبب بن رہا تھا۔ اوپندر ناتھ اشک کا قلم بھی اب سماجی سیاسی حالات کو رقم کر رہا تھا چنانچہ ان کے اُس دور کے افسانوی مجموعوں '' عورت کی فطرت'' اور ''ڈاچی'' کا مطالعہ کریں تو ان کے افسانوں میں اصلاحی و اخلاقی رنگ کے ساتھ ہی ساتھ ملک کی آزادی کے بعد کے دس بارہ برس کے سماجی و سیاسی حالات کی عکاسی صاف نظر آتی ہے۔ اب وہ افسانے میں پلاٹ اور واقعات کو بڑی اہمیت دینے لگے تھے۔ جزئیات نگاری اور زندگی کی حقیقتوں پر زور دینے لگے تھے۔ اس دور کے اُن کے افسانوں میں '' کونپل، قفس، چٹان، چیتن کی ماں'' میں عورتوں کی بے بسی اور اُن کی سماجی نفسیات کا بھرپور رنگ دکھائی دینے لگا تھا۔

سعادت حسن منٹو کے بعد جس افسانہ نگار کی عظمتوں کو سب نے سراہا وہ نام بلاشبہ راجندر سنگھ بیدی کا ہے۔ بیدی نے اپنے افسانوں کے لیے اُن افراد کی طرف دیکھا جن کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ اُن میں وہ خود بھی شامل ہیں، جو چھوٹی موٹی ملازمتوں میں زندگی کے مسائل کا حل اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں بڑی بڑی مسرتوں کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ انسانی رشتوں کو افضل جانتے ہیں اور ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں شریک ہو کر محبت اور اخلاص کا درس دیتے ہیں۔ افسانہ '' گرم کوٹ '' ایک طرح سے اُن کی زندگی ہی کی ایک تصویر ہے جب وہ خود پوسٹ آفیس میں کلرکی کرتے تھے۔ بیدی کے عام سے کردار بھی اپنی سیرت میں اعلیٰ و افضل ہیں۔ اسی طرح بیدی عورت کی ظاہری خوبصورتی پر نہیں بلکہ اُس کے باطن کی خوبیوں کے پارکھ ہیں۔ اُن کی افسانہ نگاری کا نہایت عمدہ جائزہ ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> '' نسوانی زندگی بیدی کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ لیکن یہ عورت اُن کے اعصاب پر سوار نہیں ہو جاتی۔ اُن کے یہاں کرشن چندر کی طرح عورت کا بڑا پاکیزہ اور لطیف تصور ملتا ہے۔ لیکن کرشن چندر کے یہاں عورت سرتاپا حسن ہے اور بیدی کے یہاں مجسم سیرت، کرشن کی نظر اُس کے خوبصورت جسم پر ہے اور بیدی کی نظر اُس کی روح پر، کرشن اُسے رومانی فضاؤں کے پس منظر میں پیش کرتے ہیں اور بیدی انسانی رشتوں کے پس منظر میں اُس کی سیرت کے حسن کو اُجاگر کرتے ہیں۔'' اپنے دکھ مجھے دے دو'' کی اندو، نازک رشتوں میں بندھی روایتی ہندوستانی عورت کی سچی تصویر ہے۔ جسے بچپن ہی سے غلامانہ سپُردگی کی تربیت ملی ہے۔ مہر و وفا، ایثار و قربانیکی یہ مورت ہر کسی کے دکھ بانٹتی ہے لیکن اُس کے اپنے دکھوں کا بوجھ ہلکا کرنے والا کوئی

شعر کہنے کا فائدہ کیا دل
نعت گوئی اگر نہیں آتی

ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امان خاں دل کا دل عشق رسول کے جذبات میں کتنا ڈوبا ہوا ہے کہ لفظ لفظ سے ان کی حضورؐ سے عقیدت عیاں ہے، ویسے بھی نعت لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ اس میں ذرا سی چوک سے معنی کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ نعت میں بہت احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ حمد کا تو ایسا ہے کہ خدا کا اور اس کا معاملہ ہوتا ہے لیکن نعت ایک نازک فن ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو امان خاں دلؔ نے نعت اور حمد کے فن میں ہر احتیاط سے کام لیا ہے اور اپنی عقیدت کا اظہار حضورؐ کے شایان شان کیا ہے۔ جہاں ایک طرف انھوں نے خدا کی عظمت اور اس کے بے شمار احسانوں کو یاد کرتے ہوئے خدا سے رحم وکرم کی درخواست کی ہے کہ اے خدا تو ایسا رزق دینے والا ہے، جہاں کو پالنے والا ہے، مجھ پر بھی اپنا لطف وکرم کردے اور مجھے حلال روزی عطا فرما۔ میرے گناہ بخش دے تو ہی رحمت کا خزانہ لٹانے والا ہے، جینا مرنا سب کچھ تیرے ہی اختیار میں ہے، اسی طرح نعتوں میں امان خاں دلؔ نے حضور اکرمؐ کے اوصاف بیان کئے ہیں کہ آپ خلق خدا میں یکتا ہیں، آپ کے در سے کوئی سوالی خالی نہیں جاتا۔ میری جھولی بھی بھر دیں۔ آپ کی چشم رحمت کا میں بھی طلبگار ہوں اور پھر شاعر نے ایک اور خوبصورت بات کہی ہے کہ اے خدا تو نے مجھے شاعری جیسا عظیم ہنر بخشا ہے لیکن وہ ہنر ہی کیا جب تک کہ نعت کہنے کا ہنر نہ ہو۔ شعر کہنے کا کیا فائدہ۔ اس طرح امان خاں دلؔ نے اپنے وسیلہ اظہار کے لئے اپنی شاعری کو صرف حمد ونعت کہنے کے لئے وقف کر دیا اور بڑی تعداد میں حمدیں اور نعتیں کہیں۔ جو کئی برسوں سے دنیا کے مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہیں اور اب کتابی شکل میں 'تجلیات حمد ونعت' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ امان خاں دلؔ کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ وہ امریکہ میں رہ کر اللہ اور اس کے رسول سے اپنی محبتوں کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ جہاں نئی نئی ایجادوں اور ننگے پن کی انتہا ہے، جہاں اپنے ایمان کو بچانا بھی مشکل ہے۔ وہاں رہ کر ایمان کی رمق اور دین حق پر چلنے والوں کے لئے حمد ونعت کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے امان خاں دلؔ واقعی بڑا کام کر رہے ہیں۔ یقیناً خدا ان کے اس کام سے خوش ہوگا اور یہی کارنامہ ان کی نجات کا وسیلہ بھی بنے گا۔ آخر میں اپنی پسند کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

تو جسے چاہے خدا یا اسے عزت بخشے
تو ہی عزت کا ہے پل بھر میں مٹانے والا

الٰہی خوشنمائی سے سجایا یہ جہاں تو نے
نجوم وکہکشاں شمس وقمر سے آسماں تو نے

ترے فضل وکرم سے ہی ہمیں ادراک ہستی ہے
ہمیں مخلوق میں اشرف بنایا بے گماں تو نے

ہمارے دل کی دھڑکن سے ترے فضل سے جاری
نظام گلشن ہستی کو بخشی ہے اماں تو نے

صلہ محنت کا سب کو ملتا آرہا ہے سب کو دنیا میں
نہیں کی ہے کبھی محنت کسی کی رائیگاں تو نے

☆

کتاب کا نام : سانس لیتا شہر
شاعر: مہدی پرتاب گڑھی
ناشر: مکتبہ الفاروق دہلی

مہدی پرتاب گڑھی محتاج تعارف نہیں کہ پچھلے چالیس پچاس برسوں سے وہ مسلسل ہندوستان، پاکستان، لندن، امریکہ کے تمام رسائل میں پابندی کے ساتھ شائع ہورہے ہیں۔ 'سانس لیتا شہر' ان کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ جس میں فلیپ پر ڈاکٹر سراج اجملی، پروفیسر شہپر رسول، ثمینہ تابش کی رائے شامل ہیں۔ مقدمہ ڈکٹر تابش مہدی نے تحریر کیا ہے اور سید ارشد حیدر نے شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ 'سانس لیتا شہر' میں مہدی پرتاب گڑھی کی دوسو کے قریب غزلیں ہیں۔ یوں تو مختلف رسائل میں ان کا کلام نظر سے گزرتا رہا ہے لیکن شاعر کا پورا قد اس کے شعری مجموعے کو دیکھ کر اور پڑھ کر ہی سامنے آتا ہے اور اس کی شخصیت کھلتی ہے۔ مہدی پرتاب گڑھی چونکہ ایک استاد شاعر ہیں، زبان وبیان پر انھیں عبور حاصل ہے۔ رہا سوال جدید وقدیم کا تو مہدی پرتاب گڑھی جدیدیت یا مابعد جدیدیت یا کسی اور لیبل کے قائل نہیں ہیں۔ نہ وہ ان تحریکات سے واسطہ رکھتے ہیں۔ صرف اپنے فن پر اعتماد کرتے ہیں۔ اہتمام سے چھپتے ہیں اور اعتماد سے کہتے ہیں۔ اسی لئے ان کی شاعری کو جدید

وقدیم کے خانوں میں تقسیم کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر شہپر رسول نے جس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے:

''مہدی پرتاب گڑھی کی شاعری کو جدید قدیم کے خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ ان کا کلام نہ تو قطعاً روایتی ہے اور نہ انتہائی جدید۔ ایک متوازن کیفیت تفکر کی دھیمی دھیمی آنچ اور ہلکی ہلکی فضا ان کی غزل کے امتیازات میں شامل ہے۔ یوں بھی شاعری کے لئے قدیم جدید کی کوئی شرط نہیں ہے۔ شعری اظہار کا پرخلوص اور سچا ہونا ضروری ہے۔''

بس یہی بات مہدی پرتاب گڑھی میں خصوصیت سے پائی جاتی ہے۔ یعنی پرخلوص اور سچا اظہار مہدی پرتاب گڑھی نے روایت کا احترام کرتے ہوئے اپنی شاعری میں نئے خیالات اور سچا پیرایہ اظہار کو اپنا وسیلہ بنایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

میں نے کب چاہا ہے مجھے خدائی دے
بچھڑ گیا ہے جو مجھ سے وہ بھائی دے

مقابلے کی قوت مجھکو بھی مل جائے
ظالم کو اللہ جو سخت کلائی دے

ترک رسوم وترک روایات کر گئے
خاموش رہ کے کتنی بڑی بات کہہ گئے

حصار ذات سے باہر بھی ایک دنیا ہے
جہاں یہ دست عمل کا جمال نکھرا ہے

نئے نجوم ، نئے آفتاب چاہتا ہے
مرا شعور کوئی انقلاب چاہتا ہے

بلند اتنا ہو میری پسند کا معیار
جو تجھ سے بڑھ کے کوئی انتخاب چاہتا ہے

کبھی تو بچوں کے چہروں پر ہو شفق روشن
غریب خوابوں کا اپنے حساب چاہتا ہے

میں زندگی کی تدابیر کرتا رہتا ہوں
کہ آرزوؤں کو زنجیر کرتا رہتا ہوں

ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مہدی پرتاب گڑھی کو بات کرنے کا سلیقہ بھی ہے اور ہنر بھی۔ ایک تو ان کی شاعری گنجلک یا مہمل یا کسی نئے تجربے سے پاک ہے۔ دوسرے ان کے خیالات نظریات میں ایک سچے انسان پرست ہونے کی وجہ سے اعلیٰ اخلاق و کردار کی جھلکیاں صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری سے انسان دوستی کے پیغام کو زیادہ اہمیت دی ہے اور نئی نسل کے لئے اپنے تجربات سے آشنا کرایا ہے۔ زندگی کی تلخ سچائیوں کو پیش کیا ہے اور پھر سادہ زبان میں دل پر اثر کرنے والی شاعری سے زیادہ سے زیادہ پڑھنے والا حلقہ پیدا کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کھڑکیاں کھول دو ہوا آئے
کوئی پیغام زیست کا آئے

ہم کو شاداب زندگی کو ہو عطا
لب پہ آئے تو یہ دعا آئے

خانۂ دل کو کعبہ بنا لو
اس مکاں سے بتوں کو نکالو

اجلے کپڑوں سے تن ڈھانکنا کیا
ذہن ودل کو بھی اپنے اجالو

ہو نہ اقدار کی پائمالی
حریت آدمیت بچا لو

زیست جب سخت جاں نکلتی ہے
ریگ پر بھی یہ ناؤ چلتی ہے

عہد طفلی ، شباب اور پیری
زندگی کتنے گھر بدلتی ہے

میں زیر بار مسائل سہی مگر مہدی
مجھے تو ذوق جنوں شاداں بناتا ہے

نام خدا کا لکھتا ہوں ، میں پانی پر
دنیا ہنستی ہے ، میری نادانی پر

مہدی پرتاب گڑھی کے کئی شعر تو سہل ممتنع کی مثال کہے جاسکتے ہیں ۔ان کے یہاں زندگی جینے کا حوصلہ بھی ہے اور عہد طفلی سے لے کر شباب اور پیری تک کے تجربات بھی ہیں ۔ایمان کو تازہ کرنے والے خیالات بھی ہیں ۔ان کی شاعری میں سانس لیتا شہر نہیں بلکہ سانس لیتی انسانیت بھی ہے، جو گھٹن کا شکار ہے۔

☆

کتاب کا نام : اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی
مصنف : ڈاکٹر شفق سوپوری
ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی

ڈاکٹر شفق سوپوری بحیثیت شاعر محتاج تعارف نہیں کہ وہ اپنی پہچان ایک اچھے معتبر شاعر کے روپ میں برسوں پہلے قائم کر چکے ہیں لیکن شاعری کے علاوہ انہیں زبان و بیان اور علم عروض سے لے کر فن موسیقی پر بھی عبور حاصل ہے اور اس موضوع پر ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں ۔موسیقی میں مہارت رکھنے کی وجہ سے وہ اردو غزل کے مزاج کو بھی خوب سمجھتے ہیں ۔زبان کی باریکیاں اور اس کی نازک فنی خوبیوں سے نہ صرف واقفیت رکھتے ہیں بلکہ اس موضوع پر برسوں لکھتے بھی رہے ہیں ۔اور غزل اور ہندوستانی موسیقی پر وہ پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور اب ان کی تازہ کتاب

اس موضوع پر آئی ہے، جس پر شمس الرحمٰن فاروقی جیسے نامور نقاد نے بہت جامع مقدمہ لکھا ہے، جو کتاب میں شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے نوجوانوں میں شفق سوپوری تنہا ہیں جو ان موضوعات پر غور وخوض کرتے ہیں، ان کی ایک کتاب شاعری موسیقی لسانیات کچھ دن پہلے شائع ہوئی تھی اور وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے کچھ مسائل بھی اٹھائے ہیں۔ خاص کر غزل کے بعض شعراء نے جو بحریں برتی ہیں۔ ان کا تجزیہ ان کی ردیفوں کا تجزیہ ان پس آمد اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مشہور مصنفوں کی گائی ہوئی غزلوں کی فہرست اور اس راگ کی ضرورت جس میں وہ غزل گائی گئی ہے۔ ان معلومات نے اس کتاب کو بہت قیمتی بنا دیا ہے۔''

ڈاکٹر شفق سوپوری نے اس کتاب میں اردو غزل موسیقی کے ذریعہ ہندوستانی موسیقی پر ہی نہیں ہندوستانی تہذیب کا بھی احاطہ کرلیا ہے، اس لئے کہ راگ راگنی ہندوستانی تہذیب کی ہی دین ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر شفق سوپوری کی یہ کتاب اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی پر ہی نہیں ہندوستانی تہذیب کو بھی پیش کرتی ہے۔ انھوں نے ہمارے اساتذہ کے کلام کو عروض اور موسیقی کے حوالے سے جو تجزیہ کیا ہے، وہ واقعی قابل تحسین ہے۔ ہمارے سرونج کے مشہور شاعر شاہد میر نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے لیکن جتنی تفصیل اور تحقیق کے بعد ڈاکٹر شفق سوپوری نے لکھا ہے۔ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ شفق سوپوری اس کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اردو غزل کے صنفی اور فنی سانچے کی تشکیل میں اہم تہذیبوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے، عربی تہذیب، ایرانی تہذیب، اور ہندوستانی تہذیب اردو غزل پر اگرچہ فارسی کا بہت گہرا اثر ہے مگر پھر بھی یہ کسی بھی لحاظ سے فارسی کا چربہ نہیں۔ ہندوستانی تہذیب کا ایک جلوہ صد رنگ ہونے کی وجہ سے اس میں لوگ گیتوں کی روایت کے ساتھ ساتھ یہاں کے ثقافتی تمدنی اور فنی مظاہر کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔''

ڈاکٹر شفق سوپوری کا اس کتاب میں سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ انھوں نے اردو غزل اور موسیقی کے حوالے سے ہندوستانی تہذیب کو اجاگر کیا ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کو واضح کیا ہے۔ یہ ایک بڑے اور سچے محقق ہونے کا ثبوت ہے کہ اس نے اپنے وطن عزیز کی تہذیب کو اعلیٰ سطح اعلیٰ پیمانے پر اپنے گہرے مطالعے مشاہدے کے ذریعے نمایاں کیا۔ جس موضوع کو چھونے کی بھی لوگ جرأت نہیں کرتے، اس موضوع پر شفق سوپوری نے اتنا کچھ لکھا کہ ادب کی تاریخ میں وہ ہمیشہ

اس حوالے سے زندہ رہیں گے۔

☆

کتاب کا نام : نور حرا
شاعر : سید نفیس دسنوی

ناشر: ادبی محاذ کٹک، اڑیسہ

سید نفیس دسنوی کا تازہ شعری مجموعہ 'نور حرا' حمد ونعت پر مشتمل ہے۔ جس میں فلیپ پر شکیل الرحمن، سید شکیل دسنوی کی جامع رائے کے ساتھ ساتھ پروفیسر کرامت علی کرامت، سعید رحمانی، رؤف خیر، شارق عدیل کے مضامین بھی شامل ہیں۔ میں ان کی رائے سے اجتناب کرتے ہوئے سید نفیس دسنوی کے کلام پر گفتگو کرتا ہوں کہ ایک شاعر کا سب سے بڑا تعارف اس کی اپنی تخلیق ہوتی ہے۔ سید نفیس دسنوی چونکہ غزل کے بھی اچھے شاعر ہیں۔ میں نے اکثر ان کی غزلیں مختلف رسائل میں پڑھی ہیں، شاعر کے یہاں یہ خوبی ہے کہ وہ فوراً پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے، ہزاروں شاعروں کی بھیڑ میں اگر کوئی بھی شاعر پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتا ہے تو یقیناً اس کے کلام میں کچھ انفرادیت اور جان ہوتی ہے۔ نفیس دسنوی کا یہ مجموعہ جو کہ حمد ونعت پر مشتمل ہے، دلوں میں اللہ اور اس کے رسول سے عقیدت ومحبت کے جذبات دلوں میں نہ صرف بیدار کرتا ہے بلکہ ہمیں ایک ایسی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جہاں پر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر صرف عشق رسول کے جذبے سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ یہاں چند شعر پیش کرتا ہوں۔

اس کی تجلیوں پہ نظر کیا مجال ہے
بے مثل اس کا وصف جلال وجمال ہے

فانی ہر ایک چیز ہے اس کائنات میں
وہ ذات لاشریک وہی لازوال ہے

کرتا ہے شہہ نواز بھی وہ ایک فقیر کو
ادنیٰ کو اعلیٰ کرنا اس کا کمال ہے

کرتی ہے مرے دل کو معطر اس کی یاد
اس کا خیال جیسے مہکتا گلاب ہے

حمد وثنا میں کیسی ہے یہ کیفیت نفیسؔ
روشن اسی کے نام سے دل کی کتاب ہے

یوں تو خدا کی تعریف تمام دنیا کے انسان تاعمر کریں تب بھی اس کے احسانوں کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن ایک اچھے سچے شاعر کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے اس مالک کا شکر ضرور ادا کرے، جس نے اسے شاعری جیسا عظیم ہنر بخشا، اس لئے ہر شاعر اپنی نجات کے لئے حمد ونعت ضرور کہتا ہے۔ سید نفیس دسنوی نے بھی اپنے مالک اور حضورؐ کی شان میں اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا ہے اور تعریف کی بات یہ ہے کہ حمد میں کس طرح کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں اور نعت میں کیسے اس کا انھوں نے پورا خیال رکھا ہے، اس لئے کہ نعت کا فن بہت نازک ہوتا ہے، اس میں ذرا سی چوک سے معنی کچھ کے کچھ ہوجاتے ہیں۔ نفیس دسنوی نے بہت احتیاط سے کام لیتے ہوئے بہت خوبصورت نعتیں کہیں ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

اعلیٰ بہت ہمارے نبیؐ کا مقام ہے
نام خدا کے بعد محمدؐ کا نام ہے

یہ شان بھی ہے سرور دوجہاں کی
سلطان وقت بھی تو انھیں کا غلام ہے

پاتے ہیں ان سے فیض اجالوں کا سب نفیسؔ
ان کا ہی نور وادی شمس وقمر میں ہے

نعت نبیؐ کے جذبے سے مغلوب ہوں نفیسؔ
میں نے بھی شاعری کا وطیرہ بدل دیا

ہوتا نہیں دھوپ کا احساس ہی نفیسؔ

چادر تنی ہوئی ہے محمدؐ کے شہر میں

دل تڑپنے لگا میں مدینے چلا
رب نے سن لی دعا میں مدینے چلا

مجھ کو آخر بلاوا وہاں سے ملا
مل گیا مدعا میں مدینے چلا

ہر مرض کے لئے خاک اسیر ہے
ہے وہ درد شفا میں مدینے چلا

خیر مقدم کو تیرے نفیسؔ آئی ہے
خود ہی باد صبا میں مدینے چلا

سید نفیس دسنوی کی اس نعت میں گویا مدینے کی خوشبو سی بسی ہے کہ نعت پڑھتے ہوئے دل مدینے کی طرف کھینچا چلا جاتا ہے اور اس نعت میں اتنی تاثیر پیدا ہوگئی ہے اور کیوں نہ ہو بات جب دل سے نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے۔ میں نے ابھی ابھی پڑھا ہے کہ نفیس دسنوی صاحب اس سال حج کو جارہے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ بلاوا آتے ہی یہ کیفیت سے بھرپور نعت انھوں نے کہی ہے۔ جس میں ان کے دل کی کیفیت لفظ لفظ سے عیاں ہے اور خدا نے انھیں شاید اسی نعت کی وجہ سے مدینے بلا لیا کہ یہ ان کے دل سے نکلی ہوئی صدا ہے۔ ظاہر ہے حمد و نعت کا معاملہ صرف دل سے ہوتا ہے۔ جب تک دل میں اللہ اور اس کے رسول سے عشق کا جذبہ مکمل طور پر بیدار نہ ہو۔ نعت اور حمد نہیں کہی جاسکتی۔ بس خدا کی یاد اور نبیؐ سے عشق ہی اچھی نعتیں اور حمد کی تخلیق کا سبب بنتی ہیں اور نفیس دسنوی ایک اچھے صاف گو انسان ہیں کہ انھوں نے حمد و نعت پر مشتمل اتنا خوبصورت مجموعہ پیش کیا۔

☆

کتاب کا نام : عشق ہے

شاعر : شہباز ندیم ضیائی

ناشر: شہباز ندیم

80 کے بعد جن شاعروں نے اپنی شناخت قائم کی ہے اور ایک جہان کو متوجہ کیا ہے، ان میں ایک نمایاں نام شہباز ندیم ضیائی کا ہے۔ جن کے نام کے ذکر کے بغیر نئی غزل پر گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ شہباز ندیم دہلی کی سرزمین میں خالص دہلوی لہجے کے منفرد شاعر ہیں۔ 'عشق ہے' سے پہلے ہی وہ کئی شعری مجموعے پیش کر چکے ہیں۔ جن پر دہلی اردو اکیڈمی سے انعام مل چکے ہیں۔ مثلاً جذبوں کی زبان، شہباز، وصال موسم معجزہ، اک چراغ تنہا سا، خوشبو چہرہ وغیرہ۔ 'عشق ہے' ان کا نیا شعری مجموعہ ہے، جو ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے، ان کی غزلوں میں زندگی کے تلخ تجربات کو بہت سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ شعری پیکر میں پیش کیا گیا ہے، شہباز ندیم کو زبان پر قدرت حاصل ہے، زبان کی باریکیاں اور نزاکت سے وہ واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے شعروں میں جہاں فکر کی گہرائی ہے، وہیں دوسری طرف انھوں نے تازگی کو بھی برقرار رکھا ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

چادر میں چاند ستارے بند ہوئے
سارے روشن منظرنامے بند ہوئے

نظر آئے ہر اک بینا کو منظر کچھ الگ سا
بنائیں دشت کے سینے میں ہم گھر کچھ الگ سا

بے نیازی نہ برت بسر بیٹھا ہوں
زندگی دیکھ ذرا میں بھی ادھر بیٹھا ہوں

وقت کی طرح سفر میں ہوں مسلسل میں بھی
اپنے حالات سے کب ہار کے گھر بیٹھا ہوں

جانے کس پل کسی تلوار کی زد میں آجائے
میں جو شانوں پہ سجائے ہوئے سر بیٹھا ہوں

اپنی غزلوں کی فضاؤں میں معانی کی طرح
ہے مرے دل کی تمنا اسے لفظوں میں بساؤں

نہیں ہے۔''

(کتاب۔اردو مختصر افسانہ: فنی و تکنیکی مطالعہ۔ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان۔ص۔۱۱۰)

بیدی شعوری طور پر اپنے افسانوں میں مقامی رنگ پیدا کرتے تھے اس کی خاطر اُنھوں نے ہندو میتھالوجی، اساطیر اور دیومالائی روایتوں سے خوب کام لیا ہے۔اُن کے بہترین افسانوں میں، گرم کوٹ، لاجونتی، دیوالہ، اپنے دکھ مجھے دے دو وغیرہ کی ایک طویل فہرست ہے۔

بلونت سنگھ اور احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ دونوں نے پنجاب کے دیہات اور پنجابی افراد کی زندگیوں پر افسانے لکھے ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں میں فرق ہے۔احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کے مسلمانوں پر تو بلونت سنگھ نے سکھوں کی زندگی پر، دونوں کے کردار زمین پر چلتے پھرتے انسان ہیں۔قاسمی کا لہجہ نرم اور شگفتہ ہے تو بلونت سنگھ کے کردار مزاج کے کھردرے پن کے باوجود اندرون میں آبادمحبت کی دبی چنگاریوں کو باہر لاتے ہیں۔ بلونت سنگھ کو کرداروں کا افسانہ نگار بھی کہا جاتا ہے۔گرنیل سنگھ، بابا مہنگا سنگھ، جگا، گُرنام، گھکی، ایسے بے شمار زندہ کردار اُنھوں نے اردو قاری کو دیئے ہیں۔اُن کے رومانی افسانوں میں بھی ایک طرح کا کھردراپن ہے۔بے باکی ہے۔افسانہ ''جگا'' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

'' مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا، اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا،'' تیرا نام کیا ہے؟

'' دوشیزہ کی آنکھیں پُرآب ہوگئیں، بولی،'' گُرنام۔'' '' تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟''

'' میری ماں ہے، بے بے، ویر، چاچا، باپو سب ہی رہتے ہیں۔''

'' مجھے اپنے گھر لے چل۔'' مرد نے اُس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

'' مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔''

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں، اُس نے اپنی دلہن کی طرح آراستہ ساڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجے میں پوچھا،'' کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو؟''

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سرخ ہوگیا۔''

اس اقتباس میں آپ نے محسوس کیا ہوگا، مرد کے دل میں لڑکی کو دیکھ کر گدگدی تو پیدا ہوئی

بولتا کچھ نہیں خاموش رہا کرتا ہوں
میں سدا خود سے ہم آغوش رہا کرتا ہوں

حرف آنے نہیں دیتا میں انا پر اپنی
نشہ غم میں بھی باہوش رہا کرتا ہوں

فکر تسخیر کروں لفظ پہ قادر ہوجاؤں
اس عمل سے میں گذروں تو شاعر ہوجاؤ ں

بے شک شہباز ندیم لفظ پر قادر ہیں اور شاعری ان کی زندگی ہے اور ہر منظر انھوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ان کا ہر تجربہ اپنا تجربہ ہے۔ زندگی کو انھوں نے قریب سے دیکھا ہے پھر کہیں جا کر شعر چراغ روشن کیا ہے اوپر پیش کئے اشعار کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اچھے شعر کہنے میں کتنی مہارت رکھتے ہیں اور ہر خیال کو شعری پیکر عطا کرتے ہیں۔ اپنی غزلوں کی فضاؤں میں گہری معنویت پیدا کی ہے۔ 'عشق ہے' میں ایسے کئی خوبصورت اشعار موجود ہیں، جنھیں شہباز ندیم کی پہچان کہا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

دنیائے ادب کی ہر دل عزیز شخصیت

نارنگ ساقی کے نام مشاہیر

کے خطوط شائع ہو چکی ہے، جس میں

دنیائے ادب کے تمام اہم قلمکاروں کے

خطوط شامل ہیں۔ ترتیب: سیفی سرونجی

برطانیہ کے مشہور کہانی کار

ترسیم مال

کے افسانوں کا مجموعہ

دھرماتما

انتساب پبلی کیشنز سے شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر مہتاب عالم کا شعری مجموعہ ''منظروں کے درمیان'' منظر عام پر

رضا مراد، سریش کلماڑی، پی۔اے انعامدار کے ہاتھوں رسمِ رونمائی

ڈاکٹر مہتاب عالم، پرنسپل کرسپانڈنٹ چیف، ای ٹی وی اردو، کے حلقۂ احباب کو یہ سن کر انتہائی مسرت ہوگی کہ ان کے شعری مجموعے کی رسم اجرا کی تقریب ءدکن مسلم انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام پونے میں منعقد کی گئی۔

یہ رسم اجراء مشہور و معروف فلمی اداکار رضا مراد، سابق رکن پارلیمان سریش کلماڑی، مہاراشٹرا کاسموپولیٹین ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر پی۔اے انعامدار کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقع پر مشہور فلم اداکار رضا مراد نے کہا'' شاعری اللہ کی دین ہے۔انھیں ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ نے ذوق وصلاحیت سے نوازا ہے۔ مجھے ایسے تقاریب میں آکر احساس کمتری کا احساس ہوتا ہے۔ مہتاب کے کلام سے میں بے انتہا متاثر ہوں۔انہیں شعرائے کرام کی وجہ سے اردو زندہ ہے''۔ڈاکٹر کلیم قیصر، صدر شعبۂ اردو گورکھپور، یونیورسٹی نے مہتاب عالم کے ادبی سفر پر جامع تاثرات پیش کئے۔اور کہا کہ ''نثر کے بعد شعری مجموعے کی اشاعت پر دوہری خوشی ہورہی ہے''۔ چیرمین حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، منور پیر بھائی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا'' مہتاب عالم نے اپنی غزلیات میں زمینی سچائیوں کا ذکر کیا ہے جس سے قاری کو روز سروکار پڑتا ہے''۔صاحب کتاب نے کہا'' شاعری میرا پہلا عشق ہے۔اس کا طالب علمی کے دور سے ہی آغاز ہوا۔آج اس کی پذیرائی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی''۔

''منظروں کے درمیان'' میں اردو ادب کے مشہور ادباو شعراء نے کتاب سے متعلق اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ مشہور شاعر بشر نواز نے کہا'' مہتاب اردو کی تہذیبی روایتوں کا شاعر ہے انکے اکثر اشعار

میں روزمرہ اور ضرب المثل بن جانے کی کافی گنجائش نظر آتی ہے''۔ مشہور کوی نیرج نے کہا '' مہتاب نے اپنی منفرد لفظیات سے اپنے معاصرین میں الگ مقام بنایا ہے۔ شعور کی پختگی، فکر کی گہرائی، تخیل کی بلند پروازی سے ان کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے۔ مہتاب خون جگر سے سینچ کر نہایت مضبوط شعر کہتے ہیں''۔ مشہور و معروف شاعر ضیاء فاروقی نے کہا ''مہتاب کی شاعری میں عصری آگہی اور حسیت ہے اور وہ مشرقی تہذیب کا نمائندہ شاعر ہے''۔ ڈاکٹر سیفی سرونجی نے کہا ''مہتاب کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر ہیں یا اچھے محقق''۔ اسلم چشتی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر مہتاب عالم ہمہ جہت صلاحیتوں کے مالک ہیں ان کی شاعری لمحوں سے آنکھ ملاتی شاعری ہے''۔

یہ شعری مجموعہ ۱۴۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز نعت شریف سے ہوا ہے۔ مہتاب عالم نے اس کا انتساب ممتاز ماہر تعلیم پی۔ اے انعامدار کے نام کیا ہے۔ جن کی محبت اور سرپرستی مہتاب عالم کی زندگی کا بیش قیمتی سرمایہ ہے۔ امید کہ یہ شعری مجموعہ ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

رپورٹ از
عظمیٰ تسنیم صدر شعبۂ اردو عابدہ انعامدار سینئر کالج

☆

سرونج کی تاریخی و ادبی حیثیت پر دو روزہ کل ہند سیمینار

انتساب پبلی کیشن اور سد بھاؤنا منچ کی زیر اہتمام سرونج کی تاریخی و ادبی حیثیت کے مرکزی موضوع پر دو روزہ کل ہند سیمینار منعقد کیا گیا، ابتدائیہ پروگرام میں ڈاکٹر سیفی سرونجی، سینئر جرنلسٹ عبد الصبور خان، صد بھاؤنا منچ کے صدر انل اگروال، محمد متین ندوی اور صابر خاں نے مہمانوں کا ہار پھولوں سے استقبال کیا۔

پہلی نشست میں مشہور نقاد محقق، افسانہ نگار اور شاعر پروفیسر مختار شمیم نے سیمینار کے انعقاد کی اہمیت و افادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے سرونج کی قدامت پر تاریخی حوالوں کے ذریعہ

روشنی ڈالی اور کہا کہ سرونج زمانہ قدیم سے ہی علمی وادبی اعتبار سے زرخیز رہا ہے۔ مختار شمیم نے سرونج کے غیر مسلم شعراء اور ادباء کی ادبی خدمات پر مدلل انداز میں بھرپور روشنی ڈالی۔ دہلی سے تشریف لائے معروف ادیب اور مترجم ڈاکٹر جانکی پرساد شرما نے سرونج کی گنگا جمنی تہذیب کے عنوان پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ قومی یکجہتی کا جو درس موٹی موٹی کتابوں سے حاصل نہیں کیا جاسکتا، وہ سرزمین سرونج میں رہ کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ این سی آر ٹی دہلی کے پروفیسر محمد نعمان خاں نے اپنے مقالہ میں اردو زبان وادب کی اہمیت وافادیت کی وضاحت کرتے ہوئے سرونج کی زبان اور یہاں کے ادب کی خصوصیات پر سیر حاصل معلومات فراہم کیں۔ صدر نشست مولانا غازی ولی احمد ولی چشتی نے اپنے خطاب میں صوفیائے کرام کے سرونج کے قریبی تعلق پر اظہار خیال فرمایا۔

دوسری نشست میں نئی نسل کے فعال ناقد محمد متین ندوی نے 'سرونج کا موجودہ ادبی منظر نامہ' کے عنوان پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''سرونج کے جواد باء وشعراء آفتاب وماہتاب کی شکل میں ادبی دنیا میں اپنا جلوہ بکھیر رہے ہیں، ان میں پروفیسر خالد محمود، پروفیسر مختار شمیم، ڈاکٹر شاہد میر، سیفی سرونجی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ یہ سرونج کے ہی نمائندہ شاعر نہیں ہیں بلکہ یہ نئی غزل کے نمائندہ شعراء میں شمار ہوتے ہیں'' سرونج کے ایک اور مشہور شاعر اور محقق ونقاد ڈاکٹر شان فخری کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے متین ندوی نے کہا کہ'' ڈاکٹر شان فخری صاحب ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ بہت اچھے محقق اور نقاد بھی ہیں، 'سرونج کی ادبی خدمات' نے انھیں ادبی دنیا میں امر بنادیا ہے، کیونکہ سرونج کے ادب پر ان کی کتاب کے حوالے کے بغیر بات نہیں کی جاسکتی'' سیمینار کے ڈائریکٹر ڈاکٹر سیفی سرونجی نے ''مختار شمیم بحیثیت محقق ونقاد'' سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر مختار شمیم صاحب کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر آصف سعید نے ڈاکٹر شاہد میر کی ادبی خدمات کا مفصل تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے کلام میں کلاسیکیت وموسیقیت کا عنصر نمایاں ہے۔ شاہد میر کے یہاں مزاج میں شائستگی، ذہن کی بالیدگی، خوش گفتاری، شیریں کلامی، سبک روی جیسی امتیازی خوبیاں موجود ہونے کے ساتھ ساتھ مشکل زمینوں میں نئی ردیف نئے قوافی کے ساتھ رواں دواں شعر کہنے کا انوکھا ہنر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مند سور سے آئے ریسرچ اسکالر محمد ناظم حسین نے بھی اپنا مقالہ پیش کیا۔ صدر نشست ڈاکٹر شان فخری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ محمود ملک نے انتہائی دلکش انداز میں نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے جہاں مقالہ نگار حضرات کا بہترین طریقہ سے تعارف کرایا، وہیں سرونج کی ادبی حیثیت پر بھی مفید معلومات فراہم کیں۔ سیمینار میں احد پرکاش، رشید انجم، ضیاء فاروقی، (بھوپال) کے علاوہ

معززین شہر بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ جیسے عبدالرشید انصاری، عبدالفیظ عارف، محی الدین انجم، حافظ سردار، محمد نعیم اطہر، اشتیاق قاسمی، سعد قاسمی، ڈاکٹر صادق علی، محمد عزیز خاں ماسٹر، محمد عمر خاں، آفاق سیفی، ڈاکٹر فیضان خان، ایوب رانا، راکیش شرما، برجو مہاراج، سلیمان آزر، صمد اقبال وغیرہ۔

تیسری نشست میں جو شام کو ہوئی اس میں شعری نشست کا اہتمام کیا گیا، اس میں بھوپال سے تشریف لائے ہوئے شاعر ضیاء فاروقی، رشید انجم، احد پرکاش کے علاوہ مقامی شعراء ڈاکٹر شان فخری، ڈاکٹر سیفی سرونجی، محی الدین انجم، ڈاکٹر ظفر سرونجی، سلیمان آزر، اسمٰعیل ساحل، ڈاکٹر صادق علی نادان، معروف گوہر، حنیف درد ایڈوکیٹ، اور نوشے حیدر وغیرہ نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ صدارت کے فرائض پروفیسر محمد نعمان خان نے اور نظامت محمود ملک نے انجام دیئے۔

۲۱ ستمبر ۲۰۱۴ء انتساب پبلی کیشن اور سد بھاؤنا منچ کے زیر اہتمام ''سرونج کی تاریخی و ادبی حیثیت'' کے عنوان سے منعقد ہونے والے دو روزہ کل ہند سیمینار کا دوسرا دن تھا، دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت مشہور محقق اور نقاد پروفیسر مختار شمیم صاحب نے فرمائی اور نظامت کے فرائض محمود ملک نے انجام دئے۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ ڈاکٹر لبنیٰ ادریس صاحبہ نے پڑھا، جس کا عنوان تھا سید احمد مرتضیٰ اور ان کی شاعری، انھوں نے سید مرتضیٰ نظر پر اظہار خیال فرماتے ہوئے کہا کہ سید احمد مرتضیٰ نظر جیسے بلند پایہ محقق، نقاد اور شاعر کو ان کا جائز مقام نہیں ملا، انھیں ادبی دنیا نے نظر انداز کیا۔ لبنیٰ ادریس صاحبہ کا مقالہ مکمل ہونے پر محمد متین ندوی نے محترمہ کی اس بات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس بات میں صداقت ہے کہ انھیں ان کا جائز مقام نہیں ملا، لیکن اگر ادبی دنیا نے انہیں نظر انداز کیا اور انھیں ان کا جائز مقام نہیں دیا، تو اس میں صرف ادبی دنیا کا ہی قصور نہیں ہے بلکہ سب سے بڑا قصور تو ہم اہل سرونج کا ہے کہ ہم نے ان کی ادبی خدمات سے ادبی دنیا کو متعارف نہیں کرایا، جیسا کہ ان کا حق تھا، دوسرا مقالہ دہلی سے تشریف لائے ہوئے مشہور ادیب اور دانشور پروفیسر محمد نعمان خان صاحب نے پڑھا، پروفیسر محمد نعمان خان صاحب نے اپنا مقالہ سرونج کے نامور شاعر ناطق مالوی مرحوم پر پڑھتے ہوئے ناطق مالوی صاحب کی شعری خوبیوں کا تفصیلی ذکر کیا۔ بھوپال سے تشریف لائے ہوئے مشہور ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، اور شاعر رشید انجم صاحب نے ڈاکٹر سیفی سرونجی اور سرونج کی تہذیب اور ثقافت کے عنوان سے مقالہ پڑھا، رشید انجم صاحب کے اس مقالے کو حاضرین نے بطور خاص بہت پسند کیا۔ بھوپال ہی سے تشریف لائے ہوئے ایک نامور صحافی، ادیب اور شاعر احد پرکاش نے وقار فاطمی پر مقالہ پڑھا، اپنے اس مقالے میں انھوں نے وقار فاطمی صاحب مرحوم کی خوبیوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان سے اپنے روابط کا تذکرہ بھی کیا۔ ایسے ہی

بھوپال سے تشریف لائے ہوئے مشہور شاعر اور ادیب ضیاء فاروقی صاحب نے سیفی سرونجی کی آپ بیتی 'یہ تو سچا قصہ ہے' پر مقالہ پیش کیا۔ ان کے علاوہ کئی مقامی حضرات نے بھی مقالے پیش کئے جیسے، سرونجی کے سینئر صحافی عبدالصبور خان نے سرونج کی قومی یکجہتی پر مقالہ پڑھا، ڈاکٹر صادق علی نے سرونج کی قدامت اور اس کی اہمیت پر اپنا مقالہ پیش کیا اور سرونج کے تعلق سے بہت سی ایسی باتیں تاریخی حوالوں سے بتائیں، جن سے عام طور پر لوگ واقف نہیں۔ صدا قبال نے سرونج کے نثر نگاروں اور ماسٹر ارشد حسین نے مذہبی ہم آہنگی اور سرونج کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ماسٹر ارشد حسین نے مذہبی ہم آہنگی پر بہت اچھا اور دلچسپ مقالہ پڑھا، جسے حاضرین نے کیا۔ آخر میں صدر اجلاس پروفیسر مختار شمیم صاحب نے صدارتی کلمات سے نوازا۔ پروفیسر مختار شمیم صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں بطور خاص نئے قلم کاروں کو کچھ تحقیق مضامین کی کچھ اصولی اور بڑی قیمتی باتیں بتلائیں، جیسے انھوں نے کہا کہ مقالہ لکھتے وقت یہ دعویٰ نہیں کرنا چاہئے کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہی باتیں صحیح ہیں، کیونکہ میں نے بغیر حوالے کے کوئی بات نہیں کہی ہے۔ کیونکہ تحقیق کا دراوزہ کھلا ہوا ہے، اسے بند نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرا اجلاس شعری نشست پر مشتمل تھا، اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر شان فخری صاحب نے فرمائی اور نظامت کے فرائض عبدالحفیظ عارف صاحب نے حسن وخوبی کے ساتھ انجام دئے۔ اس شعری نشست میں جن شعراء نے اپنا کلام سنایا، ان کے نام ہیں، ڈاکٹر شان فخری، پروفیسر مختار شمیم، ڈاکٹر سیفی سرونجی، مولانا غازی ولی احمد ولی چشتی، ڈاکٹر ظفر، سلیمان آزر، عظمت دانش، مجاز کوروائی، فیضی کوروائی، اسماعیل ساحل، حامد سرونجی، حنیف درد، ڈاکٹر صادق علی نادان، نوشے حیدر، عزیز فراز، ارشد حسین اور قمر علی قمر وغیرہ۔ اس شعری نشست کا آغاز پروفیسر مختار شمیم صاحب کے نعتیہ قصیدہ سے ہوا اور اختتام صدر نشست ڈاکٹر شان فخری صاحب کے اشعار پر ہوا۔ اخیر میں عبد الحفیظ عارف صاحب نے اس پروگرام کے روح رواں ڈاکٹر سیفی سرونجی اور انل اگروال کی طرف سے تمام شرکا، کا شکریہ ادا کیا۔ (آفاق سیفی) ☆

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو بابا صاحب امبیڈکر نیشنل فیلو شپ ایوارڈ 2014ء

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو ان کی ادبی خدمات پر ۱۳ر اور ۱۴ر دسمبر ۲۰۱۴ء کو اکیڈمی کی تیسویں نیشنل کانفرنس میں دیا جائے گا۔ ساتھ ہی کتاب AKADEMI'S BOOK OF RECORDS میں بایوڈاٹا، تصویر کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔ (انجم) ☆☆☆

خطوط

برادر عزیز ڈاکٹر سیفی سرونجی السلام علیکم

انتساب برابر موصول ہو رہا ہے۔ بے حد شکریہ!

آپ جس خلوص دل اور حسن عمل سے اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں، اس کا جواب نہیں۔

میں آپ کی مزید کامیابیوں کے لئے دعا گو ہوں۔ زیر ترتیب شمارے کے لئے ایک غزل رقم کر رہا ہوں۔

والسلام

آپ کا

حامدی کاشمیری

☆

کرم فرما سیفی صاحب سلام مسنون

تازہ شمارہ بلکہ ایک اور معیاری شمارہ مل گیا ہے۔ شکریہ!

ادھر میں چار پانچ نئی کتابوں میں الجھا ہوا ہوں۔ پھر بھی سوہن راہی پر یہ مختصر مضمون قبول کریں۔ ان کے گیت کے حوالے سے ہے۔ باہر کے ممالک کے قلمکاروں پر مضامین کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ دو تین نئی کتابیں قبول کریں۔

آپ کا ناول مل گیا ہے۔ شکر گذار ہوں، پڑھ لوں تب لکھوں گا۔

''تنقید و تفہیم'' پر آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا ہے، ممنون ہوں۔

امید ہے نغمہ بار ہوں گے۔

خاکسار

مناظر عاشق ہرگانوی

☆

گرامی قدر جناب سیفی سرونجی صاحب السلام علیکم

امید ہے آپ خیر وعافیت سے ہوں گے۔

سہ ماہی 'انتساب' عالمی کا شمارہ نمبر (اپریل تا جون) بہت تاخیر سے ملا تھا۔ کچھ یوں ہوا کہ گذشتہ دنوں کچھ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات اور ادھر اُدھر کے سیمیناروں میں شرکت نے آپ سے مخاطب ہونے کا موقع عطا نہیں کیا۔ معذرت خواہ ہوں۔

'کتابوں کی دنیا' کے تحت آپ نے میری کتاب 'نظام شاہی توپ ساز-محمد بن حسن رومی خان' پر مختصر لیکن جامع تبصرہ کیا، جس کے لئے آپ کا ممنون و متشکر ہوں، امید ہے آپ آئندہ بھی اسی طرح نوازتے رہیں گے۔

تمام مضامین نہایت دلچسپی سے پڑھے۔ ڈاکٹر مشتاق اعظمی نے 'مشاہیر ادب کی باتیں' خوب جمع کیں۔ پرسوں نذیر فتحپوری صاحب سے بات ہوئی تو ان کے مضمون کی تعریف ان سے کی۔ مرحوم اظہر جاوید تھے تو 'تخلیق' میرے پاس پابندی سے آتا تھا اور سرحد پار کی ادبی سرگرمیوں سے واقفیت ہوتی تھی۔ ساقی فاروقی (نارنگ ساقی) سے رابطہ قائم کرتا رہا کہ تخلیق پھر ملے۔ احسن امام احسن نے طہور منصوری نگاہ کے مجموعہ غزلیات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ نگاہ کی رباعیوں کے مجموعے پر میرا تبصرہ اڑیسہ اکیڈمی سے شائع ہوکر 'فروغ ادب' میں شامل ہے۔ کیا ممتاز شیریں واقعی اردو کی پہلی خاتون افسانہ نگار تھیں۔ (۵۸) اس پر آپ کچھ ضرور تحریر فرمائیں۔

افسانے اور شعری حصے کو دیکھ رہا ہوں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ کارِ لائقہ سے یاد فرمائیں۔

آپ کا خیر طلب

اسلم مرزا

Mb:09960053707

☆

محترم و مکرم سیفی صاحب السلام علیکم

طالب خیریت بخیر۔ میں نے ایک دو ماہ قبل اپنے چار مطبوعہ شعری مجموعے نالۂ درد، نوید

سحر، آئینہ حقیقت، اور ندائے حق برائے تبصرہ آپ کی خدمت میں ارسال کئے ہیں۔ان میں سے نوید سحر پر آپ تبصرہ تحریر کر کے مجھے ارسال کر چکے ہیں۔اس کے لئے شکریہ۔امید کہ آپ میرے باقی تین شعری مجموعوں پر بھی تبصرہ تحریر فرمائیں گے۔

بشیر احمد بشیر : جموں کشمیر

☆محترم و معظم سیفی سرونجی صاحب سلام ورحمت

ابھی ابھی آپ کا روانہ کردہ انتساب شمارہ ۹۵ ردستیاب ہوا، رسالہ دیکھ کر دل جھوم اٹھا، کاغذ اور چھپائی انتہائی نفیس ہے۔علاوہ شمارہ بھی دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔

شمارہ آج رات سے پڑھنا شروع کروں گا تو تفصیل سے اپنی رائے دوں گا۔

اس خط کے ساتھ ہی دو تازہ مضامین حاضر ہیں ۔ ۱-غیاث احمد گدی ،۲-قاضی نذر الاسلام ایک عظیم انقلابی شاعر۔قوی امید ہے کہ آئندہ شمارے کے لئے اسے محفوظ فرمالیں گے۔

فقط والسلام

شمس الھدیٰ انصاری (علیگ)

☆

محترم ڈاکٹر سیفی سرونجی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ مع خاندان خیر وعافیت سے ہوں گے۔

پرچے برابر مل رہے ہیں مگر کافی تاخیر ہو رہی ہے کہ ڈاک والے کافی سست ہو گئے ہیں، اور لاپرواہ بھی۔

آپ رسالے کے ذریعہ اردو ادب کی جو خدمت کر رہے ہیں، وہ قابل ستائش ہے ایوب واقف صاحب نے جو آپ کو 'محسن اردو' کا خطاب دیا ہے، وہ نہایت مناسب ہے کہ حق دار کو.....!

آپ شاعری اور نثری حصوں کا جو حق ادا کر رہے ہیں، وہ آپ کی سلیقہ مندی کی ایک روشن مثال ہے۔

حامد لطیف ملتانی قادری

☆

برادرم جناب ڈاکٹر سیفی سرونجی السلام علیکم

امید کہ خیریت سے ہوں گے۔

'انتساب' کے لئے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کا مضمون اور ماہیا گیت، ماہیا نظم

ارسال خدمت ہیں۔ امید کہ آپ کو پسند آئیں گے اور انتساب کی قریبی اشاعت میں شائع فرما کر شکریہ کا موقع بخشیں گے۔ ویسے بھی خاکسار کو انتساب میں شائع ہونے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔

کوثر صدیقی صاحب اور میری رینگا سے متعلق کتاب اس ماہ میں منظر عام پر آجائے گی۔

میں نے 'اردو دوہا' کتابی سلسلہ نمبر: ۱ آپ کو بھیجا تھا۔ اس کا دوسرا شمارہ زیر ترتیب ہے، پہلے شمارے میں آپ کا دوہا گیت شائع ہوا ہے۔ دوسرے شمارے کے لئے دو عدد دوہا غزلیں اسی ماہ میں ارسال فرمادیں۔ مہربانی ہوگی۔ انل اگروال صاحب اور مولانا متین ندوی صاحب، شان فخری صاحب کو میرا سلام کہنا۔

والسلام
مخلص

فراز حامدی

☆

برادر مکرم سیفی سرونجی صاحب تسلیمات

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

عالمی انتساب (اپریل تا جون) موصول ہوا۔ اس پر تاثرات لکھ کر بھیج چکا ہوں۔ عرض خدمت یہ ہے کہ نارنگ ساقی پر آپ کی مرتب کردہ کتاب 'مشاہیر کے خطوط نارنگ ساقی کے نام' مجھے جیسے ہی ملی، اس پر مضمون لکھ کر اس درخواست کے ساتھ ساقی کو بھیج دیا تھا کہ وہ اس کی نقل برائے اشاعت انتساب کو بھیج دیں۔ انہوں نے جہاں فون پر مضمون کی پسندیدگی کا اظہار کیا وہاں یہ بھی کہا کہ وہ بلا تاخیر مضمون کی نقل آپ کو بھیج دیں گے مگر لگتا ہے غیر معمولی مصروفیات کے عالم میں یہ بات ان کے ذہن سے نکل گئی۔

بہر کیف اب یہ مضمون بغرض اشاعت راست طور پر آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ متوقع ہوں کہ مزید تاخیر سے گریز فرمائیں گے۔ اللہ آپ کا اقبال مزید بلند فرمائے۔ آمین!

خیر اندیش

رفیق شاهین

نائب صدر آزرا کیڈمی۔ علی گڑھ

☆

محترم سیفی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

،لیکن وہ عام عاشق کی طرح اُس کے سامنے گھگھیایا نہیں ، نہ اُس نے سرد آہیں بھری، نہ اپنا ہوش کھویا، بلکہ اکھڑ مردانہ لہجے کے سرور ہی میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہی انداز ہے بلونت سنگھ کا۔ اُن کے افسانوں کا ہیرو وہ ٹھیٹھ پنجابی ہے جو پھول ہو یا فولاد اپنے انداز سے قابو پانے کا ہنر جانتا ہے، ان کے بہترین افسانوں میں، جگّا، بابا مہنگا سنگھ، کالے کوس، پہلا پتھر، سورما سنگھ، دیش بھگت، کالی تیتری وغیرہ شامل ہیں۔

کبھی پانی پت بھی پنجاب ہی کا حصّہ تھا۔خواجہ احمد عباس اسی سرزمین سے اُٹھے ہیں۔ صحافت، فلم، اور فکشن اُن کا میدان رہا ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ اردو ادب کو اُنھوں نے ناول، افسانہ، ڈرامہ، مضامین الغرض نثری اصناف سے مالا مال کیا۔ دیگر افسانہ نگاروں کے مقابل خواجہ احمد عباس تحریک کے نظریات کے زیادہ پابند تھے۔ اُن کے موضوعات میں سماجی، معاشرتی حالات، عدم مساوات اور متوسط طبقے کی بھرپور نمائندگی دکھائی دیتی ہے۔افسانہ'' گیہوں اور گلاب'' اس کی بہترین مثال ہے تو افسانہ'' سردار جی'' فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا ایک نہایت لاجواب افسانہ ہے۔ اس افسانے میں طنز کی کاٹ بہت تیز ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس افسانے پر مقدمہ بھی چلا تھا۔خواجہ احمد عباس نے اپنے افسانوں میں تکنیک کے تجربے بھی کیے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کی تحریر میں وہ رس نہیں ہے جو مطالعاتی وصف کو مضبوط بناتا ہے۔

دیویندر ستیارتھی نے اپنی افسانہ نگاری کے ذریعے اردو افسانے کو اسلوب اور مواد کے لحاظ سے ایک نئی جہت عطا کرنے کی کوشش کی ،اس کی خاطر انھوں نے سارے ہندوستان سے لوک گیت، دیومالائی قصّے جمع کیے، اُن سے موضوعات تراشے اور پھر اُنھیں افسانوی قالب میں ڈھالا، اس طرح وہ اپنے ہمعصروں سے مختلف بلکہ قدرے مشکل افسانے لکھ رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک نے نئے موضوعات اور فکر کے دھاروں میں تبدیلیاں پیدا کیں تو ۱۹۵۵ء سے ہی سے بہت سارے تخلیق کار اپنی اپنی سطح پر جدت طرازی کا رُخ اختیار کر رہے تھے۔اسی روشنی میں دیویندر ستیارتھی نے بھی اپنا سفر شروع کیا، اسلوب اور تکنیک کے نئے نئے تجربے کیے، اپنے فن سے صرف چونکایا نہیں بلکہ قاری اور ناقد کو پوری طرح اپنی جانب متوجہ کیا، اُن کے افسانوں میں ایک نہایت انوکھا افسانہ'' لال دھرتی'' ہے۔ اُنھوں نے اس افسانے میں لال رنگ کو بطور علامت استعمال کر کے اُسے زندگی کے مختلف خانوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے مشہور افسانوں میں ،'' ستلج پھر بپھرا، کانگڑی، اور' جوڑا سانکھو' وغیرہ ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانہ پوری شدت کے ساتھ جدیدیت کی سمت رواں دواں ہوا

بخیر ہوں، خدا کرے آپ بھی خیر وعافیت سے ہوں۔ کشمیر میں ملاقات رہی اور اچھی یادوں کے ساتھ ہم اپنے گھروں کو واپس ہوئے، آپ کی محبتوں کا قرض مجھ پہ باقی ہے۔

آفاق سیفی کیسا ہے؟ بہت ہی پیارا ہے۔ اللہ اس کو سلامت رکھے۔ انل بھائی تو آپ کے واقعی دست راست ہیں۔ یہ آپ کا حسن سلوک ہے کہ وہ آپ کے گرویدہ ہیں۔

فقط والسلام

خیر اندیش

مصداق اعظمی

☆

محترم ڈاکٹر سیفی سرونجی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دو روز قبل ڈاک میں محترم نذیر فتح پوری کی خصوصی توجہ وعنایت کی صورت میں آپ کی کتاب 'نذیر فتح پوری کی ادبی فتوحات' کا ایک نسخہ ملا۔

محدود مطالعہ کی بنا پر عرض ہے کہ راقم السطور آپ کے نام اور ادبی فتوحات سے کسی حد تک واقف ہے۔ ہاں! یہ صحیح ہے کہ رابطہ قائم نہ کر سکا لیکن مختلف رسائل میں آپ کی تخلیقات زیر مطالعہ رہی ہیں۔ بھوپال میں تھا تو 'آفتاب جدید' اور 'ندیم' خرید کر پڑھتا تھا، اس کے بعد مدھیہ پردیش سندیش کے ذریعہ اردو دنیا کی خبریں مل جاتی تھیں۔

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا ترجمان بھی ملتا رہا۔ اب صرف 'اردو ہلچل' ملتا ہے۔ ریٹائر مینٹ کے بعد رسائل کا خریدار بننا اب اتنا آسان نہیں رہا۔ پھر بھی چند رسائل کا خریدار ہوں۔ خیر!

پچھلے برس ناگپور جانا ہوا تو آپ کا رسالہ 'انتساب' کا خصوصی شمارہ دیکھتے ہی خرید لیا۔ وہ شمارہ میرے کرم فرما ڈاکٹر آفاق احمد صاحب سے متعلق تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی اردو خدمات کا احقر معترف ہے۔ ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ خط وکتابت بھی ہوتی رہتی ہے۔ اللہ انھیں اچھا رکھے۔

زیر نظر کتاب 'نذیر فتح پوری کی ادبی فتوحات' تعارف کا اچھا ذریعہ ہے۔ جاندار کتاب اور ہم عصر شخصیت کا کھلے دل سے اعتراف کرنے پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

فقط

یعقوب الرحمٰن

☆☆☆

کشمیر کے چند معتبر شاعروں ادیبوں کی کتابیں

وحشی سعید کی کتابیں

۱-کنوارے الفاظ کا جزیرہ (افسانے)
۲-سڑک جارہی ہے (افسانے)
۳-خواب حقیقت (افسانے)
۴-پتھر پتھر آئینہ (ناول)

.....

ڈاکٹر شفق سوپوری کی کتابیں

۱-کلام فیض کا عروضی مطالعہ
۲-موسیقی شاعری اور لسانیات
۳-اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی
۴-دل خاک بسر (غزلیات)
۵-بیتے موسموں کے دکھ (گیت)
۶-دشت میں دور کہیں (غزلیات)
۷-مخزن موسیقی
۸-جہات
۹-ع۔م طاؤس فن اور شخصیت

.....

بشیر احمد بشیر کے شعری مجموعے

۱-آئینہ حقیقت
۲-نوید سحر
۳-نالۂ درد

صلصال (شاعری) احمد شناس
گلبن (شعری مجموعہ) گلشن خطائی
ایک بوند زندگی: بلراج بخشی
۱-علامہ اقبال اور مرزائیت
ڈاکٹر اشرف آثاری
۲-عصری ادب کے رنگ و آہنگ //
پرواز تخیل (شاعری) وحید مسافر
شہر بے اماں: مشتاق احمد وانی کینی
فلک آثار (شاعری) پرتپال سنگھ بیتاب
شکستہ ساز: عباس عراقی
خواب حقیقت (ناول)
: ڈاکٹر رخسانہ تبسم
یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟ شبنم قیوم

.....

تفہیم

نئی نسل کے ممتاز شاعر **عمر فرحت** کی ادارت میں پچھلے تین سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

.....

سہ ماہی **اردو اکیڈمی**
مشہور افسانہ نگار **نور شاہ** کی ادارت میں اہتمام سے شائع ہو رہا ہے

سیفی سرونجی اور انتساب پبلی کیشنز کی کتابیں

۱- روشن الاؤ شعری مجموعہ Rs.100/-
۲- ایک لمحہ ایک خواب Rs.100/-
۳- ناؤ سمندر موجیں Rs.150/-
۴- ہم رہ گئے اکیلے، کہانیاں
۵- ہم بھی ایڈیٹر بن گئے، انشائیے
۶- سیفی سرونجی ایک مطالعہ مرتب: انیس دہلوی
۷- سرونج سے لندن تک (سفرنامہ) Rs.100/-
۸- جنگل کا نٹے دھوپ، دیونا گری Rs.100/-
۹- رنگ اور خوشبو، دیونا گری Rs.50/-
۱۰- رنگوں کا امتزاج، مضامین Rs.100/-
۱۱- گنبد خضراء- نعتیہ کلام Rs.50/-
۱۲- سیفی سرونجی شخصیت اور فن Rs.500/-
مرتب: محمد توفیق خاں
۱۳- گاؤں کا مسافر سیفی سرونجی Rs.150/-
۱۴- انور شیخ اور ان کے کارنامے محمد توفیق خاں Rs. 100/-
۱۵- عاصی کاشمیری اور ان کی شاعری Rs. 100/-
۱۶- انور شیخ ایک مقبول شاعر Rs. 100/-
۱۷- گلشن کھنہ شخصیت اور فن Rs. 100/-
۱۸- سیفی سرونجی ایک تنقیدی نظر Rs. 150/-
از: محمد متین ندوی
۱۹- فن اور فنکار ابراہیم اشک Rs.150/-
۲۰- منفرد گیتوں کا خالق- سوہن راہی Rs.100/-
۲۱- لندن کا تیسرا سفر (ہندی) Rs. 150/-
۲۲- گوپی چند نارنگ اور اردو تنقید Rs.150/-
۲۳- نئی غزل نئے امکانات Rs.200/
۲۴- ساحر شیوی کے ادبی کارنامے Rs.150/-
۲۵- اردو کی نئی بستیاں Rs.200/-
۲۶- جدید شاعری کا بھوت Rs. 100/

۲۷- محبتوں کا شاعر ودیا ساگر آنند Rs. 200/
۲۸- تنقیدی تاثراتی مضامین Rs.150
۲۹- مشاہیر کے خطوط سیفی سرونجی کے نام Rs.200/-
۳۰- ایک بحر سو غزلیں Rs:150
۳۱- خالد محمود شخصیت اور فن Rs: 500/
۳۲- مختار شمیم ایک مہربان دوست Rs:150/
۳۳- یہ تو سچا قصہ ہے (خودنوشت) Rs:200/
۳۴- خوشبو پھیلے عام (شعری مجموعہ) Rs:200/
۳۵- خالد محمود بحیثیت انشائیہ نگار Rs:150
۳۶- شاہد میر اور ان کے تخلیقی جوہر Rs:150
۳۷- یہ تو سچا قصہ ہے (ہندی) Rs:200/
۳۸- ندا فاضلی کا تخلیقی سفر Rs:200/
۳۹- مظفر حنفی شخصیت اور فن Rs:500/
۴۰- صوفیہ انجم تاج..... Rs:200/
۴۱- گوپی چند نارنگ.... Rs:400/
۴۲- محمد ایوب واقف شخصیت او... Rs:300/
۴۳- اردو افسانہ ترقی پسند..... Rs:200/
۴۴- نئی تحریریں Rs:150/
۴۵- گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت Rs:150/
۴۶- نرمل سنگھ شخصیت اور فن Rs:200/
۴۷- تنقید مجھے نہیں آتی Rs:200/
۴۸- تمہیں محبت کا حق نہیں ہے (ہندی) Rs:200/
۴۹- ارشد مینا نگری ایک تنقیدی جائزہ 200-
۵۰- محمد ایوب واقف ایک مطالعہ 150-

OCTOBER TO DECEMBER 2014 RNI No. : MPURD/2013/57358

QUARTERLY

INTESAB AALAMI

VOL. NO. 2 ISSUE NO. 4 SIRONJ

ہفت روزہ اخبار سچ کا راجہ کے اجراء کے موقع پر دائیں سے بائیں:۔

پروفیسر نعمان خان، ضیاء فاروقی، رشید انجم، ڈاکٹر شان فخری، احد پرکاش ایڈووکیٹ، اودھ نارائن شریواستوا، آفاق سیفی۔

ہوٹل شہنشاہ پیلیس میں بیٹھے ہوئے دائیں سے : کرشن کمار طور، ڈاکٹر سیفی سرونجی، احمد شناس و عمر فرحت۔

Printed and Published by Afaque Saifi, on behalf of Afaque Saifi
Printed at Star Graphics Printers, Near Rosy Laundry, Itwara, Bhopal - 462001
and published from Intesab Publications, H.No. 82, Ward No. 19,
Raojipath, Sironj (M.P.) - 464228. Editor : Afaque Saifi, Mob. : 0997795500

لیکن اس بار بھی پنجاب سے دو ایسے افسانہ نگار سامنے آئے جو جدیدیت کے اہم نام ہونے کے باوجود اُنھوں نے اردو افسانے کے مطالعاتی وصف کو برقرار رکھا۔ یہ دو نام ہیں جوگندر پال اور سریندر پرکاش۔ اپنے ایک مضمون میں، میں نے ان دونوں افسانہ نگاروں کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا، جوگندر پال نے جدیدیت کے زیر اثر نیم خوابیدہ ذہنی کیفیات سے اپنا اسلوب استوار کیا تو سریندر پرکاش نے دھند میں گھری فضا اور طلسمی ماحول سے اپنے فن کی آبیاری کی۔ جوگندر پال کے افسانوں میں تخیل اور تحت الشعور کا باہمی تعلق ایک ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے خود کلامی اُن کے یہاں ایک جوہر کی قوت اختیار کر لیتی ہے۔ سریندر پرکاش داستان اور قصوں کی کشش سے عصری ماحول تک سفر کرتے ہیں، اور نفسیاتی تحیر کے دھاگوں سے اپنے قاری کو جکڑ لیتے ہیں۔ دونوں کے پاس تنوع ہے اور دونوں کا وژن اور کینوس بہت وسیع ہے۔ دونوں نے جدیدیت کو تمام تر برتنے کے باوجود قاری کو دھوکا نہیں دیا۔ دونوں کے پاس عمدہ افسانوں کی ایک کہکشاں موجود ہے۔ اگر جوگندر پال نے جدیدیت کے زیر اثر 'نوزائیدہ، پیچھے، گھر، مقامات، جھنڈ، اور 'کھودو بابا کا مقبرہ' وغیرہ بے شمار افسانے لکھے تو سریندر پرکاش کے پاس بھی '' جپی ژاں، دوسرے آدمی کا ڈرائینگ روم، ساحل پر لیٹی ہوئی عورت، سرنگ وغیرہ افسانے موجود ہیں۔

تقسیم ملک سے پیدا ہونے والے مسائل، نفسیاتی اور تہذیبی خلش اور سماجی شعور نے بہت سارے افسانہ نگاروں کو متاثر کیا اور ان کی جھلکیاں اُن کے افسانوں میں نظر آنے لگیں۔ اُن میں ایک نام رام لال کا بھی ہے۔ رام لال کی افسانہ نگاری ترقی پسند تحریک سے شروع ہوئی اور جدیدیت نے اُنھیں اپنے دامن میں سمیٹا بھی لیکن چونکہ رام لال افسانہ نگاری کے مقصد اور مزاج سے واقف تھے اس لیے اُن کے پاس عصری موضوعات جدت کی بھول بھلیوں کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ سرکاری ملازمت سے جڑے ہوئے تھے۔ جائز اور ناجائز آمدنی کے فرق کو جانتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے اس موضوع پر نہایت عمدہ افسانہ '' تمہارا فیصلہ کیا ہے'' لکھا اور فرقہ وارانہ فسادات پر افسانہ '' آبلہ'' اپنے قاری کے حوالے کیا۔ تقسیم ملک سے پہلے کے حالات اور تقسیم کے بعد عام انسانوں کی محسوسات کو اُنھوں نے اپنے افسانے '' ایک شہری پاکستان کا'' میں جس خوبصورتی سے پیش کیا ہے اُس کا جواب نہیں، ہجرتوں کے کرب پر اُن کا ایک اور عمدہ افسانہ ''نئی دھرتی پرانے لوگ'' ہے۔ اس اقتباس میں درد کی ایک ایسی ٹیس ہے کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے:

'' کسی بیچارے مسلمان کا ہے۔ وہ بھی پاکستان میں کسی ہندو کے مکان میں اپنی عزت آبرو سمیٹے رہ رہا ہوگا۔ اسے بھی کچھ غم ستاتے ہونگے اپنے اور پرائیوں کے۔ وہ

بھی لوگوں کے بدلتے ہوئے رویّوں کی شکایت کرتا ہوگا۔ اپنے صدیوں کے ٹھکانوں سے اُکھڑ کر انسان ہر کہیں دکھ جھیلتا ہے۔ پر سب دن ایک جیسے نہیں ہوتے۔ مصیبتیں بادلوں کی طرح زندگی پر چھا جاتی ہیں۔ بادل گرجتے ہیں۔ برستے ہیں۔ پھر خالی ہو کر اُڑ جاتے ہیں۔ مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ پھر دھوپ بھی نکل آتی ہے۔ سائیں داس آنکھیں بند کیے کیے مسکرا دیا۔ ایک خیالی اطمینان سا محسوس کر کے آنکھیں نیم وا کر کے دیوار پر لگے 'اللہ اکبر' کے کتبے کو دیکھا۔ اسے دیکھتا رہ گیا۔ سیاہ جلی حروف اُبھر کر اُس کے قریب آ گئے، اُس کی آنکھوں کے بالکل سامنے۔ پھر وہ ایک دوسرے میں گھلنے ملنے لگے۔ سارے حروف مل کر ایک لمبی عمودی لکیر بن گئے۔ زمین سے اُٹھ کر آسمان کو چھونے والی، اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک پڑے۔''

اس کے علاوہ رام لال نے نسوانی نفسیات اور جنسی موضوعات پر بھی بہت سارے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ اُن کی فنکاری پر اہم ناقدین نے بہت سارے منفی سوالات بھی قائم کیے۔ وقت نے اُن سوالات کو بُھلا دیا لیکن رام لال کے افسانے ادب کے ایوانوں میں آج بھی زندہ ہیں اور اپنی معنویت کا احساس دلاتے ہیں۔

رام لال کے علاوہ اسی پنجاب سے بلراج کومل، مانک ٹالا، گلزار، ڈاکٹر نریش، دلیپ سنگھ، رتن سنگھ، دیویندر اِسر، نند کشور وکرم، کیول دھیر، محمد بشیر مالیر کوٹلوی، ڈاکٹر رینو بہل وغیرہ وہ افسانہ نگار اُٹھے ہیں جو آسمانِ ادب پر اپنی گہری چھاپ رکھتے ہیں۔ بلراج کومل نے اپنے افسانوں میں انسانی رشتوں کی شکست و ریخت کو موضوع بنایا۔ جدیدیت کے پسندیدہ موضوع بے چہرگی اور تنہائی کے کرب اور نفسیاتی اُلجھنوں سے اپنے افسانوں کا تانا بانا بنا، لیکن اُن کی اصل شناخت شاعری میں ہی پوشیدہ ہے۔ مانک ٹالا ابتدا میں پریم چند سے متاثر رہے، پھر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے لیکن بہت جلد اختلاف کی سیڑھی چڑھ گئے۔ اُنھوں نے جدیدیت کی بھی مخالفت کی۔ اُن کے افسانوں میں طنز و مزاح کے نشتر بھی ہوتے ہیں۔ پیاسی شام، گناہ کے رشتے، پنجرے کے پنچھی، وغیرہ اُن کے قابلِ ذکر افسانے ہیں۔ گلزار کا نام اگرچہ بالی وڈ کا ایک اہم نام ہے۔ اُن کے گیتوں اور مکالموں نے کئی فلموں کو مثالی کامیابی عطا کی، وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ ابتداء میں وہ کمیونزم اور ترقی پسندی کی راہ پر چلے لیکن بہت جلد اپنے نظریات پر لوٹ آئے۔ اُنھیں ۲۰۰۲ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور ۲۰۰۴ء میں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازہ گیا۔ اُن کی افسانہ نگاری سے

متعلق دیپک بدکی رقم طراز ہیں:

''گلزار زندگی کا مشاہدہ بلوریں ایوانوں سے نہیں کرتے بلکہ ایک ہمدرد انسان کی مانند ریل گاڑیوں اور جھونپڑیوں میں اس کا سامنا کرتے ہیں۔ اُنھیں اپنے کرداروں سے جذباتی لگاؤ ہے۔ وہ اُنھیں نکیل لگا کر اپنے پیچھے نہیں چلاتے بلکہ اُن کے ہمراہ چلتے ہیں۔''

(دور حاضر کے غیر مسلم افسانہ نگار۔ دیپک بدکی۔ سہ ماہی فکر وتحقیق۔ دہلی۔ جلد ۱۶۔ شمارہ نمبر ۴)

ڈاکٹر نریش کا تعلق مالیر کوٹلہ سے ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت قلم کار ہیں اور ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا محور وہ عام انسان ہے جو زندگی سے جوجھتا بھی ہے کبھی کامیاب اور کبھی بکھر بھی جاتا ہے۔ 'بند دروازہ' اور 'ننھے ہاتھوں کا لمس' اُن کی افسانہ نگاری کے شاندار نمونے ہیں۔ دلیپ سنگھ افسانہ لکھیں یا ناول یا کوئی ڈرامہ، ہر حالت میں اُن کا رشتہ زمین سے جڑا رہتا ہے۔ شرون کمار ورما نے افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کی لیکن اُنھیں قاری کا اعتبار افسانہ نگاری ہی میں حاصل ہوا۔ اُنھوں نے قدرے طویل افسانے بھی لکھے اور مختصر بھی۔ شرون کمار ورما، کردار، ماحول، نفسیات، اور انسانی رویوں کے افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے طویل افسانوں میں ''اب اُنھیں ڈھونڈھ، پیاسی جھیل، دل دریا اور فصیل جسم سے آگے'' قابل ذکر افسانے ہیں۔ افسانہ ''اب اُنھیں ڈھونڈھ'' رجنی کے اطراف گردش کرتا ہے۔ رجنی جسے مواقع ہونے کے باوجود وہ اپنے ماحول سے نکلنا نہیں چاہتی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ کسی تصویر سے کسی ایک عنصر کی علاحدگی نہ صرف اُس عنصر کے وجود کو بے معنیٰ کر دیتی ہے بلکہ اصل کینوس کو بھی داغدار بنا دیتی ہے۔ تو افسانہ ''پیاسی جھیل'' کا محور بھی ایک نسوانی کردار پرمیندر ہی ہے۔ وہ خاموش مزاج لیکن پیہم جستجو کی علامت ہے۔ بقول محمود ہاشمی:

''پرمیندر کور اس افسانے میں اُس لمحاتی اور عارضی وابستگی کے خلاف احتجاج کی علامت ہے جو فطرت کے حسین مناظر والے شاداب مقامات کو، سیاحوں کی آرائش اور عیاشی کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ پرمیندر کور، مجسم اور مکمل وابستگی کے مفہوم کو ادا کرنے والی علامت کے طور پر پیاسی جھیل کا اصل اور مکمل محور ہے۔''

(کتاب۔ دل دریا۔ شرون کمار ورما۔ تجزیاتی نوٹ۔ محمود ہاشمی۔ ص۔ ۳۲)

رتن سنگھ کی افسانہ نگاری کا مرکزی محور وہ انسان ہے جو صدیوں سے ایک بدحال سی زندگی جی رہا ہے۔ جس کے پاس آسودگیوں کی کمی ہے، مسرتوں کے لمحے کم کم ہیں۔ اُس کی فطرت میں نیکی

اور بدی ساتھ ساتھ ہیں، کبھی نیکی کا غلبہ ہوجاتا ہے اور کبھی بدی اُسے وحشی اور بے مروت بنادیتی ہے۔ ان موضوعات کے ساتھ وہ اپنے عصر میں سانسیں لیتے ہیں۔ وہ اکثر نئے اور اچھوتے موضوعات کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں،'' جس تن لاگے، مریم، بے بسی، آخری اُداس آدمی، اور 'کھلونے '' قابل ذکر افسانے ہیں۔ افسانہ 'جس تن لاگے' اپنی تکنیک، پلاٹ، اور اسلوب کے باعث نہ صرف عمدہ افسانہ ہے بلکہ جدت طرازی کا بھی اچھا نمونہ ہے۔ مرکزی کردار کا اپنے حال تا ماضی فکر کے دھاگوں کو کھولنا بلکہ وہ خواب دیکھنا جن کے بارے میں وہ خود بھی جانتا ہے کہ یہ کبھی پورے نہیں ہوسکتے لیکن اس کے باوجود اُسی سحر میں ڈوبے رہنا، افسانے کی وسعتوں کو غیر معمولی آسمان عطا کرتا ہے۔ افسانہ 'مریم' ایک مریض کے احساس تنہائی کی کہانی ہے۔ اسپتال میں دیگر مریضوں کی عیادت کو آنے والے افراد کو دیکھ کر اُسے نہ صرف احساس تنہائی ہوتا ہے بلکہ وہ حسد میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اور چڑچڑا ہوجاتا ہے۔ ایک چھوٹی سی لڑکی سلمیٰ اپنے دادا کے ساتھ اسپتال میں آتی ہے وہ اُسے اپنے پاس بلاتا ہے اور اُس کی بھولی بھولی باتوں میں اپنا غم بھول جاتا ہے۔ یہی لڑکی اُس کے لیے مریم بن جاتی ہے۔۔

دیوندر اسّر قدرے مشکل پسند افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے افسانوں میں حقیقت اور ماورائے حقیقت کا اس طرح سنگم ہوجاتا ہے کہ اکثر قاری اُلجھن سی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسّر کے افسانے عام قاری کے مزاج اور معیار سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ افسانوں کا استعاراتی نظام اس تیزی سے معنیاتی نظام کو تبدیل کرتا ہے کہ قاری کو ٹھہر ٹھہر کر سوچنا اور سمجھنا پڑتا ہے۔ مثلاً افسانہ'' پرچھائیوں کا تعاقب'' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''بہت برس بیت گئے اس بچے کو کھوئے ہوئے۔ اُس کے ماں باپ نے بتایا کہ اُسے تتلیاں پکڑنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک کالی تتلی اُس کی کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ لگی بیل پر آکر بیٹھا کرتی تھی۔ جونہی وہ اُسے پکڑنے کی کوشش کرتا وہ اڑ جاتی تھی۔ کئی دنوں تک ایسا ہی چلتا رہا۔ وہ اُسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا۔ تتلی اُڑ جاتی تھی۔ ایک دن اُس نے چپکے سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں اُس تتلی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ تتلی کبھی ایک پودے پر بیٹھتی کبھی دوسرے پر۔ وہ ہاتھ بڑھاتا۔ وہ اُڑ جاتی۔۔۔ پھر وہ شاید اُس کے پیچھے پیچھے بہت دور نکل گیا تھا۔ اُس کے ماں باپ نے بتایا کہ اُنہوں نے اُس کی بڑی تلاش کی۔ لیکن وہ ملا نہیں۔ لیکن اُس دن کے بعد وہ کالی تتلی بھی نظر نہ آئی۔''

تتلی کے سحر میں اُس کے پیچھے نکلنا زندگی کا وہی تقاضا ہے جو کسی عورت کا چاند کے تعاقب میں نکلنا اور ماڈل بن جانا ہے۔ دیوندر اسر کا یہی انداز ہے کہ وہ سامنے کی چیزوں کو بھی نہایت خوبصورتی سے استعاروں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر کیول دھیر کے اکثر افسانے 'نہیں' سے 'ہاں' کی طرف سفر کرتے ہیں لیکن ان کا کمال ہی ہے کہ وہ قاری کی فکر کے تلاطم کو اپنے افسانوں کے کرداروں کے ساتھ اس طرح مربوط کرتے ہیں کہ قاری اپنا فیصلے طے کر لیتا ہے لیکن افسانے کا کلائمکس اُس کے سارے فیصلوں کو رد کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیتا ہے۔ ان کا افسانہ ''واسنتی'' قاری کو احساس دلاتا ہے کہ غلط فہمیاں غلط انجام تک پہنچا دیں گی لیکن افسانے میں ایک موڑ ایسا آتا ہے کہ واسنتی کو پتہ چل جاتا ہے کہ ڈاکٹر روی نے اُس کے عشق کی ناکامی کے سبب زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اپنی باقی زندگی کو اسپتال کے نذر کر دیا ہے۔ یہیں سوئی ہوئی محبت بیدار ہوتی ہے۔ افسانہ ''جذبوں کا کھیل'' ایک رومانی تکون ہے تو افسانہ ''ہم دونوں'' کے ذریعے اُنھوں نے ثابت کیا کہ تقسیم ملک نے دونوں قوموں کے لیے یکساں مسائل پیدا کیے ہیں۔ کیول دھیر نے رومانی افسانوں کے ساتھ ہی ساتھ ملک کی یکجہتی، آپسی خلوص اور اتحاد کی طاقت کو اُجاگر کرنے والے افسانے بھی لکھے ہیں۔ ڈاکٹر رینو بہل کے افسانے، سماج کا وہ آئینہ ہے جس میں استحصال کی شکایت کرنے والی عورت خود، عورت کا استحصال کرتی نظر آتی ہے، اُن کے افسانوں میں زندگی کسی سڑک کی طرح نظر آتی ہے۔ سڑک بہتی ہے، جانے کتنے مسافر عازم سفر ہوتے ہیں، کسی کی منزل جلد آجاتی ہے اور کوئی مسافر خواہ کتنا ہی فاصلہ طے کر لے، لیکن منزل اُسے نہیں ملتی۔ اب تک وہ تین افسانوی مجموعے قارئین کے حوالے کر چکی ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں کردار سازی کے ساتھ ساتھ ماحول کی عکاسی اور آس پاس کے منظر کو بھی تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ افسانہ 'کستوری' ایک ایسی خاتون کی کہانی ہے جو بچپن سے لے کر افسانے کے اختتام تک استحصال ہی کا شکار رہی ہے۔ اور وہ ایسی ثابت قدم ہے کہ کبھی احتجاج بھی نہیں کیا اور جب زبان کھولی تو پُر اعتماد ازدواجی زندگی کا دعویٰ کرنے والے بھی بھونچکے رہ جاتے ہیں:

> ''آپا اپنے کمرے کی کنڈی لگا کر سوتی ہیں؟ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔'' اُس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ چپ چاپ بنا کچھ کہے جانے لگی تو سلونی نے اُس کی کلائی تھام لی۔ دونوں کی نظریں ملیں، کستوری کی آنکھوں میں آنسو لرز اُٹھے، ''آج تک میں نے خاموشی سے ہر فرض پورا کیا کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں

افسانے : اندیشہ! — احمد زین الدین — ۱۳۳
خاص خبر — محمد قیوم میو — ۱۳۸
مختصر کہانیاں — صابر فخر الدین — ۱۴۱
سفرنامہ - کشمیر کا ایک یادگار سفر (قسط:۲) — سیفی سرونجی — ۱۴۴
کشمیر کا ایک یادگار سفر (منظوم) — سیفی سرونجی — ۱۵۱

غزلیں، نظمیں: ۱۵۶

پروفیسر حامدی کاشمیری، مناظر عاشق ہرگانوی، کرشن کمار طور، ڈاکٹر نریش، پرتپال سنگھ بیتاب، رفیق جعفر، شاہد عزیز، حفیظ انجم کریم نگری، اختر کاظمی، قیصر عزیز، جمال قدوسی، شارق عدیل، حنیف ساحل، رفیق شاہین، ممنون حسن خاں ممنون، ڈاکٹر مہتاب عالم۔

گوشہ احمد شناس : ۱۶۵

کچھ احمد شناس کے گوشہ سے متعلق — سیفی سرونجی — ۱۶۵
صلصال پر ایک مباحثہ — سیفی سرونجی — ۱۶۷
احمد شناس 'صلصال' اور بصیرتوں کا چراغاں — پروفیسر قدوس جاوید — ۱۷۴
صلصال آواز اور سکوت کا خوبصورت سنگم — کرشن کمار طور — ۱۸۷
احمد شناس اور 'صلصال' — سیفی سرونجی — ۱۹۵
احمد شناس ایک منفرد اور معتبر شاعر — محمد متین ندوی — ۱۹۹
احمد شناس کی غزلیں — ۲۰۴

کتابوں کی دنیا: ۲۰۹ زریں نامہ - عفت زریں، نالہ درد - بشیر احمد بشیر، تجلیات حمد و نعت - امان خاں دل، سانس لیتا شہر - مہدی پرتاب گڑھی، اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی - ڈاکٹر شفق سوپوری، نور حرا - سید نفیس دسنوی، عشق ہے - شہباز ندیم ضیائی۔

رپورٹس: ۲۲۹ **مکتوبات:** ۲۳۴

حامدی کاشمیری، مناظر عاشق ہرگانوی، اسلم مرزا، شمس الہدیٰ انصاری، حامد لطیف ملتانی قادری، فراز حامدی، رفیق شاہین، مصداق اعظمی، یعقوب الرحمن۔ ☆

دیا اور نا ہی کوئی شکایت کی مگر اب میں کہہ دیتی ہوں، تیرا گھر تو سنبھال سکتی ہوں ، تیرے بچوں کی ماں تو بن سکتی ہوں، مگر تیرے پتی کی پتنی نہیں۔'' اتنا کہہ کر سلونی سے ہاتھ چھڑا کر وہ اندر چلی گئی۔''

اسی طرح رینو بہل کا افسانہ'' بیگم بادشاہ غلام'' معاشی آسودگیوں کی چاہت اور اس کی خاطر انسانی سمجھوتوں کی کہانی ہے۔ میں اب آخر میں پنجاب کے ایک ایسے افسانہ نگار پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جس کا قلم صرف خود کی صلاحیتوں کے لیے نہیں تھا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ پنجاب میں جس اردو افسانے کو منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ وغیرہ نے آسمان ادب کی انتہا پر پہنچایا تھا، اُسی پنجاب میں اردو افسانے کا سورج پھر ایک بار اُسی طرح جگمگاتا رہے۔ جس نے افسانہ کلب کی بنیاد ڈالی اور اپنے پیچھے آنیوالی پوری ایک نسل کی آبیاری کی، میری مراد ممتاز افسانہ نگار محمد بشیر مالیر کوٹلوی سے ہے۔ اُن کے فسانوں میں احمد ندیم قاسمی کا نرم و نازک دل رکھنے والا پنجاب بھی سانسیں لیتا ہے تو بلونت سنگھ کا اکھڑ بانکا بھی دکھائی دیتا ہے اور راجندر سنگھ بیدی کی بولی ٹھولی بھی نظر آتی ہے۔ افسانہ ''اپنے لوگ'' کا گُردیال سنگھ جب لندن کے محلے یوٹری میں جمعہ کی نماز کے لیے ننھے خالد کو آواز دیتا ہے تو قاری کے ذہن میں احمد ندیم قاسمی کے کردار پرمیشر سنگھ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ محمد بشیر مالیر کوٹلوی کے افسانوں کے کردار کہیں بلونت سنگھ کی طرح کھردرے ہیں، اُن میں ٹھیٹھ پنجابیوں کا لب ولہجہ بھی ہے، کردار میں سخت مزاجی بھی ہے، نسوانی کرداروں میں ہیر کا حسن بھی اور وفاداری بھی یہ کردار محمد بشیر کے پاس کبھی دلاور سنگھ کے روپ میں کبھی بلونت سنگھ کے نام سے، کبھی جسّی کی قوتِ برداشت میں، کبھی جیلاں کی شہادت میں۔ یہ کردار زندگی کی گلیوں سے کاغذ پر آباد ہوئے ہیں اور قاری کے دل میں بسیرا کرتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور ان کا افسانہ'' بلیدان'' بے حد پسند آیا کہ جن پوتر استھانوں سے مذہب حسن سلوک کی تعلیم دیتا تھا اب وہیں سے اسی حسن سلوک کی آڑ میں دہشت گردی کا طوطا بولتا ہے تو کہیں کوئی 'حرامزادہ' اپنے باپ کے گناہوں کو احسان کے بوجھ سے دھونے کی کوشش کرتا ہے۔ محمد بشیر ایک متنوع افسانہ نگار ہیں جو کاغذ پر زندگی کا عکس اُتارتے ہیں۔ لیکن افسوس اُن کے فن کی جس طرح قدر ہونی چاہیے تھی نہیں ہوئی۔ تنقید نے اُن کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ خود اُن کے احباب نے بھی جب کبھی افسانہ نگاری کے فن پر کوئی مضمون لکھا اُنھیں نظر انداز کیا اس جرم میں راقم بھی شریک ہے۔

پنجاب کی تازہ کار نسل میں سالک جمیل براڑ سے لے کر محمد شمشاد تک اس افسانوی کارواں میں شریک ہیں۔ ان کی تڑپ اور لگن ہی ان کے مستقبل کا فیصلہ کرے گی۔ یقیناً ان

میں صلاحیتیں ہیں۔ یہ اگر مستقل مزاجی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھیں گی تو کل کا پنجاب ان ہی کے ناموں سے جگمگائے گا۔ میں نے اپنی بساط بھر کوشش کی کہ میں اپنے عنوان کے ساتھ انصاف کر سکوں ۔اس کے باوجود مجھے اعتراف ہے کہ میں بہت سارے اہم ناموں کے افسانوی خزانوں تک نہیں پہنچ سکا جس کے لیے میں شرمندہ ہوں ۔

☆☆☆

انتساب کے خاص نمبر

بشیر بدر نمبر -Rs:500
خالد محمود نمبر-Rs: 500
ظفر گورکھپوری نمبر-Rs:250
ندا فاضلی نمبر-Rs: 200
محمد ایوب واقف نمبر-Rs: 200
گوپی چند نارنگ نمبر-Rs:400
قاضی مشتاق احمد نمبر-Rs:200
انور شیخ نمبر-Rs:200
پروین شیر نمبر-Rs:200
شکیلہ رفیق نمبر-Rs:200
صوفیہ انجم تاج نمبر-Rs:200
مظفر حنفی نمبر-Rs:500
شاہد میر نمبر-Rs:300
نرمل سنگھ رائے پوری نمبر-Rs:200
حافظ کرناٹکی نمبر -Rs:400

ایک بحر سو غزلیں

سیفی سرونجی

کا ساتواں منفرد شعری مجموعہ

ایک بحر میں سو غزلیں

اور ڈیڑھ سو اشعار کی حمد کے ساتھ

قیمت: ۲۰۰/روپے

انتساب پبلی کیشنز: سیفی لائبریری سرونج

.....

گیتوں کا شہزادہ: علیم طاہر

ڈاکٹر سیفی سرونجی

معین الدین عثمانی
Mb;9921299749

سعادت حسن منٹو بحیثیت افسانہ نگار

سعادت حسن منٹو کو دنیائے ادب نے ایک افسانہ نگار کے طور پر نہ صرف یہ کہ تسلیم کیا ہے بلکہ انھیں ایک ادبی انجمن یا ادارے کے طور پر بھی اعتراف کیا ہے۔ حالانکہ جب ہم اس کی طبعی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں قدرے مایوسی ہوتی ہے۔ موت وحیات کا عرصہ قدرت کی دسترس میں ہوتا ہے، کسی کو کم تو کسی کو زیادہ عرصہ ملتا ہے مگر بعض لوگ دنیا میں ایسے بھی وارد ہوتے ہیں جو مختصر عرصہ حیات کے باوجود بھی ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دے کر چلے جاتے ہیں، جو طویل عمر پانے والے انجام نہیں دے پاتے۔ منٹو نے بہت کم عمر پائی مگر اس کا نام ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔

منٹو نے اپنی زندگی میں ڈرامے، مضامین اور خاکے لکھے اور خطوط بھی تحریر کئے مگر اس کی مسلمہ ادبی حیثیت ایک افسانہ نگار کے طور پر بھی کی گئی ہے۔ اور افسانہ نگار کے طور پر وہ زندگی بھر متنازعہ فیہ رہا۔ اس کے ساتھ المیہ یہ رہا کہ جب تک وہ زندہ رہا، اپنے افکار وخیالات کی بدولت ظلم وزیادتی کا شکار رہا۔ اسے کئی طرح کے مقدموں کا سامنا کرنا پڑا۔ مرنے کے بعد بھی ایک عرصے تک لوگ اسے سمجھنے سے قاصر رہے۔ دراصل ہمارے معاشرے کی جو بُنت ہے، وہ ایسی ہے کہ چوکھٹ باہر کی چیزوں کو شاذ ونادر ہی قبول کرتی ہے اور اگر بحالت مجبوری قبولیت کی نوبت آ بھی جائے تو اس وقت تک اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ زمانہ اس دوران سفر آگے طے کر لیتا ہے۔

آج منٹو کی تحریر میں منٹو صدی تقریبات کے طفیل ہی سہی دوبارہ ادبی دنیا کے اسٹیج پر نہایت تزک واحتشام سے جلوہ فگن ہونے لگی۔ تو منٹو سے متعلق جو غلط فہمیوں کا گرد وغبار چھایا ہوا تھا،

رفتہ رفتہ کم ہونے لگا ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے۔ اردو دنیا بے کم و کاست اس کی ادبی حیثیت کو پوری طرح سے قبول کر لے گی۔

دراصل منٹو کو سمجھنا ایک پیچیدہ عمل کے مترادف ہے۔ اس نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنے افکار و خیالات کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود بھی اسکی ترسیل و تفہیم صحیح صحیح طور پر نہیں ہو سکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک لوگ اسے محض ایک فحش اور عریاں نگار قلم کار کے طور پر بھی بدنام کرتے ہیں۔ ان ساری باتوں کے ازالے کے لئے اس کے نظریات کا بنظر غائر مطالعہ از حد ضروری ہے۔

اس ضمن میں منٹو ہی کے بقول ملاحظہ فرمائیں، وہ کہتا ہے:

''میں افسانہ نگار ہوں۔ میرے تخیلات کی پرواز بہت اونچی ہے لیکن افسوس ہے اوپر اڑ کر پھر ایسا گرتا ہوں کہ پاتال کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہوں اور وہاں اوندھے منہ پڑا سوچتا ہوں کہ جب گرنا ہی تھا تو اڑنے کا تکلف ہی کیوں کیا؟ لیکن شاید چھوٹے چھوٹے حادثے جو ہم چھوٹے بندوں کی لغزشوں کے باعث ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مجھے بے حد متاثر کرتے ہیں۔''

''میں ایک بڑا ادیب ہوں۔ میں ایک بڑا انسان ہوں لیکن آج تک میں نہیں سمجھ سکا کہ میرا مقام کیا ہے؟'' آگے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ''میں لکھتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ میں لکھتا ہوں اس لئے کہ کچھ کما سکوں، تاکہ میں کچھ کہنے کے قابل ہو سکوں۔''

اور یہ اعترافیہ تو شاید منٹو کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

وہ اعتراف کرتا ہے کہ ہم قانون ساز نہیں۔ محتسب بھی نہیں۔ احتساب اور قانون سازی دوسروں کا کام ہے۔ ہم حکومتوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن خود حاکم نہیں بنتے۔ ہم عمارتوں کے نقشے بناتے ہیں لیکن معمار نہیں۔ ہم مرض بتاتے ہیں لیکن دواخانوں کے مہتمم نہیں۔ اور یہ بات تو حرف آخر کے طور پر مانی جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ ہم لکھنے والے پیغمبر نہیں ہم ایک ہی چیز کو ایک ہی مسئلے کو مختلف حالات میں مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ ہماری سمجھ میں آتا ہے، دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور کبھی مجبور نہیں کرتے، وہ اسے قبول بھی کر لیں۔ جہاں تک فحش نگاری اور عریاں نگاری کا تعلق ہے۔ یہ دونوں بھی دو علاحدہ علاحدہ چیزیں ہیں۔ اس کو ہم نے ایک ہی چیز سمجھ لیا ہے۔ جس کی بنا پر اکثریت مغالطہ کا شکار ہو گئی ہے اور ایک عرصہ سے منٹو کے تعلق سے یہ غلط فہمی عام ہو گئی ہے کہ منٹو

فحش افسانہ نگار ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان مغالطوں کو سلجھانے کے لئے ہمیں اس ضمن میں منٹو ہی کے افکار و نظریات کو سامنے رکھنا ہوگا۔ منٹو کہتا ہے کہ ہم جنسیات پر نہیں لکھتے جو سمجھتے ہیں کہ ہم ایسا کرتے ہیں۔ یہ ان کی غلطی ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ جو لوگ ہمارے افسانوں میں لذت حاصل کرنے کے طریقے دیکھنا چاہتے ہیں، انھیں یقیناً ناامیدی ہوگی۔ ہم جب کسی ویشیا کو دیکھتے ہیں تو اس کی ہستی سے عورت کو نوچ کر علاحدہ نہیں کر دیتے۔ وہ یہ بات بھی زور دے کر کہتا ہے کہ اگر ہماری تحریروں میں عورت اور مرد کے تعلقات کا ذکر آپ کو زیادہ نظر آئے تو یہ ایک فطری بات ہے۔ ملک ملک سے سیاسی طور پر جدا کئے جا سکتے ہیں۔ ایک مذہب دوسرے مذہب سے عقیدوں کی بنیاد پر علاحدہ کیا جا سکتا ہے اور زمینوں کو قانون ایک دوسرے سے بے گانہ کر سکتا ہے لیکن کوئی سیاست کوئی عقیدہ کوئی قانون عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکتا۔

منٹو کے مطابق عورت اور مرد میں جو فاصلہ ہے، اس کو عبور کرنے کی کوشش ہر زمانے میں ہوتی رہے گی۔ عورت اور مرد میں جو ایک لرزتی دیوار حائل ہے۔ اسے سنبھالنے اور گرانے کی سعی ہر صدی ہر قرن میں ہوتی رہے گی۔ جو اسے عریانی سمجھتے ہیں۔ انھیں اپنے احساس کے ننگ پر افسوس ہونا چاہئے۔

وہ تو یہ بھی کہنے میں گریز نہیں کرتا کہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ نئے ادب نے جنسی مسائل پیدا کئے ہیں۔ غلطی پر ہیں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ جنسی مسائل نے اس نئے ادب کو پیدا کیا ہے۔ اس نئے ادب کو جس میں آپ کبھی کبھی اپنا عکس دیکھتے ہیں اور جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ حقیقت خواہ شکر میں ہی لپیٹ کر پیش کی جائے۔ اس کی کڑواہٹ دور نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کی تائید میں کہا ہے کہ جنس منٹو کے لئے ذریعہ لذت نہ تھی۔ اس نے جنس کو صرف جنس کے رنگ میں پیش کیا۔ منٹو کی تحریروں میں دنیا ایک لیبارٹری کی صورت اختیار کر کے جنسی تجربات کی تصویروں کے سلائیڈ پیش کرتی ہے۔ جنس کی پیش کش کا یہ انداز اس لحاظ سے اہم اور اردو افسانے میں ایک نیا تجربہ بھی تھا کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں جنس کو عام زندگی سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ چنانچہ منٹو کے افسانوں میں جنس عام زندگی سے منقطع کوئی جداگانہ وقوعہ نہیں بلکہ یہ منٹو کی جینس کا کمال ہے کہ اس نے جنس کے حوالے سے زندگی کو سمجھا اور سمجھایا ہے۔

اس مقصد کے لئے اس نے اپنے افسانوں میں جنس سے معانی کے دو جہات کیں۔ ایک طرف جنس کی روشنی میں انسانی زندگی کی ناہمواریاں اجاگر کیں تو دوسری طرف اسے ذریعہ احتجاج بھی بنایا اور منٹو کا احتجاج سماجی نوعیت کا تھا۔

یہ بات ہمارے خاطر نشان رہنی چاہئے کہ جنسی مسائل جس طرح آج کے نئے ادیبوں کے پیش نظر ہیں، اسی طرح پرانے ادیبوں کے بھی پیش نظر تھے۔ انھوں نے اپنے رنگ میں لکھا۔ ہم آج اپنے رنگ میں لکھ رہے ہیں۔

منٹو کے قلم کا لازمی جزو اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب عورت اور جنس ہیں۔ اپنے پورے عرصہ حیات میں اس نے اپنی مخصوص طرز نیز انفرادیت کے ساتھ نہ صرف ادب تخلیق کیا۔ بلکہ عورت اور جنس کے حوالے سے سماجی کمزوریوں، خامیوں، خباثتوں اور ذلتوں کو بڑی بے باکی اور دیدہ دلیری کے ساتھ حیات و کائنات کی کڑوی سچائی کی کہانی کا حصہ بنایا۔

اس ضمن میں افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' کا یہ پیراگراف ملاحظہ فرمائیں:

''ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعہ اڑاتے ہوئے کہا۔ جس مکان پر میں نے دھاوا بولا تھا۔ اس میں سات-اس میں سات آدمی تھے۔ چھ میں نے قتل کر دئے۔ اسی کرپان سے، جس سے تو نے مجھے-چھوڑا اسے-سن-ایک لڑکی تھی بہت ہی سندر۔ اُس کو اٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا۔ اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا۔ راستے میں-کیا کہہ رہا تھا میں؟ ہاں راستے میں-ہند کی پٹری کے پاس تھوہڑ کی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹا دیا۔ پہلے سوچا کہ پھینکوں لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں-یہ کہتے کہتے، ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا۔ پھر کیا ہوا؟

ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے۔ میں نے-میں نے پٹا پھینکا۔

لیکن-لیکن-اس کی آواز ڈوب گئی۔ کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا۔ پھر کیا ہوا؟

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کے جسم کی طرف دیکھا۔ جس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ وہ مری ہوئی تھی۔ لاش تھی۔ بالکل ٹھنڈا گوشت۔ جانی، مجھے اپنا ہاتھ دے۔

کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔''

اسی طرح افسانہ ''کھول دو'' کی یہ سطریں بھی ملاحظہ فرمالیں۔

''ان لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال کے سپرد کیا اور چلے گئے۔

وہ کچھ دیر تک ایسے ہی ہسپتال کے باہر گڑے ہوئے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اندر چلا گیا۔ ایک کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ بس ایک اسٹریچر تھا

۔جس پر ایک لاش پڑی تھی۔وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا بڑھا۔کمرے میں دفعتاً روشنی ہوئی۔اس نے لاش کے چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا اور چلایا۔سکینہ۔

ڈاکٹر جس نے کمرے میں روشنی کی تھی۔اس سے پوچھا۔کیا ہے؟

اس کے حلق سے صرف اتنا نکل سکا۔جی میں۔جی میں اس کا باپ ہوں۔

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی لاش کی طرف دیکھا۔پھر لاش کی نبض ٹٹولی اور اس سے کہا۔کھڑکی کھول دو۔مردہ جسم میں جنبش ہوئی۔بے جان ہاتھوں نے ازار بند کھولا۔اور شلوار نیچے سرکا دی۔بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلایا۔زندہ ہے۔میری بیٹی زندہ۔

ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو چکا تھا۔''

تقسیم ہند کے موضوع پر اگر کسی نے دلجمعی سے لکھا ہے تو منٹو ہی ہے۔اس ضمن میں ہونے والے فسادات کے واقعات سے اس کی تحریریں بھری پڑی ہیں۔ویسے بھی منٹو کی تحریر کی بے باکی سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔اس کا حقیقت پسندانہ انداز تحریر کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔وہ جب بھی بات کرتا ہے، دوٹوک انداز میں کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریریں آج بھی زندہ تابندہ اور تازہ دم محسوس ہوتی ہیں۔تقسیم ہند سے متعلق اس کا افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' ایسا لازوال شاہکار ہے، جس کی نظیر اردو دنیا آج تک نہیں دے سکی ہے۔اس نے تقسیم کے عمل کو غیر فطری قرار دیا ہے۔اور منطقی طور پر اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔اس افسانے میں پاگلوں کی تقسیم اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ ایک غیر فطری حرکت ہے۔اس افسانے میں ایک پاگل درخت پر چڑھ کر یہ کہتا ہے کہ ''میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔میں اسی درخت پر رہوں گا۔کچھ دیر بعد جب اس کی کیفیت نارمل ہوتی ہے تو وہ درخت سے نیچے اتر کر اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل کر رونے لگتا وہ سوچنے لگتا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

اس افسانے کا مرکزی کردار جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا اوندھے منہ لیٹا تھا۔ادھر ہندوستان تو ادھر پاکستان۔درمیانی ٹکڑا جس کا کوئی نام نہ تھا۔وہاں ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

تقسیم کی بربریت کو ظاہر کرنے والا منٹو کا شاہکار افسانہ ''کھول دو'' اس کا اختتام کس قدر پر درد ہے۔زیادہ تر گرفت اس کے رضا کار والے حصے پر ہوئی ہے۔ویسے بھی یہ واقعہ زندگی سے ماخوذ ہے۔سوال یہ اٹھتا ہے لڑکی کی یہ حالت کس نے کی تھی؟ اس سوال کی گونج آج بھی ادب کے ایوانوں میں صاف سنائی دیتی ہے۔

دوسری طرف سیاہ حاشیئے کے عنوان سے جو تحریریں آئی ہیں۔حقیقت پسندی کا جیتا جاگتا ثبوت فراہم کر کے انسانیت کو شرمسار کر گئی ہیں۔

افسانہ ''موتری'' میں منٹو نے جو نقشہ کھینچا ہے۔ذرا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

''تیسری بار پھر اسے موتری میں جانا پڑا۔پیشاب کرنے کے لئے نہیں۔ناک پر رومال رکھ کر اور سانس بند کر کے وہ غلاظتوں کی اس کوٹھری میں داخل ہوا۔فرش پر کیڑے چل رہے تھے۔دیواروں پر انسان کے شرمناک حصوں کی نقاشی کرنے کے لئے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔

جب وہ آہستہ آہستہ باہر نکلا تو اسے یوں لگا کہ اُسے بدبوؤں کے اس گھر میں ایک بے نام سی مہک آئی تھی۔صرف ایک لحظے کے لئے۔''

اس ضمن میں زبیر رضوی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ان کے مطابق:

''اردو میں فسادات کے موضوع پر لکھی تحریر، المیہ، سانحہ اور حادثہ بن کر پڑھنے والے کے دل میں ایک گہری دردمندی کے جذبے کو ابھارتی ہے۔یہاں جو کچھ بھی ہے وہ بیتا ہوا زیادہ ہے، دیکھا اور سنا ہوا کم ہے۔المیہ، سانحہ اور حادثہ جب دل سے گزر کر بیانئے کی صورت میں ڈھلتا ہے تو نوحہ گر کی طرح رلاتا نہیں۔حوادث کو جھیل جانے اور ہوا کی زد پر جلتے ہوئے چراغ کی لو کو ہتھیلیوں کی جلن سے روکنے کی تحریک دیتا ہے۔

دراصل ادیب کی عظمت ہی اس بات میں ہوتی ہے کہ وہ محض فسادات کی تفصیلات ہی بیان نہیں کرتا بلکہ وہ فساد کی تہہ میں جا کر فسادی کو آشکارہ کر کے اسے پڑھنے والوں کے سپرد کرتا ہے۔''

اور میرے خیال سے منٹو نے یہ کام بدرجہ اتم انجام دیا ہے۔

بعض ناقدین ادب اس طرح کے ادب کو ہنگامی ادب کہا ہے جو بقول سردار جعفری:

''اس کو ہنگامی ادب کہہ کر صرف وہی لوگ ٹال سکتے ہیں، جن کی روحیں سڑ گئیں اور شعر و فن کے چشمے خشک ہو گئے ہیں۔''

چونکہ زندگی مختلف مسائل سے عبارت ہے۔اس میں جہاں خوشیاں ہیں، وہیں غم بھی دامن پسارے کھڑا نظر آتا ہے۔تقسیم ایک بڑا اور بُرا حادثہ تھا جو گزر گیا اور لوگ ہیں کہ برائی سے بھی بھلائی کا پہلو نکال لیتے ہیں۔تقسیم کے سانحے پر اردو کے افسانہ نگاروں نے ادب کے دیار میں ایسے

ایسے دردانگیز اور کرب ناک پھول چڑھائے ہیں کہ اس سے اردو کا افسانوی محل آج بھی پوری آب وتاب کے ساتھ روشن ہے۔ اور افسانہ محل کی اس روشنی میں منٹو کا خون جگر بھی شامل ہے جسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

منٹو اپنے ہر افسانے میں حقیقت نگاری کے قلم سے جولانیاں بکھیرتا ہے۔ یہ تو بس اسی کا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو افسانے کی تاریخ میں منٹو کے مقام ومرتبہ کو کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اس نے اپنے دور کی سچائیاں بیان کیں، اس لئے اس کی شہرت اور مقبولیت میں بتدریج اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ حقیقت نگاری ایک سچائی ہے اور سچائی کو جتنی رفتار سے دبایا جائے وہ اتنی ہی رفتار سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ صداقتیں اپنے رد سے زندہ رہتی ہیں۔ اس لئے وہ جتنا مشہور ہوا اتنا ہی بدنام بھی۔ دور گزرتا رہا اور اس کے در وا ہوتے رہے۔ اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔

بہر حال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ منٹو نے اپنے جس کرب کو طوائفوں کی عریاں نگاری یا پھر ہجرت وفسادات کے درد اور تلملاہٹ یا سیاسی بازی گری کو نمایاں کیا تھا۔ آج کی نسل اسی روایتی پرچم کو اپنے انداز سے تھامے آگے کی طرف خوش اسلوبی سے گامزن ہے۔ جو اردو افسانے کے لئے فال نیک ہے۔

اردو افسانہ جو عہد منٹو میں نقطہ عروج پر تھا۔ آج اپنا آگے کا سفر طے کر رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمسری شاید اسی کا مقدر تھی۔ اس کا دور ترقی پسندی کا آخری زمانہ تھا۔ اُس عہد میں اردو کے نامور ممتاز، افسانہ نگار کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی شانہ بشانہ چل رہے تھے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ منٹو نے انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کی طرح تاریخی اساطیر کو کہانی کی بنیاد نہ بنا کر حقیقت نگاری کو اپنایا۔ ایک سفاک کرافٹ مین کی طرح صداقت کی دودھاری تلوار سے سماج کو آئینہ دکھلایا۔ وہ خود کہتا ہے کہ ''مجھ میں یا میری تحریر میں جو برائیاں ہیں، وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں ہے۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔'' کہانی منٹو کے حوالے سے اس دور میں بھی موضوع بحث تھی۔ آج بھی ہے اور شاید آئندہ بھی رہے گی۔ منٹو کی حیثیت محض ایک افسانہ نگار ہی کی نہیں ہے بلکہ وقت کا نباض ایک ایسے ادارے کی مانند ہے جس نے تکنیکی لحاظ سے مکمل اور جزئیات کے تعلق سے سچا نیز موضوع کے لحاظ سے نہایت انوکھا مگر حقیقی انفرادی افسانہ دیا ہے۔ جس نے بعد از مرگ بھی زندہ اور تابندہ بنا دیا ہے۔

☆☆☆

علیم صبا نویدی
Cell:09840361399

ناصر بغدادی کی افسانہ نویسی

ناصر بغدادی پاکستان کے جدید افسانہ نگار ہیں۔ان کی تحریر تہہ دار ہے۔ان کا متن، واقعات، اظہار و اسلوب موضوعات کی رنگا رنگی و فراوانی اور قیاس و حقیقت میں ایسا ملفوف ہے کہ تمام باتیں ایک دوسرے میں گتھی ہوئی اور باربط ملتی ہیں اور طبق در طبق انفرادیت موضوع کی بھی حامل ہیں۔بعض موقعوں پر وہ موضوع پر ٹھہر ٹھہر کر تفصیلی نظر ڈالتے ہیں تو بعض جگہ گریز پا بھی بن جاتے ہیں اور تیزی سے گذر جانے کی سعی کرتے ہیں۔پہلی صورت میں خیال کی پیچیدگی میں توضیح مدنظر رہتی ہے اور دوسری صورت میں خیال عمومیت میں تیز روی ہی کو بہتر سمجھتے ہیں۔ناصر نے افسانہ نگاری کے فن کو قدیم و جدید روایات کے تسلسل کے طور پر برتا ہے۔وہ انسانی معاشرہ کی مختلف جہتوں میں تمام امکانات کو قیاسات کے طور پر لیتے ہیں اور انہونیوں کی دلدلوں میں ہونی کی زنجیر ڈال دیتے ہیں اور قیاسات کو امکانات کا درجہ دیتے ہیں۔ان کے افسانوں کا قاری محض نامعقولیت میں نہیں بھٹکتا اور ان کی ڈالی ہوئی زنجیر کو پکڑ کر دلدل سے نکل آتا ہے اور اسے نامعقولیت میں بھی عقلی استدلال ملتا ہے۔

ناصر بغدادی کے افسانوں میں آج کا پریشان حال عام انسان ہی اہم موضوع ہے۔ جو ہر رنگ میں رنگا ہوا ہے۔وہ ایک بھیانک درندہ بھی ہے اور اس درندہ کے اندر چھپا ہوا ایک کمزور اور پشیمان و پریشان مجبور پیکر بھی۔وہ ہر انسان میں ایک ایسی ذات کی تلاش جاری رکھتے

سیفی سرونجی

حمد

غفور ہے وہ کریم ہے وہ
قدیر ہے وہ رحیم ہے وہ
ہزار ناموں سے لوگ جانیں
تمام عالم اس کو مانیں
وہی ہے خالق خلیق ہے وہ
سبھی کا یارو رفیق ہے وہ
ہر ایک معصوم سادہ دل میں
جو جھک کے دیکھو ملے گا دل میں
دلوں میں سب کے بسا ہوا ہے
کوئی نہ اس سے جدا ہوا ہے
نہ مسجدوں میں نہ مندروں میں
وہی تو رہتا ہے سب دلوں میں
کوئی ذرا تو پکارو دل سے
نہ دور جائے وہ یارو دل سے
اسی کے آگے جو گڑگڑائیں
قدم ہمارے نہ لڑکھڑائیں
اگر خدا کو جو پاگئے ہم
سمجھ لو منزل پہ آگئے ہم

☆

مصداق اعظمی
Cell-9451431700

نعت شریف

عقیدت اور محبت سے اگر ذکرِ نبیؐ نکلے
قلم سے روشنائی کی جگہ اک روشنی نکلے

اندھیری زندگی میں روشنی کا انقلاب آیا
لبِ امیؐ صفت سے جب کلام آگہی نکلے

یہی تھی شافعِ محشر کی تجھ سے التجا یارب
مری امت کا ہر اک امتی بس جنتی نکلے

چراغ حق ہے روشن کلمہ احمدؐ کی صورت میں
جہالت کی ترے اندر سے اب تو تیرگی نکلے

زمیں پہ امن قائم کر دیا ہے یا رسولؐ اللہ
خدا کا نام لے کر آپؐ کے جب امتی نکلے

شہنشاہِ دوعالم کے شکم پر ہیں بندھے پتھر
ثبوتِ صبر کی اب کیا مثال اس سے بڑی نکلے

یہی بار الٰہی میں دعا کرتا ہوں رو رو کر
امامت میں تری مصداقؔ جیسا مقتدی نکلے

☆

ہیں، جس سے وہ انسان کو انسان ہی کے زمرہ میں رکھ سکیں۔ جب وہ اپنی تلاش میں ناکام ہوتے ہیں تو انہیں کوفت ہوتی ہے اور خواہ مخواہ وہ انسان کی قصیدہ خوانی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا وہ جیسا دیکھتے ہیں ویسا ہی اپنے کردار کو پاتے ہیں کہ نہیں۔ واقعات کی روح میں ان کا ہر فیصلہ مضمر ہے۔ وہ ادھورے احساسات کو لے کر افسانہ نہیں کہتے بلکہ معاشرہ میں ہر طرف دکھائی دینے والی حقیقتوں کو وثوق سے پرکھ لینے کے بعد ہی وہ اپنے افسانے کے کرداروں کو برسر کار لاتے ہیں۔ اور حسب ضرورت انھیں برتتے ہیں۔ وہ انسان کی نفسیات کو پہلے پڑھتے ہیں اور پھر اسے پیش کرتے ہیں۔ وہ اسے ہر روپ میں پیش کر کے اپنے طور پر اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا وہ جس رنگ میں رونما ہو رہا ہے، اس سے ہٹ کر بھی وہ کچھ ہے کہ نہیں۔ ہر گناہ گار گناہ تو کر لیتا ہے مگر اپنے گناہ پر اندر ہی اندر شرماتا بھی ہے اور خود سے نفرت بھی کرنے لگتا ہے۔ غلط روش پر گامزن سنبھلنے کے بجائے بھٹک بھی جاتے ہیں اور ان کی ابتدائی شرمندگی دھندلی بھی پڑ جاتی ہے اور وہ غلط روش سے باز آنے کی تمنا نہیں کرتے اور دھڑلے سے اس پر لگے رہتے ہیں۔ ناصر بغدادی کے افسانوں کے دوسرے مجموعہ ''مصلوب'' میں بھی کئی افسانے انھیں رنگوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ہر افسانے میں انسانی رویوں کی چھان بین کی ہے اور ان کی اصلیت کو ہو بہو پیش کر دیا ہے۔ آیئے ہم ''مصلوب'' کے صرف تین ابتدائی افسانوں کا جائزہ لیتے چلیں اور دیکھیں کہ ناصر بغدادی کا افسانہ نویسی میں کیا مقام ہے اور اس فن میں کہاں تک کامیاب ہیں؟

''چشم دید گواہ'' میں بس تین ہی کردار ہیں اور تینوں اپنی جگہ مختلف جذبات کے انسان ہیں۔ وہ ہیں اسرار، فرحت اور مختار۔ اسرار ایک ایسا انسان ہے، جو عام نوجوانوں کی طرح جوانی میں مرتکب گناہ ہونے کا امکان رکھتا ہے۔ اسرار بھی اچانک ہی ایک گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ وہ فرحت کو اپنی شہوت کا شکار بنا لیتا ہے۔ فرحت کسی اور کی رفیق حیات ہے۔ وہ اسرار کے بھائی مختار کی زندگی کی نئی نئی ساتھی ہے مگر اس کی معصومیت اور اس کے حسن ہی نے اسرار کو اس گناہ کی جرأت میں مبتلا کر دیا تھا۔ گھریلو معاشرہ میں یہی چند باتیں ہیں جو دیکھنے میں بہت اچھی ہیں مگر حقیقت میں وہ خطروں میں مبتلا کر دینے والی ہوتی ہیں۔ ایک گھریلو دوشیزہ کی معصومیت، سادگی، خندگی اور ملنساری اس کی ذات کے لئے پریشانیوں کا باعث بھی بن سکتی ہیں۔ اسی لئے عورت کو چار دیواری میں رکھنے کا رواج پڑ گیا کہ وہ محفوظ رہے۔ فرحت محفوظ نہیں رہی مگر وہ مجبور تھی اگر وہ کشمکش اور جدوجہد سے کام لیتی تو پورے گھر میں طوفان برپا ہو جاتا اور گھریلو سکون ہمیشہ کے لئے

ختم ہو جاتا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اسرار کے اندر کا بھیڑیا جب اپنا کام کر لیتا ہے تو وہ سو جاتا ہے اور اس کی جگہ پھر سے پچھتانے والا انسان اٹھ جاتا ہے اور وہ اسرار کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ وہ شرمندگی کے ساتھ کئی طرح کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسے خوف لگا رہتا ہے کہ کوئی ''چشم دید گواہ'' تو نہیں پیدا ہو گیا۔ وہ کمرے سے باہر نکل کر سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہے۔ نظر بھر کر وہ گھر کے کسی فرد سے گویا نہیں ہوتا۔ نہ فرحت سے، نہ مختار سے اور نہ کسی اور سے۔ شکاری پچھتاوے میں مبتلا ہے اور شکار؟ وہ ایک خاموش نفرت اور غضب کا مجسمہ بن کر ایک راز کو راز ہی رکھنے پر مجبور ہے کیوں کہ وہ ایک عورت ہے، احتجاج اور ہنگامے کا انجام وہ جانتی ہے۔ ایک ذات میں رونما ہونے والا طوفان اسی ذات میں رہے تو بہتر ہے، اس سے ایک ہی ذات منہدم ہوگی ورنہ پورے ماحول میں جتنی بھی اذوات ہیں وہ سب منہدم ہو جائیں گی۔

اسرار کی صورت حال یہ ہے:

''واقعہ کو گذرے بہت دن گذر گئے مگر اس کے باوجود متلاطم طبیعت میں جھیل کا سکون پیدا نہ ہو سکا۔ ایک اندرونی کشمکش سی تھی، جس نے اس کے اعصابی نظام کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔''

ایک موقعہ پر جمعہ کے خطبہ میں یہ الفاظ اس میں ایک توانائی پیدا کرتے ہیں:

''دوسروں کے گناہ کی ستر پوشی کرو اور اپنے گناہوں کی خدائے بزرگ و برتر سے معافی طلب کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ غفور بھی ہے اور رحیم بھی .... جن کے خلاف تم نے عمل قبیح کیا ان سے بھی معافی طلب کرو اگر وہ معاف کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی تمہیں معاف کر سکتا ہے۔''

اس نے فرحت سے معافی مانگی مگر اسے یوں جواب ملتا ہے۔

''معافی'' وہ زہر خند کے ساتھ بولی ''اب معافی کا وقت گذر چکا ہے۔ تمہیں کبھی معافی نہیں ملے گی۔ اگر خدا بھی تمہیں معاف کر دے تب بھی میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں۔''

اس کی آنکھیں آگ برسانے لگیں اور پھر اس نے کہا۔

''خبردار جو تم نے آئندہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی۔''

پھر ایک دن اس کے کالے کرتوت کا نتیجہ نکل آتا ہے۔ فرحت کی گود میں ایک ننھے میاں کا وجود۔ مختار نے کہا کہ سب اس ننھے میاں میں مختلف بزرگوں کی شبیہیں تلاش کیں۔ اماں

نے کہا۔اس بچے میں ان کی والدہ مرحومہ کی آنکھوں کی شبیہ ہے۔ابا جان کا خیال ہے کہ ننھے کی ناک ان کے والد مرحوم کی ناک سی ہے۔فرحت کہتی ہے اس کی پیشانی اس کے شوہر مختار کے ماتھے کی طرح کشادہ اور فراخ ہے۔

مگر جب اسرار سے پوچھا کہ اس کا کیا خیال ہے تو اس نے اسرار کو بغور دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔''میرا خیال۔تو میں کہتا ہوں کہ یہ بچہ تم پر گیا ہے۔اس کی ہر چیز تمہاری جیسی ہے۔مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تم نے دوسری بار جنم لیا ہو۔''

مختار کیا حقیقت سے آشنا ہے؟ یہ تو نہ افسانہ نگار نے کہا اور نہ کرداروں نے اس طرح کا کوئی شائبہ پیش کیا مگر اسرار کے کردار کے آگے مختار کی سنجیدگی یہی جتاتی ہے کہ وہ اس راز کو جانتا ہے مگر وہ بھی کئی مجبوریوں سے خاموش ہے۔اس افسانے کا یہی کچھ تاثر قاری پر ہوتا ہے اور افسانے کا عنوان بھی یہی کہتا ہے کہ ''چشم دید گواہ'' محض اسرار ہے۔اس نے گناہ کا ارتکاب تو نہیں دیکھا مگر گناہ کا انجام دیکھ لیا ہے۔

''خوف زدہ کتے'' میں پھر ایک بار ہمیں ایسے انسان ملتے ہیں جو آزادانہ ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں اور اپنی حرکتوں پر انہیں شرم تک نہیں آتی۔ایسے انسانوں سے جانور تک نفرت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔لاشوں کو دیکھ کر کتے سہم جاتے ہیں اور وہ انسانوں کے ساتھ رہنے سے کتراتے ہیں۔گھر کا سب سے ''مہذب'' ایک کتا ہے، جو اپنے کم سن مالک سے بے حد محبت کرتا ہے مگر وہ مجبوراً اپنے مالک سے اپنی محبت کو قطع کر کے اپنے ہم جنسوں سے جا ملنے اور وحشی جانور ہی بنے رہنے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔افسانہ نگار کا یہ طنز آج کے متصادم ہر انسان سے ہے، جو اپنے ہم جنسوں کا خون کرتا ہے۔آج کی دنیا میں تشدد کئی صورتوں میں سر اٹھا چکا ہے۔''شمال اور جنوب'' جیسی کمتیں اس سے مبرا نہیں۔

اس افسانے کے موضوع کو اگر کینوس پر پھیلا دیتے ہیں تو ایک شہر کے دو محلے اس دنیا کے دو ممالک بن سکتے ہیں مگر اس کینوس کو پھیلنے نہیں دیا گیا۔جُز میں کُل کی اصلیت جب واضح ہو تو خواہ مخواہ 'کُل' میں کیوں وقت کھپایا جائے۔جامی ایک کم سن لڑکا ہے مگر اس کے ذہن کی پختگی بہت سی باتوں کو سمجھنے کے قابل ہے۔جامی کے باپ میں ایسی فطانت نہیں۔آج کی نئی دنیا میں معمر لوگوں سے زیادہ نوجوان شہری بہت باشعور اور حساس اور وہ اپنی نظر سے معاملات کو دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔جامی اپنے چہیتے کتے 'شیرو' کی بے زبانی میں اس کی بے چینی پڑھ لیتا ہے اور اسے جانے دیتا ہے تاکہ وہ اپنے ہم جنسوں میں خوش رہے اور مہلک اور خون بہانے والے

انسانوں سے دور رہے۔ جامی کے الفاظ کتنے معنی خیز ہیں:

''ابو...وہ کتے خوف زدہ تھے۔ بے حد خوف زدہ، انہوں نے چار زندہ چلتے پھرتے انسانوں کو انسانوں کے ہاتھوں بے دردی کے ساتھ قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا....ابو مجھے یقین ہے کہ وہ انسانوں کے ہاتھوں انسانوں جیسی موت مرنا نہیں چاہتے تھے۔ اب انسانوں کی بستی میں ان کا گذارا ناممکن ہوگیا تھا۔ ابو کیا ہم انسان اس قدر ظالم ہیں کہ اپنے جیسے زندہ انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہمارے لئے کوئی بڑی بات ہی نہیں۔''

یہ کہہ کر جامی دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ افسانہ نگار انسانوں میں جامی جیسا معصوم اور اچھا انسان بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے جامی جیسا ایک کردار پیش کیا ہے۔

ناصر بغدادی کے ان افسانوں میں مکالماتی زبان کراچی کی نکسالی زبان ہی ہے اور قاری کو اس میں برجستگی ملتی ہے اور موزوں کفایت لفظی بھی۔ یہ مکالمے افسانے کی ضرورتوں کے مطابق ہیں اور مکالموں سے ہٹ کر جو زبان ہے وہ بھی کچھ دقیق اور گنجلک نہیں ہے۔ بامحاورہ زبان کا لطف افسانے کے آغاز سے انجام تک برابر لیا جاسکتا ہے۔ لمحاتی گرفت و گریز کے ماحول میں کرداروں کی سست و تیز روش حسب واقعہ ہے۔ اس میں افسانہ نویس نے زیادہ ایڈیٹنگ سے بھی کام نہیں لیا ہے۔ بعض جگہ تفصیل کچھ اکتا دینے والی ضرور ہے مگر وہ لازمی تفصیل ہونے کے باعث قاری کو گوارہ کرنی پڑتی ہے۔ ''بے دست و پا'' میں ایسا ہی کچھ رویہ افسانہ نگار نے روا رکھا ہے۔ خواہ مخواہ ''ایک اپاہج'' کو درست پاسے زیادہ گھومنے دیا گیا ہے اور وہ افسانہ نگار ہی کی ایما پر مختلف ماحول میں بار بار پہنچا دیا گیا ہے۔ اس افسانے میں اختصار سے بہت سے تاثرات ناقص ہو سکتے ہیں۔ اس لئے افسانے کو ضرورت سے زیادہ طویل بنا دیا گیا ہے کیوں کہ اس میں صرف ''اپاہج'' ہی کو نہیں، اس کے تعلق سے متعدد گونا گوں انسانوں کو پیش کرنا ہے، جن کے رویوں میں مختلف رنگ موجود ہیں۔ بھیک دینے والے، رحم دلوں کی وجہ سے بھیک منگنی ایک پیشہ بن جاتی ہے، بھیک نہ دینے والے بے رحم اور سخت دل لوگوں کا بھکاریوں کے ساتھ رویہ بھی کچھ بھلا نہیں۔ کیوں کہ بھیک منگنی ایک مجبوری ہے اور کسی مجبور کو زک پہنچانا، انسانیت نہیں ہے۔ شاید بھک منگنی کو پیشہ بننے نہ دینے کا رویہ پہلے ہی اختیار کیا ہوتا تو بھیک منگوں کی تعداد میں اتنا اضافہ نہ ہوتا۔ ''اپاہج'' بھیک منگوں کے لئے ایک ''اچھی اور صحت مند'' دولت ہے۔ جو ''سرمایہ'' کے طور پر کام

آتی ہے اور یہ سرمایہ بازاروں میں خوب کام آتا ہے۔ اس بے چارے کا اپاہج پن اتفاقاً اس کے بچپن میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیل کھیل میں پیدا ہو گیا تھا اور پھر اس کی سوتیلی ماں کا جبر اور باپ کی نفرت نے اس کو گھر سے دور کر دیا اور بھوک نے اس کے ہاتھ پھیلا دئے اور ہتھیلیوں پر رحم دلوں کے سکے ٹپکنے لگ گئے تھے۔ پھر ایک مزید حادثہ میں اس کے ایک ہاتھ کے علاوہ اس کی ایک ٹانگ بھی لنک سی گئی تھی اور اس کے ''سرمایہ'' میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ سماج میں اسے رحم دل بھی ملے اور پنواڑی کی طرح (جو اس کے باپ سے زیادہ ظالم تو نہیں مگر اس کے لگ بھگ تھا) کے لوگ بھی ملے اور اس کے دن اس کی مرضی کے مطابق گذرنے لگے۔ شہر کا ایک سایہ دار پیڑ اس کا دوست تھا، جس نے اپنے دامن میں بلا تفریق اس کے لئے کشادہ جگہ فراہم کر دی تھی۔ وہ حالات اور موسموں سے لڑتا بھڑتا سانسیں لے رہا تھا۔ پنواڑی کی دکان کے آگے اس کی دکان سجی مگر اسے پنواڑی کی جلی بجھی سننی پڑی تھی۔ وہ اس کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ اس حیثیت سے غیر حساس ہو گیا تھا مگر اس کا ایک حس وہاں جاگا تھا۔ وہ تھا ریڈیو پر نشر کی جانے والی خبروں میں ملکی دشمنوں کے کرتوتوں کے اعلان میں اس کے رگ و ریشہ میں ملکی آزادی کی حمیت سر اٹھا سکتی تھی۔ یہ افسانہ تجریدی بھی ہے اور غیر تجریدی بھی۔ سماجی بھی ہے اور معاشرتی بھی، حسی بھی ہے اور جذباتی بھی۔ غرض ایک ''اپاہج'' کے کردار کے آس پاس کے تانے بانوں سے افسانے میں مختلف پہلو ابھر آئے ہیں اور یہ ناصر بغدادی کی سوچوں کا ایک نیا تجربہ ہے اور اس تجربے میں نیا پن بھی ہے اور افسانے کے موضوع میں بھی تازگی اور انفرادیت چھلکتی ہے۔ یہ افسانہ یقیناً اس موضوع کے افسانوں میں بالکل انوکھا اور منفرد ہے۔ اس افسانے کا اختتام پورے افسانے کی جان ہے:

''ابے او صورت حرام!'' پنواری نے کھنکار کر اسے مخاطب کیا۔ ''خبروں کے بعد اگر تو یہاں سے رفو چکر نہیں ہوا تو پھر....''

''بھیا خبروں کی خاطر ہی تو وہاں سے یہاں آیا ہوں۔ وہاں ریڈیو ہوتا تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ بڑی بے چارگی سے بولا۔ ''تمہاری طرح میں بھی تازہ حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آخر میں بھی تو یہاں کا رہنے والا ہوں نا؟ ویسے اگر تم مارنا چاہتے ہو تو شوق سے مار لو۔ خدا نے تمہیں طاقت دی ہے۔''

''یہ بتاؤ اگر تم طاقتور ہوتے تو کیا صمدو سے لڑتے؟'' پنواری کی دکان کے قریب کھڑے ہوئے ایک خونچہ والے نے اس سے پوچھا۔

''ہاں ضرور لڑتا'' اس نے ایک طویل سانس بھر کر کہا۔ ''مگر صمدو بھائی سے نہیں''

''تو پھر کس سے؟'' کسی نے سوال کیا۔

''ان بزدلوں سے جنہوں نے چوروں کی طرح ہم پر حملہ کیا ہے۔'' اس کی آنکھیں یکبارگی چمکنے لگیں۔'' سچ کہتا ہوں صمدو بھائی سچ کہتا ہوں۔ اگر میرے ہاتھ پیر ہوتے تو میں آج تمہاری دکان کے سامنے نہ پڑا ہوتا۔ میں بھی دشمنوں کے خلاف لڑتا، جو رات کے اندھیرے میں آگ اور خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ جنہوں نے ظلم کی حد کر دی ہے۔ میں ان سے لڑتا، میں۔'' فرطِ جذبات سے اس کی آواز کانپنے لگی۔

مذکورہ بالا تینوں افسانوں میں ہمیں ناصر بغدادی کا نہ صرف اسلوب دکھائی دیتا ہے بلکہ ان کی مقصدیت بھی خوب ابھر کر سامنے دکھائی دیتی ہے۔

ان سے متعلق مبصرین اور نقاد کی آراء بہت خوب اور صحیح ہیں۔ کنور سین لکھتے ہیں:

''میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ ناصر بغدادی اپنی تہہ دار تحریر، قوت بیانئے ،موضوعاتی تنوع اور نادر پیرایہ اظہار کی بدولت ایک منفرد اور ممتاز افسانہ نگار تصور کیا جاتا ہے۔''

اقبال متین لکھتے ہیں:

''ناصر بغدادی کی تحریر میں متن کچھ اس ڈھب سے بہ یک وقت عیاں ونہاں رہتا ہے کہ تحریر کچھ اس طرح ملفوفہ لگتی ہے، جو ہے وہ پڑھی نہ جائے اور جو نہیں ہے وہ پڑھ لی جائے۔''

ان کی تحریروں میں پوری تحریر کا اصل مقصد کبھی آغاز ہی میں نظر آجاتا ہے۔ کبھی درمیان میں اور کبھی آخر میں مگر یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ ان کے ہر مکالمے میں کرداروں پر تبصرہ ہی تبصرہ ہوتا ہے یعنی لفظوں کی سیالی کے ساتھ ساتھ کرداروں کے خاکوں میں رنگ بھرتے جاتے ہیں اور تحریر کے اختتام پر پورے کردار پوری آب وتاب کے ساتھ مکمل اور واضح ہو جاتے ہیں اور ان میں کسی طرح ادھورا پن نہیں رہتا۔ کرداروں کی فعالیت بھی بلا رکاوٹ جاری وساری رہتی ہے اور جس مقصد کے لئے وہ کردار ڈھالا گیا، وہ مقصد اختتام پر واضح ہو جاتا ہے اور اس طرح افسانہ کا موضوع قاریوں کے لئے دلچسپ بن جاتا ہے۔

☆☆☆

رؤف خیر
Cell:09440945645

دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

ماہ نامہ 'الحمراء' کے سالنامے جنوری ۲۰۱۳ء کے شماروں ڈاکٹر جاوید اقبال کی کی خودنوشت سوانح حیات ''اپنا گریباں چاک'' کے تعلق سے مختلف ارباب نظر کی آراء نظر سے گذریں، تو اس خود نوشت کے مطالعہ کا اشتیاق جاگا۔ میرے کرم فرما پروفیسر غازی علم الدین (میر پور آزاد کشمیر) نے ازراہِ کرم پاکستان سے اپنے مطالعہ کا نسخہ (اضافہ شدہ ایڈیشن اپنا گریباں چاک مطبوعہ ۲۰۰۶ء سنگ میل پبلی کیشنز لاہور) عنایت فرمایا۔ جس کے لئے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کا ہائی کورٹ لاہور کے چیف جسٹس کے عہدے سے باسٹھ برس کی عمر میں ۱۹۸۶ء میں ریٹائرمنٹ ہوتے ہی اسی روز سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ انھوں نے ملک اور بیرون ملک کئی سیمیناروں میں حصہ لیا۔ اتنے ممالک کا سرکاری سطح پر دورہ کیا کہ اقبال سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

علامہ اقبال، نظام حیدر آباد آصف سابع میر عثمان علی خاں کے دور حکومت میں حیدر آباد دکن میں ہائی کورٹ کا جج بننا چاہتے تھے مگر یہ ممکن نہ ہوسکا مگر جاوید اقبال نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ پاکستان کی عدالت عالیہ کے منصب جلیلہ سے وابستہ رہے۔

جاوید اقبال نے کئی بار عمرے کئے۔ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے مگر اقبال

یہ آرزو اپنے سینے میں لے کر اس دنیا سے گزر گئے، اپنی ناکام آرزو کو انھوں نے جو شعری پیرایہ دیا ہے ، وہ یادگار بے مثال ہے۔

''اپنا گریباں چاک'' میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے پاکستان اور بیرون پاک سیاسی صورت حال کا جو نقشہ کھینچا، اس سے ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف انھوں نے انتخابات میں حصہ لیا اور فرزند اقبال ہونے کے باوجود شکست کھائی۔ اس کے باوجود بھٹو نے انھیں اپنے ساتھ رکھا۔ اسی طرح یہ جنرل ضیاء الحق کے کٹر اسلامی رویے سے نالاں تھے۔ اس کے باوجود انھیں اہم اہم مواقع پر جنرل ضیاء الحق یاد فرمایا کرتے تھے اور ان سے مشورے طلب کرتے تھے۔ غرض جاوید اقبال نے بڑی کامیاب زندگی گذاری اور ان کے اپنے خیال میں یہ کامیابی انھوں نے اپنے بل پر اپنی قابلیتوں کے سہارے حاصل کی ہے۔ ان کی کامیابیوں میں اقبال کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

جاوید اقبال کی پیدائش ۱۹۲۴ء کی اور علامہ اقبال نے ۱۹۳۸ء میں وفات پائی۔ گویا جس وقت باپ کا انتقال ہوا، بیٹا صرف چودہ برس کا تھا۔ ڈاکٹر جاوید نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بعض انکشافات بھی کئے۔ کہتے ہیں:

''ماہ رمضان میں گھر میں والدہ اور دیگر خواتین روزے رکھتیں اور قرآن شریف کی تلاوت کرتیں۔ گھر کے ملازم بھی روزے رکھتے۔ البتہ میرے والد علامہ اقبال شاذ و نادر ہی روزے رکھتے تھے اور جب رکھتے تھے تو ہر چند گھنٹوں کے بعد علی بخش کو بلوا کر پوچھتے کہ افطاری میں کتنا وقت باقی ہے۔

گھر کی خواتین کو نماز پڑھتے دیکھنا مجھے یاد نہیں۔ والد کو کبھی کبھار فجر کی نماز پڑھتے ضرور دیکھا ہے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، مجھے ماں باپ نے کبھی نماز پڑھنے یا روزہ رکھنے کے لئے مجبور نہیں کیا۔

مجھے نہانے سے سخت نفرت تھی لیکن عید کی شب گرم پانی سے والدہ نہلاتیں اور میں بڑے شوق سے نہاتا۔ صبح اٹھ کر نئے کپڑے پہنے جاتے۔

کلائی پر باندھنے کے لئے مجھے ایک سونے کی گھڑی دی جاتی، جو افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ نے مجھے تحفے کے طور پر بھیجی تھی۔

ایک دو مرتبہ والد اور والدہ کے ساتھ سیال کوٹ بھی گیا تھا۔ تب میرے دادا بقید

حیات تھے۔ان کا نام شیخ نور محمد تھا مگر شیخ نتھو کہلاتے تھے،اس لئے کہ ان کی ولادت پر (ان کی) والدہ نے انھیں ناک میں نتھ پہنادی تھی۔ان کی پیدائش سے پہلے ان کے والدین کے ہاں گیارہ لڑکے پیدا ہوئے مگر پیدا ہوتے ہی مرجایا کرتے تھے،صرف یہی بچے اور لمبی عمر پائی۔آپ کسی مدرسے کے پڑھے ہوئے نہیں تھے۔''

خود اپنی پیدائش کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''میری ولادت سے کچھ ماہ پیشتر میرے والد سرہند تشریف لے گئے۔شیخ احمد سرہندی کے مزار پر حاضری دی اور دعا کی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انھیں اولاد نرینہ سے نوازا تو اسے ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔چنانچہ جب میں تقریباً دس برس کا ہوا (۲۹ر جون ۱۹۳۴ء) تو مجھے ہمراہ لے کر سرہند شیخ احمد کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔''

جاوید اقبال کو لے کر مذکورہ مزار پر منت پوری کرنے کا ذکر علامہ اقبال کے ایک مکتوب میں بھی ملتا ہے۔جو ۱۹۳۴ء میں لکھا گیا تھا۔گویا مرنے سے چار برس پہلے تک بھی وہ مزاروں پر حاضری کے قائل تھے۔

اپنی جنم پتری کے بارے میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے لکھا:

''میرے والد کے ایک ہندو دوست راجہ سرنریندر ناتھ نے انھیں میری جنم پتری بنوانے کی صلاح دی اور اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کیں۔میرے والد نے میری ولادت کی تاریخ کے ساتھ صحیح وقت کی تفصیل بھی انھیں مہیا کردی۔

شاید جنم پتری یہ معلوم کرنے کے لئے بنوائی گئی کہ مستقبل میں ان کا بیٹا اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں کوئی نمایاں کردار کرنے کے قابل ہوتا ہے یا نہیں؟''

آگے چل کر یہی بیٹا کہتا ہے:

''میں تو اپنے سال ولادت یعنی ۱۹۲۴ء کو عالم اسلام کے لئے نہایت اہم سال سمجھتا ہوں کہ اسی سال ترکی میں خلافت یعنی مسلم سیاسی نظام میں مطلق العنانیت کے فرسودہ خیالات کا خاتمہ ہوا۔''

یہ وہی خلافت ہے،جس کی بقا کے لئے مولانا محمد علی،شوکت علی کے ساتھ ساری ملت نے تن من دھن کی بازی لگائی تھی اور گاندھی جی نے بھی ہم نوائی کی تھی۔یہ وہی اقبال ہے جس نے کبھی کہا تھا۔

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار وزبوں

ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی والدہ سردار بیگم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو بیالیس سال کی عمر میں ہوا، جب وہ گیارہ سال اور ان کی بہن منیزہ پانچ سال کی تھیں۔ مرنے سے پہلے سردار بیگم نے علامہ اقبال کی ایماء پر تھوڑے سے پس وپیش کے بعد جاوید منزل اپنے بیٹے جاوید کے نام ہبہ کردی۔ علامہ اقبال نے ایک کرایہ نامہ تحریر کیا اور تین کمروں میں رہائش کا پیشگی کرایہ ہر ماہ کی اکیس تاریخ کو ادا کردیا کرتے تھے۔

آگے چل کر حکومت پاکستان نے ''جاوید منزل'' منہ مانگے دام دے کر خرید لی اور جنرل ضیاء الحق کے حکم پر رقم ادا کردی گئی اور اس میں اقبال میوزیم کا افتتاح بھی جنرل ضیاء الحق ہی نے کیا، جاوید منزل کی فروخت سے جو معقول رقم حاصل ہوئی، اس سے ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک عالی شان مکان تعمیر کرایا، جہاں اب وہ رہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے جو مکان اپنی بیوی کے نام پر تعمیر کیا تھا اور جسے انھوں نے جاوید کے نام ہبہ کروایا تھا، وہی جاوید کے نئے مکان کی بنیاد بنا۔

علامہ اقبال کی پہلی بیوی سے دو بچے ہوئے، آفتاب اقبال اور معراج بیگم (جو جوانی میں فوت ہوگئیں) اس طرح شاید اقبال اپنی جائداد کو پہلی بیوی کی اولاد سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اسے دوسری بیوی سردار بیگم (والد جاوید) کے نام پر خریدا اور پھر سردار بیگم کے مرنے سے پہلے اسے جاوید کے نام ہبہ بھی کروادیا تاکہ آگے چل کر کوئی مسئلہ وراثت کھڑا نہ ہونے پائے۔ ویسے شریعت کے مطابق باپ اپنے کسی بچے کو اپنی جائیداد سے بے دخل نہیں کرسکتا۔ علامہ اقبال اپنے بڑے بیٹے آفتاب اقبال سے نالاں ضرور تھے اور آفتاب نے بھی علامہ کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ یہ تلخ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی خودنوشت سوانح کے تیرہویں باب میں علامہ اقبال کے نام ایک بہت ہی معلوماتی ''دوسرا خط'' لکھا ہے، جس میں انھوں نے اپنے والد کے عقائد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً

''۱-(علامہ اقبال) کی رائے منصوبہ بندی سے متعلق قانون سازی کے حق میں ہے۔ (صفحہ: ۲۸۲)

۲-آپ (اقبال) ایک سے زائد ازدواج (ازواج) کے امتناع کو شرعاً جائز قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ معاشرتی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی ریاست

سیفی سرونجی

اکیسویں صدی اور اردو ناول:

قسط-۹

گذشتہ شمارے میں کشمیر کے مشہور ناول نگار وحشی سعید کے ناول پر گفتگو کی گئی تھی، اس بار مشہور ناول نگار و افسانہ نگار اقبال انصاری اور کشمیر ہی کے دو ناول نگاروں رخسانہ تبسم اور عمر فرحت کے ناولوں پر گفتگو کی جارہی ہے۔

اپنے:

اقبال انصاری اردو کے ان مشہور افسانہ نگاروں، ناول نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں، جنہوں نے پچھلے پندرہ، بیس سالوں میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ ان کے ہم عصروں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا، جس نے کہ اتنی بڑی تعداد میں افسانے اور ناول لکھے ہوں، ان کے اب تک بارہ افسانوی مجموعے اور چھ ناول شائع ہو چکے ہیں، وحشی، آخری پٹھان، جست، اکیلی اور تازہ ناول 'اپنے'۔ اکثر زیادہ لکھنے والوں کے بارے میں نقادوں کی رائے یہ ہوتی ہے کہ وہ معیار برقرار نہیں رکھ پاتے، بس انھیں لکھنے اور چھپنے سے کام رہتا ہے۔ یہ بات اکثر وہی لوگ کہتے ہیں جو خود زیادہ نہیں لکھ پاتے۔ ظاہر ہے کہ جس میں جتنی تخلیقی قوت ہوگی، وہ اتنا ہی لکھے گا، ویسے بھی یہ فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرتا ہے کہ کس نے کیا لکھا، کیسا لکھا۔ وقت ایک ایسی کسوٹی ہے، جو سارے اچھے برے کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

یوں تو اقبال انصاری کے میں نے دوسرے ناول بھی پڑھے ہیں، خاص طور پر 'اکیلی' پر تو میں نے تبصرہ بھی کیا تھا لیکن اقبال انصاری کا یہ ناول 'اپنے' کچھ زیادہ ہی اپنا لگا۔ کہ اس میں اپنوں سے متعلق جن تجربات سے آج کا انسان دوچار ہے، اس کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ ایک عام آدمی

کا سربراہ کسی بھی قرآنی حکم یا اجازت کو تعویق، تحدید یا توسیع کرسکتا ہے۔
(ص:۲۸۲)

۳-مولانا شبلی (نعمانی) کی طرح آپ (علامہ اقبال) مسلمانوں میں فری مارکیٹ اکانومی Free market economy کے منافع کو ربوا (سود) کے زمرے میں نہیں لاتے۔(ص:۲۸۲)

۴-علامہ اقبال کے نزدیک جنت اور دوزخ مقامات نہیں بلکہ احوال یا کیفیات ہیں۔(ص:۲۸۲)

۵-اقبال کے خیال میں تو جنت بھی مستقل عشرت کدہ یا مسلسل عیش وآرام کا کوئی مقام نہیں بلکہ انسان موت کے بعد اگر چاہے تو حیات کا تسلسل ختم کر کے ہمیشہ کے لئے نیست ونابود ہوسکتا ہے۔ایسی روحانی خودکشی کا اسے اختیار ہے۔(ص:۳۱۸)''

۶-علامہ اقبال کا قول ہے''بدی کی اپنی ایک تعلیمی حیثیت ہے، نیک لوگ عموماً بے وقوف ہوتے ہیں۔''اپنی سادہ لوحی کے سبب)(صفحہ:۲۵۴)

مخفی مبادنظام دکن آصف جاہ سابع میر عثمانی علی خاں کے دور حکومت میں ایک تحصیلدار کی ماہانہ تنخواہ دس بارہ روپئے (حالی) سے زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی۔خوش حالی کے اس دور میں اتنے مشاہرے میں وہ عیش کیا کرتا تھا۔علامہ اقبال کا اپنے بچوں کی آیا (گورنس) کو ماہانہ پچاس روپئے تنخواہ دینا گویا حاتم کی قبر پر لات مارنا ہے۔اپنی بیوی کے انتقال کے بعد علامہ اقبال نے اپنے بچوں کی نگہداشت کے لئے ایک جرمن خاتون ڈورس کو ماہانہ پچاس روپے پر اپنے گھر رکھا، جن کی بہن علی گڑھ یونیورسٹی میں بیالوجی کے پروفیسر کی اہلیہ تھیں۔ان سے ملنے ڈورس آئی تھیں۔مگر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ترغیب پر وہ علامہ اقبال کے بچوں کی گورنس بن کر لاہور آگئیں۔اس طرح اقبال کے گھر کا ماحول، رہن سہن مغربی انداز کا ہوگیا۔بچے بہت خوش ہوئے۔اقبال چونکہ جرمن زبان جانتے تھے، وہ ڈورس سے جرمن ہی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔اپنی بیٹی منیرہ سے بھی کہتے تھے کہ جرمن زبان سیکھے۔

اقبال کے بھائی نے منیرہ کے لئے ایک چھوٹا سا برقع (غالباً مقنع) تحفتاً بھیجا تو ڈورس سخت غصہ میں آئیں۔اقبال ہنس دئے اور فرمایا:

''میرے بڑے بھائی نے یوں منیرہ کے لئے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔آپ ان کا تحفہ رکھ لیں۔ضروری نہیں کہ منیرہ یہ برقع (مقنع) اوڑھے اور میں تو یہ بھی نہیں کہہ

سکتا کہ جب منیرہ بڑی ہوگی تو خواتین میں پردہ رہے گا بھی یا نہیں۔''

یہ غالباً مقنع تھا جو چھوٹی بچیوں کو بطور تربیت شرعی گھرانوں میں پہنایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر جاوید نے لکھا:

''منیرہ کے لئے وہ ننھا سا برقع اچھا خاصا تماشا تھا۔ وہ برقع پہنے گھر میں ادھر ادھر بھاگتی پھرتی۔ حتیٰ کہ اس بھاگ دوڑ میں برقع پھٹ کرنا کارہ ہوگیا۔''

ڈورس کے بحیثیت گورنس تقرر سے پہلے کوئی مسلم خاتون بھی رجوع ہوئی تھیں مگر اس برقع پوش خاتون کی شرط تھی کہ اقبال اس سے نکاح پڑھوالیں مگر اقبال نے اسے ہنس کر ٹال دیا۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''وہ نہایت رجعت پسند قسم کی مسلمان لگتی تھیں۔ برقعی پوش تھیں، منیرہ نے انھیں دیکھتے ہی مسترد کر دیا تھا۔''

غالباً وہ دیندار خاتون ایک غیر محرم کے ساتھ ایک ہی چھت کے تلے رہنے کا کوئی شرعی جواز چاہتی تھیں لیکن اقبال آخری عمر میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ مغربی تعلیم کے مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں نے خود بھی اس خاتون کو رد کر دیا۔

وہ اقبال جس نے اکبر اعظم کی طرح ایک بزرگ کے مزار پر جا کر ایک بیٹے کے لئے منت مانگی اور منت پوری کرنے کے لئے اپنے بیٹے کو لے کر شیخ احمد سرہندی کے مزار پر حاضری بھی دی، وہ اقبال جس نے بچوں کی خاطر کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا بلکہ تعدد ازدواج پر امتناع کو شرعاً جائز قرار دیا تھا، وہ اقبال جس نے ڈاکٹروں کے مشورے کے باوجود وی آنا (آسٹریا) جا کر اپنے گلے کی تکلیف کا علاج کروانا پسند نہیں کیا کہ اس طرح (اپنے علاج پر) روپیہ خرچ کر کے وہ اپنے بچوں کی آئندہ بہتر زندگی کا حق غصب کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ بھوپال کے نواب کی پیش کش قبول کر کے بجلی کے جھٹکوں کے ذریعہ مفت علاج کرواتا رہا، وہ اقبال جو جاوید منزل کا مالک ہوتے ہوئے بھی، جاوید کو ہر ماہ پابندی سے کرایہ ادا کرتا تھا، وہ اقبال جو یہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا باضابطہ Disciplined کی زندگی گذار کر سرخ رو ٹھہرے۔ ایسے صاحب ایثار باپ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال فرماتے ہیں:

''والد کی وفات کے بعد میں ان کے نافذ کردہ ڈسپلن سے آزاد ہوگیا۔ جن باتوں سے انھوں نے منع کر رکھا تھا، میں نے بڑی رغبت سے ان میں سے ہر ایک کو اپنایا۔ صحیح و غلط میں غلط۔ اور نیکی و بدی میں۔ بدی کا راستہ منتخب کرنا بہتر سمجھا۔ اگر سرِ شام گھر میں موجود رہنے کا حکم تھا تو میں آدھی رات سے پہلے گھر میں قدم نہ رکھتا تھا۔ اگر سنیما

دیکھنا منع تھا تو ہر روز دو دو بلکہ تین تین شو دیکھتا۔ روزمرہ کے باورچی خانہ کا حساب لکھتے وقت پیسوں میں کھیلا کرتا۔ رنگ برنگی ریشمی قمیص، مہنگے ولایتی بوٹ اور یورپی انداز کے سلے ہوئے سوٹ، نکٹائیاں اور کوٹ، دستانے، اور فلٹ ہیٹ زیب تن کرتا، مئے نوشی، یوروپی طرز کے رقص، اور رات کے کھانے کے لئے معروف جگہوں (پر جانا)''

اور تو اور جاوید اقبال کو بہت گراں گزرتا ہے جب لوگ انھیں علامہ اقبال کے حوالے سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی انا کو ٹھیس لگتی ہے۔ انہوں نے کتاب کے پیش لفظ میں صاف صاف لکھا:

''میں عمر میں پاکستان سے بڑا ہوں۔ میرے والد علامہ محمد اقبال ایک عظیم شاعر، فلسفی اور تصور پاکستان کے خالق سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے فرزند ہونے کی حیثیت سے زندگی کے مختلف ادوار میں میرا ردعمل مختلف رہا ہے۔

بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا، تو میں نے برا نہیں مانا کیونکہ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔

جوان ہوا تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا۔ یہ میرے لئے پدرم سلطان بود کی بنا پر فخر کا مقام تھا۔

زندگی میں اچھا برا مقام پیدا کیا تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا، تو مجھے برا لگا۔ یہ میری انا کی نشو ونما میں مداخلت تھی۔

اب بوڑھا ہو چکا ہوں، تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔

عجیب اتفاق ہے میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا۔

بہر حال میں نے کن ہیلوں سے ایک بہت بڑے درخت کے سائے سے نکل کر اپنا مقام پیدا کرنے کی کوشش کی، یہی میری داستان حیات ہے۔''

علامہ اقبال سے تعلق کو بوجھ سمجھنے والے فرزند کے تعلیمی مدارج کا یہ حال ہے کہ ساتویں جماعت میں فیل، نویں جماعت میں فیل، ایف۔ اے تھرڈ کلاس پاس، بی۔ اے دوسرے درجے میں کامیاب، ایم۔ اے فیل، بار ایٹ لا فیل (دونوں دوسری بار کامیاب) انتخابات میں ذوالفقار علی بھٹو کے بالمقابل ناکام۔

اتنی ناکامیوں کے باوجود ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے اور جس دن ریٹائر ہوئے اسی دن سپریم کورٹ کے جسٹس بنائے گئے۔ کیا میرٹ کی بنیاد پر یہ ممکن تھا۔ علامہ اقبال کے فرزند ہونے

کے ''رعایتی نشانات'' ہی تو ان کے کام آئے۔

پوری کتاب میں اپنے باپ کی اتنی تعریف نہیں جتنی ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی بیوی ناصرہ کی شان میں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جاوید منزل کی (حکومت کے ہاتھ بیچ کر) حاصل شدہ رقم سے تعمیر کردہ دو منزلہ عمارت ناصرہ بیگم کے نام ہبہ کردی۔ حکومت برطانیہ نے اقبال کے فکر وفن کے اعتراف میں ''سر'' کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا، جس کا ذکر ڈاکٹر جاوید نے کہیں نہیں کیا حالانکہ ٹیگور کی طرح اقبال نے سر کے خطاب سے دست برداری کا اعلان نہیں کیا تھا۔

جگن ناتھ آزاد کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے، جنھیں نہ صرف علامہ اقبال کا تقریباً کلام حفظ تھا بلکہ وہ اقبال کے حوالے سے پہچانے جانے پر نازاں بھی تھے۔ ایسے وقت جب کہ ہندوستان میں اقبال کا نام لینا بھی جرم کے مماثل تھا، جگن ناتھ آزاد نے سرکاری سطح پر علامہ اقبال کی شاعرانہ حیثیت کا احساس کروایا۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کو ترانے کا درجہ دلایا، جو آج بھی برقرار ہے۔ بہ ذات خود وہ جیسے بھی شاعر رہے ہوں، علامہ اقبال جیسے برگد کے زیر سایہ سانس لینے ہی میں زندگی سمجھتے تھے۔ علامہ اقبال کے پرستار اور ہم جلیس راجہ حسن اختر کے بیٹے محمود اختر کیانی کی اقبال سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ وہ انھیں اپنا تایا سمجھتے تھے اور اگر کوئی ناہنجار کسی بھی سطح پر اقبال کے خلاف کسی بھی قسم کی تنقید کرتا تو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے۔ (گھنگھرو ٹوٹ گئے-قتیل شفائی)

''اقبال کی خامیاں'' تلاش کرنے والے لبھو رام جوش ملسیانی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کتابچہ اپنے نام سے شائع کروائے، تاہم جس کا دنداں شکن جواب شمس الرحمٰن فاروقی نے دیا۔ کشمیر کے ڈاکٹر بشیر احمد نحوی سے لے کر جنوبی ہند کے سید احمد ایثار، بہادر یار جنگ، مضطر مجاز اور رؤف خیر تک اقبال کے چاہنے والوں کا ایک قافلہ ہے، جو رواں دواں ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ علامہ اقبال سے پہلے بھی کوئی ''خدائے سخن'' نہیں اور اقبال کے بعد شاعری کا دعویٰ کرنا، نبوت کا دعویٰ کرنے کے برابر ہے، زیادہ سے زیادہ اولیائے غزل اور اوصیائے نظم ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی

مجتبیٰ حسین

غالباً ۱۹۸۲ء کی بات ہے۔ ہم دہلی میں تھے۔ اپنے محبوب طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین سے شرف ملاقات حاصل کرنا تھا۔ سوال یہ تھا کہ ان کے دولت کدہ پر جائیں یا ان سے دفتر میں ملیں۔ ہم نے سوچا کہ آدمی اگر گھر پر کسی سے نہ ملنا چاہے تو گھر میں موجود رہ کر بھی خود کو غیر حاضر بتا سکتا ہے۔ گھر کے کسی کونے کھدرے میں چھپ سکتا ہے۔ عقبی دروازے سے فرار ہوسکتا ہے اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر اس کا ملازم یہ کہدے کہ ''صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔'' تب بھی ہم کیا کر سکتے ہیں؟ لہٰذا ہم نے طے کیا کہ ان کے دفتر پر دھاوا بولیں گے اور ہم ان کے دفتر این، سی آر، ٹی کیمپس جا دھمکے۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا، خوش ہو کر ملے۔ پھر باتیں ہونے لگیں۔

دہلی کب آئے؟

''آج دوسرا دن ہے۔''

''قیام کہاں ہے؟''

''جناب مظفر حنفی کے یہاں''

''آپ کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ (مہاراشٹر میں اردو طنز و مزاح کا آغاز وارتقاء) کس مرحلہ میں ہے؟''

''شیخ رحمٰن صاحب آپ نے اپنے مقالے میں میرا تذکرہ کیا یا نہیں؟ میری جائے پیدائش عثمان آباد ہے، جواب ریاست مہاراشٹر کا حصہ ہے۔''

''آپ کے تذکرے کے بغیر یہ مقالہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کہ اس نے

آپ کا تعلق مہاراشٹر سے جوڑ دیا، اب ہم اہل مہاراشٹر بھی آپ پر فخر کر سکتے ہیں۔''

''کن تاریخی چیزوں کو دیکھا؟''

''محترمہ قرۃ العین حیدر، جناب فکر تونسوی کو دیکھا، ان سے شرف ملاقات حاصل کی، جناب ایم۔ایف۔حسین کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ ہم دہلی تشریف لا رہے ہیں۔وہ ودیش روانہ ہو گئے۔''

دوران گفتگو ہم نے دیکھا کہ دفتر میں چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی ہوئی ہیں۔ان کے ٹیبل کا بھی یہی حال ہے۔ہم نے سوچا کیا بڑے ادیب ایسے ہوتے ہیں؟ سوچ کی دوسری لہر نے ہمیں جواب دیا۔جس شخص کا مشن ہمہ وقت سماجی وسیاسی، تہذیبی وتمدنی، ادبی وثقافتی بگاڑ اور اس سے پیدا شدہ بدنظمی، افراتفری، انتشار اور بے چینی کی نشاندہی کرنا اور ان کے خلاف احتجاج کرنا ہے، اسے اپنے آس پاس کی چیزوں کی طرف دھیان دینے کا وقت ہی کہاں ملتا ہوگا۔کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ انھوں نے اپنی خاص الخاص چیز، اپنے ''قلم'' کو بڑے اہتمام سے رکھا ہے۔وہ قلم جو ان کی شخصیت کا اٹوٹ حصہ ہے، جو ان کی شخصیت کی تکمیل کرتا ہے۔ان کا ہتھیار ہے، جس کا استعمال کر کے وہ اپنے کالموں میں دنیا جہاں کی برائیوں کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔

'مجتبیٰ' کے معنی ہیں۔'چنا ہوا' مجتبیٰ حسین اسم بامسمیٰ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک خاص 'کار خیر' کے لئے چنا اور طنز ومزاح نگاری کی اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت کر دیں۔وہ بحیثیت مزاح نگار گذشتہ نصف صدی سے یہ کار خیر بڑی سنجیدگی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔اپنے فن سے لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں سجا رہے ہیں اور دلوں کو بشاشت سے منور کر رہے ہیں۔ثواب دارین حاصل کر رہے ہیں۔ہر خاص وعام ان کے فن سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔تو بحیثیت طنز نگار سماجی بد عنوانیوں سے لوہا لے رہے ہیں۔کیوں کہ ان کا انداز بیان سلجھا ہوا اور زبان رواں اور عام فہم ہے۔دقیق الفاظ سے وہ اکثر وبیشتر گریز کرتے ہیں۔آسان زبان لکھنا مشکل ہے۔لیکن وہ یہ کام بڑی آسانی سے کر لیتے ہیں۔یہ ان کے اسلوب کی نمایاں خوبی ہے۔

اعجاز صدیقی (مدیر ماہنامہ شاعر) نے ایک خط میں مجھے لکھا تھا۔''طنز ومزاح نگاری کا عمل ہوائی جہاز کے ٹیک آف کرنے اور لینڈنگ کرنے جیسا ہے۔پہلی سطر سے قاری گرفت میں آنا چاہئے۔'' یہ الفاظ مجتبیٰ حسین کی طنز ومزاح نگاری پر صادق آتے ہیں۔قاری جب ان کی تخلیق پڑھنا، شروع کرتا ہے تو ختم کئے بغیر اسے چین نہیں آتا۔مجتبیٰ حسین کے اکثر مضامین کا اختتام المناک ہوتا ہے، جو قاری کو سنجیدہ کر دیتا ہے اور غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ان کے طنز ومزاح کا یہ وصف ان کی

تخلیقات کو مقصدیت، وزن، وقار، گہرائی و گیرائی عطا کرتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کے ہاں طنز اور مزاح دو واضح رویوں شکل میں رواں دواں ہیں۔ مزاح کی حیثیت سے وہ اپنے مضامین میں سیدھے سادے، معصوم، شرمیلے اور بے ضرر شخص نظر آتے ہیں۔ جو قارئین کو ہنسانے کے لئے اپنی ذات کو بھی نشانہ بنانے سے گریز نہیں کرتا۔ گویا ہر حال میں لوگوں کو تفریح مہیا کرنا ہی اس کا مقصد ہے۔ ایسا بے ضرر اور معصوم مزاح کسی مزاح نگار کے ہاں مشکل ہی سے ملے گا۔ جب بی۔ جے۔ پی۔ کے دور اقتدار میں مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل مرلی منوہر جوشی نے اعلان کیا تھا کہ اردو کے فروغ اور ترقی کے لئے گجرال کمیٹی کی سفارشات نافذ کی جائیں گی، تو مجتبیٰ حسین نے اس پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے لکھا:

> ''مُرلی منوہر جوشی نے بڑی آسانی سے یہ اعلان کر دیا لیکن ہم سوچ رہے ہیں کہ ان کا تعلق اس پارٹی سے ہے، جو بابری مسجد کے انہدام کے وقت اتر پردیش میں بر سر اقتدار تھی اور جس نے حکومت ہند سے لے کر سپریم کورٹ تک کو تیقن دیا تھا کہ وہ بابری مسجد کو گرنے نہیں دے گی مگر اس نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بابری مسجد کو منہدم ہوتے دیکھا جیسے مسجد گرائی نہیں جا رہی ہو بلکہ اپنے آپ ہی گرتی چلی جا رہی ہو۔ سیاسی جماعتیں بہت سے کام کرنے کے وعدے تو کرتی ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کر پاتیں مگر بھارتیہ جنتا پارٹی وہ واحد پارٹی ہے جو کام نہ کرنے کا وعدہ کرتی ہے تو اس کام کو ضرور پورا کرتی ہے۔ اگر مرلی منوہر جوشی جی اردو کے تعلق سے کچھ نہ کرنے کا اعلان فرماتے تو شاید ہم مان لیتے کہ وہ اردو کے تعلق سے ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔''

ان کالموں میں ان کے نام کے دوسرے جز ''حسین'' کی کارفرمائی جلوہ گر ہے اور جذبہ کربلائی عیاں ہے۔ متمی جو مزاح نگار ہے۔ ''حسین'' جو طنز نگار ہے۔ دونوں مل کر ایک فنکار بناتے رہے جسے ہم مجتبیٰ حسین کے نام سے جانتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے طنز و مزاح پیدا کرنے کے جتنے حربے ہیں مثلاً تعریض، مبالغہ، محاوروں کی تحریف، شعر و ادب سے اکتساب۔ کرداروں کے ذریعہ مزاح (جیسے جاپان چلو، جاپان چلو، کا کردار جیا کوڈی) کرداروں کے پیشوں سے متعلق تشبیہات اور واقعات کے ذریعے مزاح، سبھی کو کامیابی سے برتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے کالم، مضامین، خاکے، سفرنامہ، رپورتاژ سبھی کچھ لکھا ہے۔ معیاری لکھا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کالم زیادہ اچھا لکھتے ہیں یا رپورتاژ، مضامین اچھے

لکھتے ہیں یا خاکے، یہ بھی کم کم ہی ہوتا ہے کہ ہر شخص ہر صنف ادب کے ساتھ پورا پورا انصاف کر سکے لیکن مجتبیٰ حسین کو یہ اعزاز حاصل ہے۔

واقعاتی مزاح کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

''بہت عرصہ پہلے جب 'مغل اعظم' ریلیز ہوئی تھی تو کچھ عرصہ تک ہمارے سماج میں ظلِ الٰہی، عالم پناہ، صاحب عالم تخلیہ، اور یلغار جیسے لفظ سنائی دیتے رہے۔ وہ بھی اس طرح کہ ایک دن دبیر پورہ کمان کے پاس ہم سائیکل رکشا کے انتظار میں کھڑے تھے کہ ایک منچلے رکشے والے نے دست بستہ عرض کی۔ ''عالم پناہ کہاں جایئے گا؟ ''ہم نے کہا'' عابد روڈ سیاست کے دفتر'' نہایت مودبانہ انداز میں فرشی سلام کرتے ہوئے بولا'' ظل الٰہی! غلام کو کیا کرایہ عطا فرمائیں گے؟'' (اتفاق سے اس دن ظل الٰہی کی جیب میں صرف آٹھ آنے تھے) ہم نے چار آنے مرحمت کرنے کا وعدہ فرمایا تو حسب معمول فرشی سلام کی تکرار کے دوران بولا'' عالم پناہ! عنایت ومہربانی، نوازش کرم، آپ کی بندہ پروری کا شکریہ۔'' خیر ہم رکشا میں تو بیٹھ گئے لیکن رکشا چلنے کا نام نہ لے۔ ہم نے کہا'' میاں! چلتے کیوں نہیں؟'' بولا'' عالم پناہ آپ حکم دیں تو تعمیل ہو۔'' ہم نے بھی مغل اعظم کے لہجے میں کہا'' یلغار ہو۔'' اب جو رکشہ کی یلغار شروع ہوئی تو ہم نے ڈرتے ڈرتے اس خطرناک یلغار کی شکایت کی تو بولا'' ظل الٰہی! یہ زمانہ ہمیں جینے نہیں دے گا اور ہم آپ کو مرنے نہیں دیں گے۔'' (رکشاوالا)

سماج کے نچلے اور متوسط طبقے کی مجبوریوں، محرومیوں، نا آسودگیوں اور تلخیوں کے تئیں درد مندی کا احساس، مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کی بنیاد ہے۔ انہوں نے اپنی مزاح نگاری کا محرک اور مدعا ہنسانا ہنسانا بنایا ہے۔ یہ وہ ہنسی ہے، جس کے پیچھے انسان کی اندوہناک زندگی کا کرب چھپا ہوا ہے۔ وہ ہنس رہا ہے لیکن اس کی آنکھیں نم ہیں۔ ایک کلرک کی اندوہناک زندگی کی جھلک'' ڈائریکٹر کا کتا'' میں دیکھئے:

''جب کتا کلرک کا ٹفن باکس لے کر بھاگتا ہے۔ کلرک کہتا ہے'' دوستو! یہ ٹفن باکس اس کے منہ سے چھینو۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔ اگر کتے نے اس ٹفن باکس کو کھول لیا تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ آج تک دفتر میں کسی کو یہ پتہ نہیں ہے کہ میں سالن کے بغیر ہی ایک چپاتی ٹفن باکس میں ڈال کر لاتا ہوں۔ پھر یہ چپاتی بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے ڈائریکٹر صاحب کا کتا کھا سکے۔''

مجتبیٰ حسین کے ہاں لوگوں کی مدد کرنے کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ وہ آئے دن لوگوں کے کام نمٹاتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے جونیرس کی حوصلہ افزائی کے لئے بھی ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ میری حوصلہ افزائی انھوں نے ان لفظوں میں کی۔:

''شیخ رحمن اکولوی جس استقلال، لگن، جستجو اور سنجیدگی کے ساتھ کررہے ہیں اسے دیکھ کر یہ یقین پختہ ہوجاتا ہے کہ یہ بہت جلد نہ صرف ادب میں اپنے لئے منفرد مقام بنالیں گے بلکہ ادب کے نقشے میں اکولہ کو بھی ایک نمایاں مقام عطا کریں گے۔ مزاح کی شائستگی، زبان کا تخلیقی استعمال، مشاہدے کی تیزی، اپنا مذاق آپ اڑانے کا ظرف اور کسی بھی مزاحیہ صورت حال کو ایک قابل یقین مبالغہ کے ساتھ بیان کرنے کا اعتماد، ان کی مزاح نگاری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔''

مجتبیٰ حسین کی تخلیقات ایسی ہیں کہ ہم انھیں دوسری زبانوں کے آگے رکھ سکتے ہیں۔ ان کے تراجم ہندی اور اُڑیا کے علاوہ انگریزی، روسی اور جاپانی زبانوں میں ہوچکے ہیں اور ان کو پسند کیا گیا ہے۔ ان کا فن اس لئے بھی اہم ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اس بات کو رد کیا کہ طنز ومزاح دوسرے درجہ کا ادب ہے۔ میں ان لوگوں سے جو طنز ومزاح کو دوسرے درجہ کا ادب کہتے ہیں، پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین اور مشفق خواجہ کی نثری تخلیقات دوسرے درجہ کی ہیں تو اول درجے کی نثری تخلیقات کون سی ہیں؟

آج فلموں، ڈراموں، نکڑ ناٹکوں، سیریلوں میں طنز ومزاح کا بول بالا ہے۔ ادب میں طنز ومزاح کی کتابیں ذوق وشوق سے پڑھی جارہی ہیں۔ یہ طنز ومزاح کے سکہ رائج الوقت ہونے کی روشن دلیل ہے اور اس کا سہرا بلاشبہ مجتبیٰ حسین جیسے طنز ومزاح نگاروں کے سر بندھتا ہے۔

☆☆☆

انتساب کا اگلا خصوصی شمارہ

مشہور شاعر ارشد مینانگری

کی ادبی خدمات کے اعتراف پر مشتمل ہوگا۔

محمد بشیر مالیر کوٹلوی

اشتیاق سعید ''حاضر غائب'' کے تناظر میں

معاصر افسانہ نگار اظہار کے تکلیف دہ مرحلے سے گزر کر بڑی اُلجھن میں پھنس جاتے ہیں ۔اپنی تخلیق کو صحیح مقام دلانے کے لیے اُنہیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔تخلیقی عمل کی سخت مشقت کے بعد مراسلاتی اخراجات اور معیاری جرائد کا سالانہ چندہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔مدیران کی خوشنودی بھی فرضِ اوّلین بن جاتا ہے۔ان سب کے بعد سال دو سال کا لمبا انتظار کیوں کہ مردہ و زندہ شعراء و اُدباء کے گوشے اور تعریفی مضامین اُس کا راستہ روکے رہے ہیں، تب کہیں جا کر اشاعت کی منزل نصیب ہوتی ہے اس کے بعد قارئین کرام کی پسند اور ناپسندیدگی سامنے آتی ہے۔اس کے مقابلے میں فلم کے اُدباء، اشاعت کے اس مشقت بھرے راستوں سے دور ہی رہے ہیں۔سخت جدو جہد کے بعد اُن کا وقت بے حد قیمتی ہو جاتا ہے۔اپنے صرف کیے ہوئے وقت کے بدلے میں وہ زندگی کی ہر جنت کو پالیتے ہیں۔دولت اور شہرت اُن کے قدموں سے لپٹ جاتی ہیں۔سوال یہ ہے کہ قلم کے سچّے فنکار فلم کیوں نہیں اپناتے ؟ کہ ایک مشقت بھری جدّ و جہد کے بعد زندگی کی ہر خوشی پالیتے۔آیئے اس سوال پر غور کریں۔یہ تو آپ مانتے ہیں نا کہ فن ایک خداداد صلاحیت ہے۔اللہ جس کو بخشے لوگ افسانہ نگار تو بن ہی جاتے ہیں۔فن کار نہیں ہو پاتے۔حالانکہ وہ ساری زندگی گلا پھاڑ پھاڑ کر خود کو فن کار ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔توڑ جوڑ لگا کر بڑے بڑے ایوارڈ لے جاتے ہیں، پیسے کے زور پر بڑی بڑی انجمنوں اور اکادمیوں کے سربراہ بن جاتے ہیں۔کتابوں پہ کتابیں چھپوا کر بڑے ادیبوں سے تعریفیں لکھا لیتے ہیں۔یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں بھی خرید لاتے ہیں۔مگر فن کی گرد کو کبھی نہیں چھو پاتے۔سچّے فنکار کی بات یہ ہے کہ وہ خود کو فن کار نہیں مانتا

کو جتنی تکلیف اپنوں سے ہوتی ہے، اپنے جو بہت قریب ہوتے ہوئے بھی قدم قدم پر چوٹ پہنچاتے ہیں، کوئی موقع ہو وہ چوٹ پہنچانے سے گریز نہیں کرتے، چاہے وہ شادی بیاہ کا موقع ہو یا موت میت کا، انہیں تو بس اپنے مطلب سے کام ہوتا ہے۔ اقبال انصاری کے اس ناول میں بھی قدم قدم پر یہ مناظر سامنے آتے ہیں۔ یہ ناول ایک ایسے شخص ثبات کے اردگرد گھومتا ہے، جو بچپن ہی سے اپنے والد کی دوسری شادی سے ناخوش ہو کر اپنے ماموں کے گھر چلا جاتا ہے اور اس کی پرورش بھی ماموں کے گھر ہی ہوتی ہے، ماموں اسے پڑھا لکھا کر اس قابل بنا دیتے ہیں کہ آج وہ ایک بڑا بزنس مین کہلاتا ہے، کار بنگلہ عزت شہرت سب کچھ اسے حاصل ہے۔ ان پندرہ بیس سالوں میں ثبات صرف چار چھ بار ہی والد کے گھر آتا ہے۔ اس درمیان اس کی سوتیلی ماں شکیلہ بیگم کے یہاں ایک بیٹا گلو اور بیٹی ثانیہ جوان ہو جاتے ہیں۔ سوائے گلو کے گھر میں کسی کو اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی، ہاں گلو ضرور اسے اپنا بڑا بھائی نہ صرف سمجھتا ہے بلکہ گھر میں اس کی برائی سننے کو بھی تیار نہیں ہے۔ ایک دن ثبات اپنے کاروبار کے سلسلے میں باہر جاتا ہے، واپس آتے ہی اپنے آفس میں اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا، اس پر گویا سکتہ طاری ہو جاتا ہے اور فوراً دوڑا دوڑا گھر جاتا ہے لیکن گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے دروازے پر روک لیا جاتا ہے اور کچھ اس طرح گفتگو ہوتی ہے:

> ''کار سے اتر کر ثبات نے کار کا دروازہ لاک کیا، چابی پینٹ کی جیب میں رکھی اور سامنے والے مکان کے قریب لگا ہوا گھنٹی کا بٹن دبایا، جو بیس پچیس برس کے ایک نوجوان سے دروازہ کھولا، چھوٹی چھوٹی گول سی آنکھیں، تنگ پیشانی، بڑے بڑے سوکھے بے ترتیب بال سانولا سا رنگ جسم پر ایک معمولی سی شرٹ اور کچھ گندا سا پینٹ غالباً چگم چبا رہا تھا۔ کہئے کس سے ملنا ہے، اس نے بھدے لہجے میں ثبات سے پوچھا۔ تم کون ہو؟ ثبات نے نیچے سے اوپر تک دیکھا اور دھیرے سے مگر خشک لہجے میں پوچھا۔ تم کون ہو؟ میں نے جناب سے پوچھا تھا کہ کس سے ملنا ہے؟ نوجوان کی آواز کچھ اونچی ہو گئی۔ ثبات نے نچلا ہونٹ دانتوں سے دبا لیا، اس کی پلکیں سکڑ گئی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا جیسے غصے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا ہو، اس نے نوجوان کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کیں اور پھر دھیرے سے بولا۔ میں یہاں کسی سے ملنے نہیں آیا مسٹر۔ یہ میرا گھر ہے اور اس لئے اب تمہارے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ فوراً اپنا تعارف....''

یہ میاں کدن تھے جس نے ثبات کو نہ صرف اپنے ہی گھر میں جانے سے روکا بلکہ بدتمیزی

اُس کا فن دنیا کو مجبور کر دیتا ہے لوگ خود ہی کہہ اُٹھتے ہیں کہ ہاں! ۔۔۔ وہ فنکار ہے۔ نہ اُسے نام کی پرواہ ہوتی ہے نہ اعزازات کی فکر وہ تو بس اپنی لگن میں بغیر پھل کی چاہت میں محنت کرتا رہتا ہے، فن کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔ کوئی اس کی تعریف کرے یا کوئی ناقد اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھے یا نہ دیکھے اُسے پرواہ نہیں نہ اُسے فائدے اور نقصان کا احساس رہتا ہے۔ آج شاید ادب کے سچے خادم ادب کی دنیا میں سانس لینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سلام بن رزّاق اُردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ یہ نام کبھی فلم کے پردے پر نظر نہیں آیا۔ بالی ووڈ کے نزدیک بسنے والے اُدباء انور قمر، نورالحسنین ،م۔ ناگ، ایم مبین، مقدر حمید کے علاوہ انور خاں اور علی امام نقوی بھی بالی ووڈ کی چمک دمک سے دور ہی رہے۔ وہ زمانہ اور تھا جب ادب میں نام کمانے کے بعد لوگ فلموں کی طرف رُخ کرتے تھے۔ فلمی کہانیوں اور گیتوں میں شاید اسی وجہ سے دم تھا۔ مثال کے طور پر راجہ مہدی علی خاں، خمار بارہ بنکوی، مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی وغیرہ۔ فکشن میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ۔۔۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ادب سے اُٹھ کر فلم کی جانب بڑھے۔ آج ادیب شاعر براہ راست فلم میں جاتے ہیں گلزار اور جاوید اختر تو کبھی ادب میں نظر آئے بھی ہوں گے۔ ارشاد کامل کی غزل شاید ہی کسی نے پڑھی ہو جبکہ وہ فلموں کے کامیاب شاعر ہیں۔ فلم کے زمرے میں ایک نام کا اضافہ ہوتا ہے جو ادب میں اور فلم میں برابر جدوجہد کر رہے ہیں ، وہ نام ہے اشتیاق سعید کا۔ جو اعظم گڑھ (اُتر پردیش) کی مٹی کا خمیر ہے۔ یہ نوجوان افسانہ نگار بالی ووڈ کی طوفانی تھپیڑے سہہ کر بھی اپنے فن کی خدمت میں مصروف ہے۔ اشتیاق سعید کو کئی بار پڑھا تھا مگر سمجھا نہیں تھا۔ ان کی کتاب ''حاضر غائب'' پڑھ کر سمجھا ہے۔ میری ان سے پہلی ملاقات چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ میں اسلم جمشید پوری کے توسط سے ہوئی تھی۔ اسلم جمشید پوری، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اُردو ہیں۔ ادبی ہنگامہ آرائی کا شوق اُنہیں جنون کی حد تک ہے۔ ان کے دو ہی شوق ہیں ایک اُردو کے لیے میلے سجانا، دوسرا سفر در سفر۔۔۔ اوہ۔۔۔! معاف کیجئے، میں تو بات اشتیاق سعید کی کر رہا تھا اور گن گانے لگا اسلم جمشید پوری کے۔ کیا کریں، جو لوگ اعصاب پر چھائے رہتے ہیں اُن کا ذکر تو قلم کر ہی دیتا ہے اور پھر کیوں نہ کرے، میں کچا پکا افسانہ نگار۔۔۔ آدھا ادھورا قلم کار سرحدی صوبہ پنجاب میں گوشہ نشین تھا، جہاں اُردو اپنی آخری سانسیں گن رہی ہے اور اُس کے نقشوں کو سہارا دینے والا کوئی نہیں۔ ایسے میں اسلم جمشید پوری کو جانے میری کون سی ادا پسند آئی کہ مجھے بھی اُردو ہنگاموں میں شامل کر لیا۔ میرٹھ کے نوچندی میلے سے بھی خوبصورت اُردو میلے میں دوستوں کی محبتوں سے میری تو بانہیں بھر گئیں۔ کتنے سارے دوست، کتنے محبت کرنے

والے لوگوں کی قربت نصیب ہوئی۔ لگتا تھا سارے ادب دوست میرے کنبے کے ہیں۔ بڑے بھیا نورالحسنین، بہن نگار عظیم اور عزیز اسلم جمشید پوری، اشتیاق سعید اور عظیم راہی وغیرہ ہیں۔ جیسا کہ فلموں میں دکھایا جاتا ہے کہ بھائی سے بھائی میلوں میں بچھڑ جاتے ہیں۔ مگر اسلم جمشید پوری کے سجائے ہوئے میلوں میں برسوں کے بچھڑے بھائی ملتے ہیں۔ ایسے ہی ایک میلے میں اشتیاق سعید اور ایم۔ مبین بمبئی سے آئے تھے۔ میرا تعارف ہوا تو اشتیاق کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے یہ آدمی کسی فلم کا ولن ہو جو ہیرو سے جم کر پیٹتا ہے۔ مگر صاحب کسی کو کیا خبر کہ اسی انسان کے سینے میں اسقدر حساس، اسقدر نرم اور اس قدر محبت بھرا دل ہے۔ بات بات پر قہقہہ زاری اور لطیفہ بازی۔ کُل ملا کر اشتیاق بہت مزے کے آدمی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اشتیاق کی دوستی اُس کی محبت میرے لیے اثاثہ ہے۔ اشتیاق اور مجھ میں ایک بات مشترک ہے وہ یہ کہ ہم کسی کی غلط بات برداشت نہیں کرتے۔ مُنہ پھٹ اور بے باک ہیں۔ دوسروں کی عزّت کرنا اور اپنی عزّت کروانا بخوبی جانتے ہیں۔

اشتیاق سعید روٹی روزی کے سلسلہ میں فلم سے جڑے ہوئے ہیں اور کمرشیل قلم کار ہیں۔ مگر وہ فلمی تحریروں کے بعد فارغ نہیں ہو جاتے بلکہ فلم لکھنے کے بعد اُن کے اندر ادب کی تشنگی برقرار رہتی ہے، ایک خلاء سا رہتا ہے۔ وہ خلاء پُر ہوتا ہے تخلیقی عمل کے بعد۔ یہ سچّے فن کار کی نشانی ہے کہ وہ کہیں بھی رہے کچھ بھی کرے اُس کے ذہن میں تخلیقی کونپلیں پھوٹتی رہتی ہیں، اُس کی سوچیں پکتی رہتی ہیں یا یوں کہہ لیں کہ اُس کے اندر نئی تخلیق تڑپتی رہتی ہے۔ جب تفکرات کے ہاتھوں اندر کی تخلیق کا ہیولیٰ مکمل ہو جاتا ہے، دوسرے الفاظ میں اُس کی سوچ پک کر تیار ہو جاتی ہے پھر اظہار کے لیے وہ نہ تو وقت دیکھتی ہے نہ تخلیق کار کی حالت، بس ہر قیمت پر وہ صفحۂ قرطاس پر وارد ہو جاتی ہے، تب کہیں جا کر تخلیق کار کو سکون ملتا ہے۔

اشتیاق بمبئی کی لوکل ٹرینوں، بسوں، بازاروں، گلیوں، پارکوں، اسٹوڈیوز اور پروڈیوسروں کے دفاتر کے علاوہ جانے کہاں کہاں گھومتے رہتے ہیں اور ایسے میں اپنی تیسری آنکھ کھلی رکھتے ہیں جو گہرائی اور باریک بینی سے ایک ایک شئے کو دیکھتی رہتی ہے۔ دراصل یہ تیسری آنکھ ہی خداداد صلاحیت ہے۔ فرض کیجئے ایک لڑکی روٹی روزی کے سلسلہ میں یا حصولِ تعلیم کی خاطر شہر کی گلیوں، بازاروں، لوکل ٹرینوں یا بسوں میں جاتی ہے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں، مگر جس کے پاس تیسری آنکھ کی صلاحیت ہے وہ لڑکی کی زندگی کے ہر پہلو پر غور کرے گا، اُس کی مشکلات، اُس کی دقّتوں کو محسوس کرلیگا۔ ہوس کے بھوکے لوگ لڑکی کے جسم کے کس کس حصّے کو چھوتے ہیں، لڑکی کیسے اس کرب کو جھیلتی ہے، کیوں جھیلتی ہے، کہاں کہاں سے اور کیسے اپنا دامن بچاتی ہے یہ سب کچھ تیسری آنکھ والا

یعنی ایک فنکار ہی محسوس کرتا ہے عام آدمی نہیں۔ فنکار اُس لڑکی کے کسی نہ کسی احساس، کسی کرب یا کسی خوشی کو لے کر اپنے حواس پر اوڑھ لیگا اور کسی نئی تخلیق کو جنم دے گا۔ جہاں تک میں نے سمجھا ہے ،اشتیاق کے پاس خدا کی دی ہوئی تیسری آنکھ ہے جو ادب کے لیے ہیرے تلاش کرتی ہے تا کہ قاری محظوظ ہوں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ اشتیاق کہیں بھی رہیں، کیسے بھی اور کسی بھی حالت میں رہیں اپنی آنکھیں اور اپنا ذہن کھلا رکھتے ہیں۔

بات اشتیاق کے افسانوں کی کریں تو سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ان کو قاری کی ضرورت اور اُس کی مشکلات کا احساس رہتا ہے بلکہ بھرپور احساس رہتا ہے۔ ظاہر ہے آج کا قاری مہنگائی اور گرانی کے دور سے گزر رہا ہے۔ سماج کی ناہمواریاں، بے روزگاری جیسی بلاؤں سے بھی وہ دوچار ہے۔ وہ ذہنی طور پر تھکا ہوا ہے۔ وہ ادب سے تفریح لینے کے لیے اپنی مصروف ترین زندگی سے مطالعہ کے لیے بہت کم وقت نکال پاتا ہے۔ ایسے میں قاری کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لطف لینا چاہتا ہے۔ قاری کی یہ حالت اشتیاق سے چھپی نہیں بلکہ اس بات کو لے کر اشتیاق بہت سنجیدہ ہے۔ اُس نے اس مسئلے کا حل ڈھونڈھ لیا ہے وہ اپنے افسانوں پہ حسب ضرورت کم از کم جملوں کا بوجھ ڈالتا ہے۔ بلاوجہ اور بے معنیٰ جملے، بے وجہ نثری شاعری، طویل منظر نگاری سے پرہیز کرتا ہے۔ الفاظ کو ناپ تول کر نگینوں کی طرح جڑ دیتا ہے۔ اس کی کچھ کہانیاں طویل بھی ہیں تو واقعاتی طور پر، جان بوجھ کر کھینچی ہوئی طویل نہیں! ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ موضوع کی Requirement کے مطابق کوئی کہانی طویل بھی ہے تو وہ شیطان کی آنت نہیں بنتی اور نہ ہی قاری کے ذہن پر بوجھ بن کر اُس کو اُکتانے پر مجبور کرتی ہے۔ القصہ مختصر یہ کہ اشتیاق سعید زیادہ تر مختصر اور جامع تخلیق میں یقین رکھتے ہیں۔ اس کے افسانوں کی دوسری بڑی خوبی مجھے یہ نظر آئی کہ ان میں کہانی پن بھرپور پایا جاتا ہے۔ آپ افسانہ ''فرنگی'' کو ہی لے لو یہ کہانی جتنی طویل ہے اُتنی ہی دلچسپ بھی ہے۔ پہلا صفحہ پڑھنا شروع کریں تو جی چاہتا ہے پوری پڑھ ڈالیں۔ شروع سے آخر تک کہانی کی گرفت مضبوط رہتی ہے ،یہی اچھی کہانی کا وصف، یہی کہانی پن ہوتا ہے۔ جب کہانی میں تجسس قائم ہو۔ اب کیا ہوگا۔۔ آگے کیا ہوگا کے سوالات آپ کے ساتھ ساتھ چل رہے ہوں تو کہانی پن کا مضبوط ہونا قدرتی ہے۔

اشتیاق کی کہانیوں میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی سچائیاں جھانکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اشتیاق سعید آنکھیں موند کر تصوراتی دنیا میں ہرگز نہیں کھوتا، زندگی کی سچائیوں کو بنیاد بنا کر ان کے اردگرد افسانے بُنتا ہے۔ جن میں اسکے مشاہدات کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فنکار زندگی کے تئیں کس قدر سنجیدہ ہے۔ اس کی فکر کی نظریں کس قدر باریک ہیں جو گہرائی تک پہونچتی

ہیں۔ کچھ لوگ یہ شکایت کرتے ہوئے اکثر نظر آتے ہیں کہ اُن کو موضوعات دستیاب نہیں ہوتے، وہ کیا لکھیں۔۔۔؟ میں پھر اپنی بات دہراؤں گا کہ جن لوگوں کے پاس تیسری آنکھ ہے، یعنی تخلیقی حس ہے اُن کے لیے موضوعات کا کبھی فقدان نہیں ہوتا، بس آپ اپنی تیسری آنکھ، کان اور ذہن کھلا رکھیں، آپ کو جگہ جگہ موضوعات کا ڈھیر نظر آئے گا۔

اشتیاق سعید کی جو اور بات مجھے اچھی لگتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کردار کے مُنہ میں اُس کی اپنی زبان رکھ دیتا ہے۔ جس سے اُس کے کردار جی اُٹھتے ہیں۔ مکالمے کے سلسلے میں میرا ماننا ہے کہ اگر کردار کے مطابق اُس کو زبان نہ دیں تو وہ اپنی کشش کھو دیتا ہے۔ یہ بات قدرتی ہے کہ ادیب ہمیشہ اپنا ماحول لکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نقادوں نے اُسے اپنے دور کا مورّخ قرار دیا ہے۔ ترقی پسند تحریک والوں کو دیکھ لیں۔ تقسیم سے پہلے وہ جاگیرداروں کے ظلم و جبر کو بیان کرتے تھے تقسیم کا المیہ دیکھ کر اُن کی فکر قتل و غارت گری اور نقلِ مکانی کی طرف مُڑ گئی۔ انہوں نے اپنے دور کی تاریخ مرتب کی ہے۔ بہر حال بات اشتیاق کی ہو رہی ہے۔ اشتیاق نے بھی اپنا ماحول لکھا ہے۔ اعظم گڑھ کی دیہاتی زندگی کی تصویریں پیش کی ہیں یا پھر بمبیّا زندگی کو اپنی کینوس پر اُتارا ہے۔ بڑی خوبصورتی کے ساتھ بمبیّا زبان کا مزہ دیا ہے۔ بمبیّا زبان شمالی ہندوستان میں فلموں کے حوالے سے اجنبی نہیں ہے۔ بمبیّا زبان ہم نے بھی کئی افسانوں میں استعمال کی ہے مگر ہم وہ اور ایجنلٹی نہیں لا سکتے جو اشتیاق لاتے ہیں۔ یہاں میں اشتیاق کو دوستانہ نہیں برادرانہ مشورہ دوں گا کہ جب ہم کوئی ایسی مقامی زبان استعمال میں لاتے ہیں جو عام فہم نہ ہو تو ہمیں اُس کا توسین میں ترجمہ دینا چاہئے۔ اس معاملہ میں استاد منٹو کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ منٹو کے افسانے پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ افسانے صرف پنجاب کے قارئین کے لیے ہی لکھے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں جا بجا پنجابی کے غیر فہم الفاظ استعمال کیے ہیں۔ خاص طور پر امرتسر شہر کی مقامی زبان استعمال کی ہے۔ ''ٹھنڈا گوشت'' کو ہی لے لیں اُس میں انہوں نے کئی بار 'مایا' اور 'بھینی یا' کا استعمال کر ڈالا ہے، یہ دونوں الفاظ پنجاب کی گندی گالیاں ہیں اور خاص طور پر امرتسر والوں کا تکیہ کلام ہیں۔ کئی لوگوں نے تو پنجابی ہونے کے ناطے مجھ سے ان کے معنی پوچھے ہیں۔ اگر استاد بریکٹ میں ترجمہ دے دیتے تو ان کے قارئین کو پریشانی نہ ہوتی۔ ''پھوجا حرام دا'' میں ایک لفظ 'بھنبھیری' استعمال کر گئے۔ پچھلے دنوں قبلہ رتن سنگھ کا ایک افسانہ پڑھا جس میں انہوں نے پنجابی زبان تو استعمال کی ہے، پنجابی پتّے (منظوم) بھی استعمال کر گئے۔ اگر اُن کا یہ افسانہ کوئی تامل ناڈو والا پڑھے تو وہ کیا سمجھے گا۔ شاید وہ رسالہ لے کر کسی پنجابی کو ڈھونڈتا پھرے گا کہ بھائی اس کا مطلب بتانا۔ پنجابی، بھوجپوری، بمبیّا وغیرہ زبانوں کو تو شمال

والے سمجھ لیتے ہیں۔ مگر ساؤتھ والے۔۔۔۔؟ بہر حال یہ ایک لمبی بحث ہے۔ آج کے نقاد کے پاس تو ایسی ضروری باتوں کے لیے وقت نہیں، وہ تو بس اتنا ہی لکھنا جانتا ہے کہ آج افسانہ رپورٹنگ بن گیا۔۔۔ افسانہ کمزور ہے۔ خیر چھوڑیئے! بات اشتیاق کی کرتے ہیں۔ اشتیاق کو میرا دوسرا مشورہ ہے کہ بھائی، لوگ اب اشتیاق سعید کو صرف نام سے ہی نہیں فن سے بھی پہچاننے لگے ہیں، اب اشتیاق کو بیساکھیوں کی ضرورت نہیں، وہ اپنے پاؤں پر چل سکتا ہے۔ اشتیاق کے افسانے اُس کا فن اس قابل ہے کہ وہ اپنے آپ کو پڑھوالے گا، پھر کسی بڑے کی سفارش کیوں۔۔۔؟

اشتیاق موضوعات کے انتخاب میں بہت ہی سنجیدگی سے کام لیتے ہیں۔ معاصر افسانہ نگار کچھ ایسے بھی ہیں جو ہر موضوع کو افسانہ بنانے میں یقین رکھتے ہیں۔ جو خبر پوری دنیا کے لیے پرانی ہو جائے، جس کو بچہ بچہ جان لے اُس پر افسانہ لکھ دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک صاحب نے ملالہ پر افسانہ داغ دیا۔ ارے بھائی ملالہ کی کہانی میں اب کشش کہاں رہ گئی۔۔۔؟ وہ خود بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے لگی ہے اور آپ ہیں کہ اب تک پرانے راگ الاپے جا رہے ہیں۔ ہمارے مدیران بھی ایسے ہیں کہ آنکھیں موند کر میٹر چھاپ دیتے ہیں۔ افسانے کا موضوع اچھوتا ہو تبھی اُس میں قاری کی دلچسپی بنی رہتی ہے۔

آیئے! اشتیاق کی ''حاضر غائب'' کی دنیا میں آپ کو لے چلوں، جسے اُس نے بڑی مشقت سے بسایا ہے۔ ''حاضر غائب'' کا پہلا افسانہ ہے ''تشنہ آرزو'' افسانہ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کی اپنی آپ بیتی ہے۔ بیرا گی کا ندیم سے سوال کرنا۔ ''یار بتاؤ نا کب ہمارا یہ اسٹرگل اختتام کو پہونچے گا؟ کب ہماری محنت رنگ لائے گی؟'' اپنے اندر ایک کرب لیے ہوئے ہے۔ بیرا گی کے گھر سے خط آیا ہے۔ وہ لوگ جن مسائل سے دوچار ہیں خط پڑھنے پر ندیم محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی اسی کشتی کا سوار ہے، اُس کے اپنے والدین بھی اُس کی کامیابی کے منتظر ہیں۔ افسانہ ''تاخیر'' یہ انسانی نفسیات ہے کہ جب کوئی انسان کسی کا منتظر ہو اور آنے والا تاخیر سے آئے تو انتظار کرنے والا طرح طرح کے خیالات میں اُلجھ جاتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں۔۔۔ کہیں ویسا تو نہیں۔ دل میں طرح طرح کے شکوک اُبھرتے ہیں۔ عرشی جو دلہن بنی پلنگ پر بیٹھی اپنے شوہر کی منتظر عجیب وغریب سوالات میں اُلجھی ہوئی ہے۔ شوہر دوستوں میں بیٹھا شراب تو نہیں پی رہا ہے؟ کہیں وہ عیاش تو نہیں؟ جواری تو نہیں؟ کہیں جنسی طور پر ناکارہ نہ ہو۔۔۔ عرشی یہاں تک سوچنے لگتی ہے کہ اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا؟ اس افسانے میں اشتیاق نے بڑی ہوشیاری سے کئی گرہوں والی بات نبھائی ہے۔ اس کا مزہ وہی لے سکتا ہے جو سہاگ رات سے دوچار ہوا ہو۔ سہیلیوں کا آپس میں شرارت بھری باتیں کرنا حقیقی

رنگ ہے۔ ''تاخیر'' ایک اچھا اور دلچسپ افسانہ ہے۔ ''وہ دونوں کون تھے؟'' بالکل فلمی انداز کا افسانہ ہے۔ اشتیاق جو فلم سے جڑا ہوا ہے، کہیں کہیں اپنا حقیقی رنگ بھی دکھا دیتا ہے۔ جاڑوں کی رات۔۔۔ پولیس انسپکٹر کی جیپ کا سنسان جگہ خراب ہوجانا۔۔۔ بوڑھے کا انسپکٹر کو کوٹھی میں لے جانا۔۔۔ خوبصورت لڑکی کا اُسے اندر لے جانا اور مسہری پر لیٹانا۔۔۔ صبح کو لڑکی کا ناشتہ لیے حاضر ہونا۔۔۔ انسپکٹر کا بغیر ناشتہ کیے جلد بازی میں سڑک پر آنا۔۔۔ جیپ کا بونٹ کھلا دیکھ کر چونکنا پھر اچانک اُسے یاد آنا کہ وہ اپنی ریوالور کوٹھی میں بھول آیا ہے۔۔۔ ریوالور کی تلاش میں دوبارہ کوٹھی کی جانب جانا۔۔۔ کوٹھی کا کہیں نظر نہ آنا۔۔۔ بعد میں پتہ چلنا کہ وہاں کوٹھی کی بجائے ایک کھنڈر ہے جہاں کھیلتے ہوئے دو بچّوں کو ریوالور کا ملنا۔ کہانی دلچسپ ہے۔ بھرپور کہانی پن اور تجسس بھی موجود ہے۔ فلم کے لیے بہترین کہانی ہے، جانے کیوں کسی پروڈیوسر کی اس پر نظر کیوں نہیں پڑی۔

جہیز کا موضوع بہت پرانا ہے، اس تھیم پر سیکڑوں کہانیاں مل جائیں گی۔ اس تھیم سے مختلف پہلو برآمد ہوتے رہتے ہیں، عجیب وغریب مسائل سے سامنا ہوتا ہے۔ ''شُبھ گھڑی'' بھی اسی طرح کی ایک کہانی ہے۔ جہیز کی لعنت کا یہ بھی ایک پہلو ہے۔ اشتیاق کی یہ خوبی ہے کہ یہ بغیر وقت ضائع کیے فوراً مطلب کی بات پر آجاتا ہے۔ لمبی چوڑی تمہید، فضول کی لفاظی اور بے جا منظر نگاری اس کے یہاں نہیں ہے۔ ''شُبھ گھڑی'' کے آغاز میں اشرف کا اعلان کہ ''برائے مہربانی کوئی پانی نہ پیئے'' سارے براتیوں کو دم بخود کر دیتا ہے۔ وجہ یہ کہ دولھا موٹر سائیکل مانگ رہا ہے۔ کچھ براتی دولہے کے باپ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ نہیں مانتا۔ اچانک پولیس آجاتی ہے۔ دولھے کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دیتی ہے۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ حاجی غفار کی مدد سے شاذیہ جو کہ دُلہن ہے پولیس کو اطلاع دیتی ہے۔ لڑکی کی اس جرأت مندانہ قدم سے خوش ہوکر حاجی غفار اپنے بیٹے کے لیے شاذیہ کا ہاتھ مانگتا ہے۔ یہاں عنوان تھوڑا کھٹکتا ہے۔ یہ کہانی ایک بہادر، نڈر اور جرأت مند لڑکی کی ہے۔ سارا فوکس اُس کی بہادری پر ہونا چاہئے۔ بہرحال یہ بھی اچھا ہی ہے کہ حاجی غفار کا لڑکی کا ہاتھ مانگنا بھی ۸ شُبھ گھڑی ہی تو ہے۔ بہرحال اشتیاق نے پُرانے اور بوسیدہ موضوع کو بڑے اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے اور جدید فکر کے ساتھ نبھایا ہے۔ ''بعید از قیاس'' اس کڑی کی ایک اچھی کہانی ہے۔ یہ بات تو ہمیں ماننا پڑے گی کہ اشتیاق عورتوں کی نفسیات، اُن کے احساسات کی عکاسی بخوبی کرتے ہیں جبکہ ایک مرد افسانہ نگار کے لیے یہ مشکل کام ہے۔ اس افسانے کے علاوہ دوسری تخلیقات میں بھی اشتیاق نے عورت کی جذبات نگاری میں کمال دکھایا ہے۔ اس کہانی میں ایک تشنہ عورت کے جذبات کو جس ڈھنگ سے پیش کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ اس کردار کو اشتیاق نے تسکین نام دیا

ہے جبکہ اُسے تسکین ہے ہی نہیں۔ تسکین کا شوہر خلیجی ممالک میں کام کرتا ہے جو دو سال بعد وطن لوٹتا ہے۔ گھر آ کر بیوی کے ساتھ وقت گزارنے کی بجائے عبادت میں لگا رہتا ہے۔ تسکین صدیقی کی ایک بیٹی شادی شدہ ہے اور دوسری بارہ تیرہ برس کی ہے۔ تسکین اپنے پڑوسی جو کہ راوی ہے میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ راوی کے ساتھ شراب پیتی ہے اور نشے میں اپنا دُکھ بیان کرتی ہے کہ اُس کی جسمانی پیاس اب تک بجھ نہیں پائی ہے، اُس سے زیادہ خوش نصیب تو اُس کی بیٹی ہے جو اُس کا شوہر اُس کے پاس ہے اور وہ دن میں چاہے جہاں رہے مگر رات میں خود سے جدا ہونے نہیں دیتا۔ تسکین شراب میں دھت ہو کر اُس سے وعدہ لیتی ہے کہ وہ اُس کی پیاس بجھائے گا۔ لیکن راوی اپنا وعدہ وفا نہیں کرتا نتیجتاً تسکین اُس سے ملنا جُلنا ترک کر دیتی ہے۔ کئی روز بعد اچانک راوی کے پاس تسکین کا فون آتا ہے اور وہ اُسے پولیس اسٹیشن بُلاتی ہے۔ راوی جب پولیس اسٹیشن جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اُسے پولیس نے ایک بدنام گیسٹ ہاؤس سے گرفتار کیا ہے اور اُس کا مرد ساتھی بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ افسانے کے اختتام پر قاری پر عیاں ہوتا ہے کہ گیسٹ ہاؤس میں اُس کا مرد ساتھی کوئی اور نہیں اُس کا اپنا داماد ہوتا ہے۔ یہ کہانی اس بات کی شہادت ہے کہ عورت پیٹ کی بھوک تو برداشت کر سکتی ہے مگر جنسی بھوک برداشت نہیں کر سکتی۔ جنسی بھوک کے چلتے انسان اسقدر اندھا ہو جاتا ہے کہ وہ رشتہ ناطہ تک نہیں دیکھتا، وہ صرف اور صرف اپنی تسکین چاہتا ہے۔ اپنے شوہر سے جنسی تسکین حاصل کرنا عورت کا حق ہے۔ ایسی عبادت گزاری کا کیا فائدہ جب آپ حقِ زوجیت ہی نہ ادا کر سکیں۔ کہانی تھوڑی طویل ضرور ہے مگر شروع سے آخر تک کہانی پن بنا رہتا ہے۔ واقعی جنسی بھوک میں کوئی چیز بعید از قیاس نہیں ہوتی۔ عنوان قابلِ غور ہے۔ افسانے میں کہیں کہیں بڑے پیارے جملے بیان کیئے گئے ہیں، جو مزہ دیتے ہیں۔ مثلاً

''پھر کیا تھا۔۔۔ غصّہ آہستہ آہستہ ناک کی جانب سفر کرنے لگا''

''اور میں با آبرو رہنے کی شرط پر آبرو باختہ ہونا چاہتی تھی''

''لیکن میں تو سولہ مہینوں سے بھوکی ہوں، مجھ پر کیا کیا چیزیں حلال ہوئیں، بتا سکتے ہیں''

آخر الذکر مکالمہ بڑی زبردست کاٹ ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ اشتیاق کی کہانیوں میں اُس کے مشاہدات بولتے ہیں۔ ان کی کہانیاں پڑھنے کے بعد شائبہ ہوتا ہے کہ یہ تجربات ان کے اپنے ماضی کا حصّہ ہیں۔ ''لالی پاپ'' فلمی پس منظر کی کہانی ہے۔ معافی چاہتا ہوں میں کبھی افسانہ تو کبھی کہانی لکھ دیتا

ہوں، دراصل کہانی اور افسانہ ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ کچھ نقاد اپنی علمیت بگھارنے کے لیے کہانی اور افسانہ کو الگ الگ صنف بتاتے ہیں۔ جبکہ اُردو میں افسانہ اور ہندی میں کہانی کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی تحریری علم تو ہے نہیں جیسے علمِ عروض! بس جس نے جو چاہا وہ لکھ دیا۔ ''لالی پاپ'' عنوان بڑا خوبصورت ہے۔ یہ افسانہ ہیروئن، پرڈیوسر اور فنانسر کے درمیان بُنا گیا ہے۔ فنانسر جو فلم کی یونٹ میں سب کا مائی باپ ہوتا ہے کیونکہ سب سے بڑی طاقت یعنی پیسہ اُسی کا استعمال ہوتا ہے۔ رام کھیلاون کشواہا فنانسر ہے جو ایم۔ ایل۔ اے بھی ہے۔ وہ ہیروئن پر فدا ہو جاتا ہے اور اُسے اپنے قریب لانے کے لیے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر فوٹو کھچوانا چاہتا ہے۔ ہیروئن اُس کی نیت بھانپ جاتی ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ کشواہا اُس کے قریب آئے یا اُسے چھوئے۔ مگر کاروباری جذبہ کے تحت وہ اُس کے ساتھ تصویر کھچوانے پر راضی ہو جاتی ہے۔ کشواہا کہتا ہے۔

''رینوکا جی، ہم آج تک کسی مہیلا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر فوٹو نہیں بنوایا ہوں ۔۔۔ آپ سے پوری آشا ہے کہ آپ ہم کو اس بات کی اجاجت دیں گی''۔

اس پر رینوکا کہتی ہے۔ ''سر، میری کمر کیا آپ جہاں چاہیں بلا جھجک ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ لیکن۔۔۔۔!''

''لیکن کیا؟'' کہتے ہوئے کشواہا اپنا دایاں ہاتھ اُس کی کمر کی جانب بڑھاتا ہے، وہ فوراً پیچھے ہٹ جاتی ہے اور ابروؤں کو اُچکاتے ہوئے کہتی ہے۔

''لیکن!۔۔ لیکن سر۔۔۔ بھارتیہ سبھیتا اور سنسکرتی بھی آپ کو اس بات کی اجازت دے''۔

کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ بہت خوبصورت کلائمیکس ہے۔ اس سے اچھا کلائمیکس ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ فلم کی مہورت کی منظر نگاری بہت خوبصورت ہے۔ ہم اشتیاق کے ذہن میں سجی سجائی تصوّراتی تقریب میں جا کر انجوائے کر پاتے ہیں۔ بالی ووڈ میں جگہ جگہ کہانیاں بکھری پڑی ہیں، ہر انسان کی اپنی ایک کہانی ہے۔ چاہے وہ پروڈیوسر ڈائریکٹر ہے یا ایک معمولی لائٹ مین! بمبئی موضوعات کا مرکز ہے۔ ضرورت ہے تیسری آنکھ کی جو اشتیاق کے پاس ہے جس سے وہ گہرائی تک دیکھتے ہیں۔

کہانی ''جان میں جان'' مجھے ذاتی طور پر بہت پسند ہے۔ یہ کہانی اور بھی طویل ہو سکتی تھی ۔مگر اشتیاق نے اپنے اسلوب سے اسے مختصر اور جامع بنا دیا، یہ کہانی آج کے جدید اور ترقی یافتہ دور کے مُنہ پر ایک زناٹے دار تھپّڑ ہے۔ ہم ترقی کی راہوں سے گزر کر کسی بے غیرتی کی دل دل میں

اُترتے جارہے ہیں۔اشتیاق نے خوبصورت اشارہ دیا ہےاور بتایا ہے کہ ہماری تہذیب کیا ہے۔اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری تہذیب ،ہماری سبھیتا ٹی۔وی۔سیریلوں میں نظر آتی ہے عام زندگی میں نہیں۔ایک ماں کی بیٹی ناجائز طور پر حاملہ ہوجاتی ہے۔ماں بیٹی کو اسپتال لے جاکر اُس کا ابارشن کرواتی ہے پھر اسپتال کی سیڑھیاں اُترتی ہوئی ماں بیٹی سے کہتی ہے۔اب جاکر میری جان میں جان آئی اور کہتی ہے دھنیہ ہو دیوی،تم نے سمسیہ کا سمادھان کردیا اور مزید کہتی ہے کہ اس عمر میں من بہک ہی جاتا ہے پھر بھی ساودھانی رکھو۔وہ وقت اور تھا جب بیٹی ناجائز طور پر حاملہ ہوجاتی تھی تو مارے شرم کے خودکشی کرلیتی تھی۔ماں اپنی بیٹی کا قتل کردیا کرتی تھی۔آج بیٹی کا حمل گرواکر کہتی ہے احتیاط برتا کرو۔بہت ہی پیاری کہانی ہے۔اشتیاق واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

جیسے فلم کا ٹائٹل سانگ پُرکشش ہوتا ہے۔اُس کی دھن فلم پر چھائی رہتی ہے اسی طرح افسانوں کے اس مجموعے کا افسانہ'' حاضر غائب'' ہے۔ڈاک سے جب یہ کتاب میرے ہاتھوں میں آئی تو میں ٹائٹل دیکھ کر خود سے مخاطب ہوا۔'' حاضر غائب'' یہ کیا نام رکھ دیا اشتیاق نے۔حاضر بھی اور غائب بھی۔وہ کہتے ہیں نا کہ کنارے سے کبھی اندازۂ طوفان نہیں ہوتا۔بس یہی بات یہاں صادق آتی ہے۔'' حاضر غائب'' کا مطلب جاننا ہے تو افسانہ پڑھیے۔جسے میں اشتیاق کے اس مجموعے کا بہترین افسانہ قرار دیتا ہوں۔یہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ اشتیاق جس ڈھنگ سے عورت کی جذبات نگاری کرتا ہے وہ اپنے اندر ایک مثال ہے۔اچھے افسانے کا یہ وصف ہے کہ اُس کے کردار آپ کے ذہنوں میں زندہ ہو اُٹھیں۔جن کردار کا خالق اُس کو اپنے اوپر اوڑھ لے اُس کے دُکھ درد اُس کی پریشانی خود سمجھنے لگے تو کردار کا زندہ ہو اُٹھنا قدرتی بات ہے۔لڑکیاں جو تعلیم یا روٹی روزی کے سلسلہ میں گھروں سے باہر نکلتی ہیں۔لوکل ٹرینوں اور بسوں کی بھیڑ کا مقابلہ کرتی ہیں۔تنگ گلیوں اور بازاروں سے گزرتی ہیں۔'' حاضر غائب'' اُن کی کہانی ہے۔اشتیاق نے اُن کے مسائل کو سمجھا اور کہانی میں پرویا ہے۔لڑکیاں کس طرح ہوس پرست لوگوں کی نظروں کا سامنا کرتی ہیں ۔۔۔کس کس طرح اُن کی طرف اُٹھے ہاتھوں کو کہاں کہاں برداشت کرتی ہیں۔کہانی کی مرکزی کردار لڑکی سات سال کی عمر سے مرد کی ہتھیلیوں کا لمس برداشت کرتی چلی آئی تھی۔پہلے پہل تو مرد کا ہاتھ لگتے ہی اُس کا جسم گنگنا اُٹھتا تھا۔پھر آہستہ آہستہ وہ اس لمس کی عادی ہوگئی۔پھر اُس کے وہ اعضاء بےحِس ہوگئے جہاں شہوت پرست لوگوں کے ہاتھ لگتے تھے۔یعنی کوئی اُس کو ہاتھ لگاتا تو اُسے محسوس ہی نہ ہوتا کہ اُسے کوئی چھو رہا ہے۔اس بےحِسی کو اشتیاق نے اعضاء کا غائب ہوجانا علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔وہ علامت نہیں کہ قاری اُلجھ کر رہ جائے۔سادہ سی عام فہم علامت

ہے۔ یہ شاید اشتیاق کا پہلا افسانہ ہے جس میں اُس نے بات کو چھپا کر ایک مثال کے طور پر پیش کیا ہے، یہی مرحلہ حاضر غائب کے سوال کا معنی ہمیں بتاتا ہے۔ وہ اپنے اعضاء کی بے حسی، افسانہ کے مطابق اعضاء کے غائب ہونے پر بہت فکر مند ہے اور اپنی ایک سہیلی سے بڑی سنجیدگی سے اس حاضر غائب ہونے کے سانحے کو بیان کرتی ہے تو سہیلی بہت ہنستی ہے اور بمشکل تمام اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ تو سمجھتی تھی کہ حاضر غائب کا مسئلہ اُس کا اپنا ہی ہے۔ یہ تو تمھارا بھی مسئلہ ہے۔ اشتیاق سعید نے یہاں یہ بات برملا کہہ دی کہ حاضر غائب کی یہ بیماری عام ہے۔ یہ میٹروپولیٹین شہروں میں رہنے والی تمام لڑکیوں کا مسئلہ ہے۔ اشتیاق نے جس چابکدستی سے اس موضوع کو عوام کے سامنے رکھا ہے اُس کا جواب نہیں۔ یہ وہی لکھ سکتا تھا جس کو لوکل ٹرینوں اور بسوں کی بھیڑ کا ذاتی تجربہ ہو۔ اس بہترین افسانے کی تخلیق پر میں نے اشتیاق کا ہاتھ چوم کر اپنی پسندیدگی کا اور افسانے کی کامیابی کا اظہار کیا ہے۔ کاش یہ سرپھرے نقاد، عصری ادب کا مطالعہ کرپاتے اور گروہ بندی کے حصاروں سے نکل کر فن کی خوبصورتی کو محسوس کرپاتے اور اشتیاق جیسے افسانہ نگاروں کو اپنی فکر کا محور بناتے۔ کیا کریں ان کو تو چاپلوسوں کی گروہ بندی نے قید کر رکھا ہے۔ جب یہ نقاد مضمون لکھتے ہیں تو اپنے غیر معیاری ادب تخلیق کرنے والے ادیبوں کی فہرست تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں، جن میں زیادہ تر ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ آج کل اُردو ادب میں ڈاکٹر ہونے کا معیار کیا ہے یہ اب ہر کوئی سمجھتا ہے۔ عصری ادب کو بغیر پڑھے یہ لوگ ناقص لکھ دیتے ہیں۔ یقین کیجئے آج کا ادب ناقص نہیں بلکہ آج کی تنقید گل سڑ گئی ہے۔

''چور پر مور'' ایک عیاش شخص کی کہانی ہے جو دوسروں کی بیویوں کے ساتھ فلرٹ کرتا ہے۔ کہانی کے اختتام پر پتہ چلتا ہے کہ اُس کی بیوی بھی کم عمر لڑکے کے ساتھ گیسٹ ہاؤس سے باہر آتے دکھائی دیتی ہے اور اپنے شوہر کے اصول کے مطابق اُس لڑکے سے کہتی ہے کہ وہ جس سے ایک بار مل لیتی ہے دوبارہ کبھی نہیں ملتی۔ اشتیاق جو بات کہنا چاہتا ہے وہ کہنے میں کامیاب ہے۔

افسانہ ''فرنگی'' پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے، جو فلم اشتیاق ہمیں دکھا رہا ہے وہ بدستور ہمارے ذہن کے پردے پر چل رہی ہے۔ یہ اشتیاق کی بھوت پریت والی دوسری ہارر ٹائپ کہانی ہے۔ طویل ہونے کے باوجود کہانی میں جھول نام کی کوئی چیز نہیں بلکہ اختتام تک تجسس بنا رہتا ہے۔ فرنگی مر کر بھی دوست کی محبت میں گرفتار ہے اور غفور بھی دوستی کا حق ادا کرتا ہے، محسوس ہوتا ہے جیسے یہ اشتیاق کی اپنی آپ بیتی ہے۔ دیہاتی منظر نگاری اور مکالمے بہت متاثر کرتے ہیں۔ میری خواہش یہ ہے کہ اشتیاق اس میں فلمی مسالے ڈال کر اس کی فلم لکھ ڈالیں، ویسے بھی ہارر فلموں کا آج

بھی کی۔ کدن جو کہ ثبات کے والد حیات کی بیوی شکیلہ بیگم کی بہن جمیلہ بیگم کا بیٹا تھا۔ دونوں ماں بیٹے کی نیت ان کے غم میں شریک ہونے کی نہیں تھی بلکہ ثبات کے والد کی جائیداد اور فنڈ سے ملنے والی رقم پر نظر تھی۔ جس کے لئے دونوں ماں بیٹے دن رات پلان بنا رہے تھے کہ کس طرح یہ تمام جائداد اور رقم حاصل کی جائے، اب مشکل یہ پیدا ہوگئی تھی کہ ثبات اس جائیداد کا اصل وارث آ گیا تھا۔ جو ان کے راستے کا سب سے بڑا کانٹا تھا۔ ان کا پلان تھا کہ کسی طرح ثبات کو بے دخل کر کے اس کی بہن ثانیہ سے شادی ہو جائے، وہ طرح طرح کی جھوٹی کہانیاں گھڑ کر شکیلہ بیگم کے کان بھرتے رہے کدن بار بار یہی کہتا کہ خالہ جان ثبات کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اپنی کروڑوں کی جائداد چھوڑ کر یہاں آ کر کیوں رہنے لگا۔ ذرا سوچئے یہ ضرور آپ کو بے گھر کر دے گا اور ایک دن یہ گھر اور ساری جائیداد ہڑپ کر لے گا۔ شکیلہ بیگم بہت سمجھدار تھیں۔ دونوں ماں بیٹوں کے بار بار کان بھرنے پر بھی ان کے خیالات نہیں بدلے۔ وہ بار بار یہی کہتی رہیں کہ اسے اس جائیداد کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے پاس کیا کمی ہے، کئی بنگلے کاروبار اس کا کم نہیں ہے۔ جو اس گھر اور چند لاکھ روپوں کی خاطر یہاں آ گیا لیکن کدن اور جمیلہ بیگم یہی کہتی رہتیں۔ یہ اقتباس دیکھئے:

> ''خالہ جان۔ آپ ان سرمایہ داروں کو نہیں جانتیں، ان کا بس چلے تو آدمی کے جسم سے کپڑے ہی نہیں کھال تک اتار لیں جیسے جیسے پیسہ بڑھتا ہے ویسے ہوس بڑھتی جاتی ہے کدن کسی بے حد مدبر بے حد تجربہ کار آدمی کی طرح بول رہا تھا، مجھے تو واقعی ڈر لگنے لگا ہے۔ ثانیہ جمیلہ بیگم نے جھرجھری سے لی کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن تمہارا یہ سوتیلا بھائی تم تینوں کو اس گھر سے ہی نکال باہر کر دے۔''

اس طرح روز روز کی باتوں سے شکیلہ بیگم پر تو کچھ اثر نہ ہوا۔ ہاں ثانیہ ضرور محسوس کرنے لگی۔ دونوں ماں بیٹوں کے لاکھ بہکانے پر بھی شکیلہ بیگم پر کچھ اثر نہ ہوا تو حضرت نظام الدین پر جا کر کسی مولوی سے تعویذ گنڈوں کے لئے چکر لگانے لگے کہ کسی طرح کدن کی شادی ثانیہ سے ہو جائے۔ تو سارا معاملہ صحیح ہو جائے اور گھر جائیداد سب اپنے قبضے میں آ جائے لیکن ثانیہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی کدن کی طرف راغب نہ ہوئی۔ تو مجبوراً دونوں نظام الدین کے دربار میں پہنچ کر مولوی سے ایسا تعویذ حاصل کرنے میں لگ گئے، جس سے کہ ثانیہ ان کے قبضے میں آ جائے اور خود اپنی زبان سے کہنے پر مجبور ہو جائے کہ میں شادی کروں گی تو کدن سے ہی۔

یوں تو اقبال انصاری کے اس ناول میں کوئی نیا پن نہیں ہے، وہی پرانی باتیں اپنے بیگانے رشتے ناطے، تعویذ گنڈے، زمین جائیداد کے جھگڑے، جو اکثر ہمارے معاشرے میں دیکھے جاتے

کل فقدان ہے۔جبکہ بچّے ہارر فلمیں دیکھنے کے شوقین ہیں۔ٹیلی پلے بھی اچھا بنایا جاسکتا ہے۔یہ میری ذاتی خواہش ہے،اس لیے بھی کہ اشتیاق فلم سے وابستہ ہیں۔

''ابونمبر وَن'' ماڈرن زمانے کی فاحشہ ماؤں کی منی کہانی ہے۔''فولادی ایمان'' کا بھی شمار اشتیاق کی منتخب کہانیوں میں کی جاسکتی ہے۔جو بہت خوبصورت ڈھنگ سے تخلیق کی گئی ہے۔ایمان کی پختگی کی ایک اچھی مثال ہے۔رنڈی اپنی شکل وصورت اور شباہت کی وجہ سے کسمپرسی کی حالت میں،اُس کی طرف کوئی گاہک دیکھتا تک نہیں۔راوی حساس ہے اور جذباتی بھی اُس پر ترس کھا کر سو روپے دیتا ہے مگر اُسے چھوتا نہیں۔وہ کمرے میں چلنے اور تفریح کرنے کی بات کرتی ہے۔راوی جواب دیتا ہے کہ پھر کبھی سہی۔کہانی تو وہیں مکمل ہوجاتی ہے جب وہ کہتی ہے''نہیں رے بابا۔۔۔میرے کو حرام کا نئیں منگتا''۔اگر میں اس کہانی کو تخلیق کرتا تو اس مکالمے سے آگے نہیں بڑھتا۔مگر مکالمے اشتیاق اتنے پیارے اور کردار کے اپنے مزاج کے تخلیق کرتے ہیں کہ جی چاہتا ہے پڑھتے ہی جائیں۔عنوان کی خاطر کہانی کبھی کبھی آگے بڑھانا پڑتی ہے۔مکالمہ ملاحظہ فرمائیں۔''دیکھو ساب،وہ اُدھر جو اوپر بیٹھا ہے نا،وہیچ اکھا دُنیا کا کھانا پانی چلاتا ہے۔اپن بھی تیچ دُنیا میں رہتی ہے کر کے اپنا بھی چلتا ہے''۔کم سے کم اتنی خالص بمبیا زبان،ہم نہیں لکھ سکتے۔اشتیاق ۰۰۰ ہی بمبئی میں رہنے کا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔مجھے کہنے دیجئے کہ اگر اشتیاق اعظم گڑھ ہی میں رہے ہوتے تو اشتیاق سعید ہرگز نہ بن پاتے،ممکن ہے اشتیاق احمد ہی رہ جاتے اور ان کے فن پر اتنا نکھار نہ آتا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو'' حاضر غائب'' نے اشتیاق سعید کو معیاری افسانے لکھنے والوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔اشتیاق سعید فنکار ہے،اس کا ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ نقاد اور مضمون نگار صاحبان کبھی اُن کو گنتی میں نہیں رکھتے،یہ فارمولا آزما کر دیکھ لیں۔نقادوں کی فہرست میں وہی لوگ ہوں گے جو چمچہ گیری اور چاپلوسی کا ہُنر جانتے ہوں گے اور اپنے آپ کو خود ہی Established افسانہ نگار بتا رہے ہوں گے۔اُن کی تخلیق نے کبھی کسی کو متاثر کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر P.R.O.Ship کے صدقے اُن کے آقا تو اُن کا نام لیتے ہیں۔اشتیاق اپنے بازوؤں کی طاقت پہ جینے والا ایک خوددار،بے باک اور سچا فنکار ہے۔اشتیاق چغتائی کی طرح اپنے موقف پر قائم ہے،اپنی فکر کے مطابق افسانے تخلیق کرتا ہے۔میری دعا ہے کہ اشتیاق بہت اور بہت لکھے کیونکہ کل کا ادب انہیں نوجوان قلمکاروں کے کندھے پر ہوگا،اُس وقت تک شاید ہم نہ ہوں گے جب تک ہیں اشتیاق کو مزید پڑھتے رہنے کی خواہش رکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ اشتیاق کے افسانے ہمیں خود پڑھواتے رہیں گے۔ ☆☆☆

مراق مرزا

امکان وایقان کے درمیان

اہل علم ودانش کے لئے وضاحت وصراحت کی ضرورت نہیں ۔ وہ اس ازلی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ روز اول سے ہی ظاہر وباطن تمام زمین وآسمان مغلوب وقت ہیں اور یہ کہ ابتدائے آفرینش سے ہی زندگی کی ہر شکل وصورت میں وقت ہی محوسفر ہے ۔ جوگزر گیا وہ بھی کاروان وقت ہی تھا ۔ جو زمانۂ حال میں ہمارے ساتھ چل رہا ہے وہ بھی قافلہ وقت ہی ہے اور جو مستقبل کی کوکھ میں پوشیدہ ہے وہ بھی وقت ہے ۔ وقت عیاں بھی ہے اور نہاں بھی ۔ زندگی اسے عیاں رکھتی ہے ۔ اور پردہ موت میں وہ نہاں رہتا ہے ۔ ایک ایسی غیر مرئی (Invisible) روشنی ہے جس کی لامحدود وسعتوں میں کائنات کی ہر شئے اپنا وجود رکھتی ہے ۔ مختصر یہ کہ حیات کے ہر رنگ ونقش کا رشتہ وقت سے ہے ۔ لہٰذا ان ناقابل تردید حقائق کی اساس پر یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ جب سے علم وادب دنیا وجود میں آئی ، تب سے لے کر تا حال اس ارض حیات پر جتنے بھی قلمکار گزرے ہیں ، انھیں بھی وقت نے ہی جنم دیا ہے ۔ یہ سبب ہے کہ ہر قلمکار کے قلمی اثاثے میں اس کے اپنے وقت کی ہی نقاشی یا مصوری ملتی ہے ۔ عصر حاضر کے معروف شاعر غیاث انجم کا قلم بھی اپنے وقت کا ترجمان ہے اور ان کی شاعری میں ان کا اپنا عہد سانس لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ کریں ؎

عجب موسم ہے صحرا جل رہا ہے
لب دریا بھی پیاسا جل رہا ہے

نگاہوں پر یقیں ہم کیسے کر لیں
مگر سچ ہے کہ لمحہ جل رہا ہے

گزر ممکن نہیں شاید ہوا کا
گھروں کا ہر دریچہ جل رہا ہے

ٹھہر کے راہ میں کوئی تو حال دل پوچھے
جدید دور میں کیا ایسی آرزو رکھنا

نہ جانے کب ہو یہاں کربلا کا منظر پھر
بچا کے اپنے رگ وپے میں تم لہو رکھنا

مذکورہ بالا اشعار بلا اشتباہ عہد حاضر کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ مادہ پرستی کے اس دور میں ہر طرف خود غرضی، مفاد پرستی اور اپنے سے کمزوروں کو کچل کر آگے بڑھتے رہنے کا چلن عام ہے۔ آپسی خلوص ومحبت، خیر سگالی، نیز بھائی چارگی کا جذبہ مادیت کی نذر ہو گیا ہے۔ جدھر بھی نظر اٹھایئے انسانی اقدار کی پامالی کا سلسلہ جاری ہے۔ ایسے میں انسان کو آج ہر قدم پر جلتے ہوئے لمحات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہمارے آس پاس کا ماحول جلتے صحرا کی مانند ہو گیا ہے۔ لہٰذا ہوائیں خاموش ہیں اور گھروں کے دریچے جلتے نظر آرہے ہیں۔ اس دور پر آشوب میں ہم سے کوئی حال دل پوچھے، ایسی امید رکھنا عبث ہے۔ ہم ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں جہاں کسی بھی پل کربلا کا منظر دوہرایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ آج کے دور کے انسان کو مشکل اور غیر متوقع حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ غیاث انجم نے ان اشعار کے ذریعہ نہایت صاف وشفاف انداز میں اپنی بات نذر قارئین کردی ہے۔ کچھ مزید اشعار دیکھیں ؎

جس پیڑ کو اللہ ثمر سے نہ نوازے
تقدیر میں اس کی کوئی پتھر نہیں ہوتا

جو گاؤں سے آتے ہیں وہ لاتے ہیں بہت کچھ
ہمراہ مگر ان کے مرا گھر نہیں ہوتا

آنچل میں چھپا لیتی ہے جب ماں کی محبت
اس وقت مرے جیسا سکندر نہیں ہوتا

لو چراغوں کی بڑھانے کے لئے زندہ ہیں
ہم لہو اپنا بہانے کے لئے زندہ ہیں

تم ہمیں گرد سفر جان کے رسوا نہ کرو
ہم تمہیں راہ دکھانے کے لئے زندہ ہیں

فن کار آیا وہ شاعر ہو یا سنگ تراش، افسانہ نویس ہو یا برشی تصویر نگار اُس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا دل حساس ہو اور نظر اپنے گرد و نواح کی نہ صرف ظاہری بلکہ باطنی صورت تک پہنچنے کی قوت بھی رکھتی ہو کیونکہ وہ اپنے آس پاس کی دنیا کو ہی اپنی تخلیق کا مرکز و محور بناتا ہے، ''سات سروں کی میٹھی ہل چل'' غیاث انجم کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ جو حال ہی میں میرے مطالعے سے گزرا ہے۔ ہر چند کہ گذشتہ کئی برسوں میں غیاث انجم کے نام نامی سے واقف ہوں اور ان کی منظوم تخلیقات ملک و بیرون ملک کے معیاری رسائل و جرائد کے وسیلے سے میرے مطالعہ میں آتی رہی ہیں تاہم کسی شاعر کی تخلیق کو کتاب کی صورت میں ایک ساتھ پڑھنے سے اس کی مجموعی شخصیت اور فکری وسعت و عمیقیت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے۔ غیاث انجم کے مجموعہ غزلیات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا دل دردِ ذات سے زیادہ زمانے کے انتشار و خلفشار اور ان سے پیدا ہونے والے مسئلہ مسائل اور انسانی کرب و اضطراب کو محسوس کرنے کی بھرپور طاقت رکھتا ہے اور ان کی نگاہ تتلی کے پنکھوں کی تکان اور اس کی آنکھوں میں رقص کرتی اداسی کو قریب سے دیکھ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ انھیں رب کائنات کی ذات پر محکم یقین ہے۔ اس لئے ان کا ایمان ہے کہ کسی شجر کو ثمر اس ذات کبیر کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ وہ حصار ظلمت میں قید آج کی مادہ پرست دنیا میں روشنی بکھیرنے کے لئے اپنا لہو بہانے کو تیار رہتے ہیں۔ زمانے کی تنگ نظری و بے اعتنائی کے باوجود وہ اسے اجالوں بھری زندگی کی راہ دکھانے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ شہری زندگی کا اپنا ایک Glamour ہوتا ہے لیکن پیشہ ورانہ ضرورت کے تحت بوکارو اسٹیل سٹی سے رشتہ جوڑنے کے بعد غیاث انجم نے اپنے گاؤں کو فراموش نہیں کیا۔ سچ یہ ہے کہ ان کا آبائی گاؤں آج بھی ان کے فکر و خیال اور ان کے احساس میں موجود ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب کبھی

کوئی گاؤں سے شہر آتا ہوا دکھائی دیتا ہے، تو وہ اس میں اپنا گاؤں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ یہ ایک فطری عمل بھی ہے۔ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے اور اس کی زندگی کے ابتدائی ماہ وسال جہاں گزرتے ہیں۔ وہ اس مقام کو کبھی فراموش نہیں کر پاتا۔ غیاث انجم ایک روشن فکر شاعر ہیں۔ اوپر درج کئے ہوئے اشعار ان کے سچے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی فکری پرواز کے کچھ اور رنگ ملاحظہ کریں ۔

غفلت نہ کر کہ چین سے جینا بھی ہو محال
چلنا پڑے گا وقت کی رفتار دیکھ کر

اندھی گلی کے لوگ ہی اندھے خداؤں کو
آواز دے رہے ہیں شب تار دیکھ کر

چاہنے کی خطا ہوگئی
عمر بھر کی سزا ہوگئی

ہم بھی تہذیب والے ہی تھے
زیست نذرِ وفا ہوگئی

زندگی اپنی ہم کھو چکے
عشق کی انتہا ہوگئی

تمام لفظ ومعانی ہیں صرف اسی کے لئے
کہ جس کی ذات ہے ہم سب کی رہبری کے لئے

کبھی جو خوف خدا سے وجود کانپ اٹھے
بہت ہی قیمتی ساعت ہو زندگی کے لئے

وہ جن کا ذہن ہو آماجگاہِ مکر و فریب
قدم بڑھاؤ نہ تم ان کی دوستی کے لئے

جس طرح استعارے کنائے اور علامتیں صنف شاعری کا اہم جزو ہیں۔اسی طرح رمز وابہام بھی شعر وسخن کے لازمی عناصر خیال کئے جاتے ہیں۔گو کہ اساتذہ نے آسان زبان اور سادگی بھرے انداز میں کی جانے والی شاعری کو شعر ادب کے فروغ کے لئے احسن قرار دیا ہے تاہم میری ذاتی رائے یہ ہے کہ شاعری اتنی بھی سادہ اور سہل نہیں ہونی چاہئے کہ نظم ونثر کے درمیان کا فرق ہی مٹ جائے اور اتنی ثقیل اور بعید از فہم بھی نہیں کہ اس کی تفہیم کے لئے قاری کو ذہنی وفکری مشقت سے گزرنا پڑے۔غیاث انجم کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کسی بھی خیال کو شعری پیکر میں ڈھالتے وقت ثقالت سے اکثر گریز کرتے ہیں اور بھاری بھرکم الفاظ کے بجائے عام فہم لفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔ان کے استعارات وعلامات بھی آسانی سے فہم وادراک کی آغوش میں اتر جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار ایک ہی قرأت میں قاری کے ذہن ودل سے اپنا رشتہ بنالیتے ہیں۔مندرجہ بالا اشعار ان کے اس تخلیقی وصف کی واضح دلیل ہیں۔

اخیر میں حمد ونعت کے چند اشعار جو مجھے بے حد پسند آئے ملاحظہ کریں۔

ورائے لفظ وبیاں لا الٰہ الا اللہ
وقارِ کون ومکاں لا الٰہ الا اللہ

تمام شے ہے قادر وہ ذات رب کریم
اسی یقیں کا نشاں لا الٰہ الا اللہ

یہی ہے حاصل ایماں کہ ہے حقیقت میں
نوید ِ امن واماں لا الٰہ الا اللہ

زمانہ اس کا زیاں کیا کرے گا اے انجم
ہے جس کے دل پہ عیاں لا الٰہ الا اللہ

جو اک اشارہ رسالت مآب کر دیں گے
سیاہ شب کو شب ماہتاب کر دیں گے

میں ظلمتوں کا ہوں مارا، وہ ہیں سراج منیر
مری حیات کو روشن کتاب کر دیں گے

نکل پڑا ہوں میں صحرا میں اس یقین کے ساتھ
وہ تپتی دھوپ کو اک دن سحاب کر دیں گے

چلیں گے راہ نبیؐ پر تو دیکھنا انجمؔ
بپا زمانے میں اک انقلاب کر دیں گے

ہر بڑے شاعر کی طرح غیاث انجم کی شاعری بھی اپنے وقت کی شاعری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں کہیں کہیں گذرے وقتوں کے نشان بھی مل جاتے ہیں۔ مسرت کی بات ہے کہ شعر وسخن کے اس مشکل سفر میں غیاث انجم نے وقت کو کہیں بھی اپنے فکری پرواز سے الگ نہیں ہونے دیا گویا کسی بھی شعر میں کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جسے محض فکری ترنگ خیال کیا جا سکے۔ ''سات سروں کی میٹھی ہل چل'' میں شامل تمام غزلیں امکان وایقان کے درمیان گامزن کاروان وقت کی الگ الگ تصویریں پیش کرتی ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر غازی علم الدین

کی

دو اہم کتابیں

(۱) میثاق عمرانی

(۲) تنقیدی و تجزیاتی زاویے

ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری
Mb:0969 7393552

خواجہ احمد عباس کی ڈرامہ نگاری

خواجہ الطاف حسین حالی کے خاندان سے تعلق رکھنے والے اردو، انگریزی اور ہندی کے معروف فکشن نگار، سوانح نگار، مفکر اور دانشور، صحافی اور اعلیٰ درجہ کا فلم ساز خواجہ احمد عباس (1914-1987) کی ابتدائی تعلیم ان کے آبائی وطن پانی پت میں ہی ہوئی اور اعلیٰ تعلیم انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی، پھر اپنی خداداد صلاحیتوں کو برائے کار لانے کے لئے انہوں نے ممبئی کو موزوں پایا، اس طرح ان کی شہرت کا ستارہ برصغیر سے باہر بھی دنیا کے مختلف یورپی ممالک میں بھی چمکا۔ اس بات کا بین ثبوت ہمیں اس حقیقت سے بھی ملتا ہے کہ ان کے ایک مشہور ناول 'انقلاب' یا Son of India روسی ایڈیشن-90,000 کی تعداد میں چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک گیا ا، خواجہ احمد عباس کی کتابوں کے متعدد ایڈیشنز مختلف زبانوں میں اور مختلف ممالک میں نکل گئے، حالانکہ اصل میں وہ اردو کے آدمی تھے۔ اردو کو انھوں نے کافی دے دیا۔ ان کا کل سرمایہ 12 کتابوں اور 62 فلموں پر مشتمل ہے۔

اردو میں ان پر کافی لکھا گیا، کچھ مضامین، رسالوں کے خصوصی شمارے ہریانہ اردو اکادمی کی مرتب کردہ کتاب ''خواجہ احمد عباس افکار، گفتار، کردار'' (تہذیب و ترتیب راج نرائن راز) ان پر مختلف یونیورسٹیوں میں ریسرچ بھی کروائی گئی۔ حال ہی میں 'آج کل' دہلی اور 'اردو دنیا' نے جون ۲۰۱۴ء کے شمارے خواجہ احمد عباس پر ہی نکالے، لیکن جہاں ان کی ادبی صحافتی اور فلمی زندگی کے مختلف

گوشوں کو اجاگر کیا گیا، وہاں ان کی ڈرامہ نگاری کے بارے میں کُھل کر کچھ نہیں لکھا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کسی مضمون نگار نے Passing Refrence کے طور پر ایک آدھ جملہ ان کے ڈراموں کے حوالے سے درج کیا ہے۔ حالانکہ ان کے ڈرامے اگر یکجا کئے جائیں گے تو ان پر ایک مبسوط مقالہ ضرور تیار ہوسکتا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے سبھی ڈرامے بکھرے ہوئے ہیں، ان کے بیشتر ڈرامے IPTA نے اسٹیج کروائے اور پھر وہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے یا مختلف رسالوں کی زینت بنے۔

اس لئے ان پر یہاں الگ الگ گفتگو کرنے کی سعی کی جائے گی۔ 'زبیدہ' پہلی بار 'نیا سنسار' کی وساطت سے شائع ہوا۔ یہ پانچ ابواب پر مشتمل ایک مکمل ڈراما ہے۔ مصنف نے پیش نظر ڈرامے کے موضوع کا انتخاب وہ ہی کیا ہے، جو انہوں نے اس سے پہلے اپنی چند کہانیوں کے لئے کیا تھا، مطلب یہ کہ وہ مسلم معاشرے میں پردے کے خلاف تھے۔ 'زبیدہ' انہوں نے کیوں لکھا؟ اس ڈرامے کا اصل محرک کون ہے؟ اس کے بارے میں وہ پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

''اس ڈرامے کو میں نے صرف لکھا ہے، تخلیق نہیں کیا۔ اس کا بنیادی کردار اور ڈرامائی عروج (کلائمکس) دونوں حقیقت پر مبنی ہیں۔ 'مالابار' کے ایک چھوٹے سے شہر میں بیماری پھیلی شرفا اور سماج کے بڑے بڑے نیتا خدا کی مرضی اور بھگوان کی اچھا کہہ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ تب ایک پردہ دار خاتون کی غیرت قومی کو حرکت ہوئی۔ وہ چار دیواری سے باہر نکل آئی اور اپنے ہم شہریوں کو بیماری کی روک تھام کے لئے للکارا۔ ریلیف کمیٹی بنی اور باوجود مخالفت کے اس نے علاج معالجے اور شہر کی صفائی کا انتظام کیا۔ بیماری کا پھیلاؤ رک گیا۔ مگر جس جواں ہمت خاتون نے یہ سب کیا۔ جان دے کر شہادت کا مرتبہ پایا۔'' [۲]

ڈراما زبیدہ مسلمانوں کے طبقہ شرفاء سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی باہمت لڑکی کی درد بھری کہانی ہے، جسے ایک قومی سانحہ نے اتنی روحانی اور اخلاقی قوت بخشی کہ وہ اپنے پورے خاندان میں برسوں سے مروج پردے کی رسم کو توڑ کر گھر کی چار دیواری سے باہر آکر لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دیتی ہے۔ دراصل زبیدہ کا جان کی بازی لگانے کا عزم ہی زیر نظر ڈرامے کا اصل موضوع بنا۔ 'زبیدہ' میں مرزا احمد بیگ (جن کا تعلق شرفاء طبقے سے ہے) کی ریاست اب برائے نام رہ گئی ہے، ان کے دیگر احباب حکیم بیدلؔ، میر صاحب، لالہ جی اور خان صاحب ان ہی کے مختلف روپ ہیں۔ ان کے بیٹے امجد علی اور مُنّن میاں بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں، زبیدہ کے والد حامد علی پڑھے لکھے شخص ہیں اور وہ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو عقل سکھانے کی کوشش

کرتے ہیں لیکن جہالت کے اس نقار خانے میں ان کی آواز کون سن سکتا ہے۔لڑکی کا باپ ہونے کی وجہ سے انہیں کھل کر جاہل بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ زبیدہ کی نسبت ان کے آوارہ مزاج اور لاابالی بیٹے امجد بیگ سے طے جو ہو چکی ہے۔اس ڈرامے میں مرزا احمد بیگ اپنی بیٹھک میں جنگ کے بارے میں تبصرہ کرتا ہے، جس سے اس ڈرامے میں خاص طوالت پیدا ہوگئی ہے مگر اس سے ڈرامے میں مزاح کا عنصر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ڈراما 'زبیدہ' نہ صرف سماج میں مروج ناسور کے ایک خلاف ایک زبردست احتجاج ہے بلکہ اس کے ذریعہ سماج دشمن عناصر کا پردہ فاش بھی کیا گیا ہے، ڈراما نگار نے 'زبیدہ' کے سماجی قیود سے باہر آنے، اس کے خدمت خلق میں ایک ہو کر جٹ جانے اور انجام کار اپنی جان قربان کر دینے سے ڈرامے میں زبردست المیہ کا تاثیر پیدا کیا ہے۔

'زبیدہ' میں مکالمے کے تاثر کا سبب یہ ہے کہ اس کا موضوع مرکزی خیال کی وضاحت کرتے ہوئے ڈرامائی عمل کو آگے بڑھا کر نقطہ عروج تک لے جانے میں قاری کی معاونت کرتا ہے، اس ڈرامے کے سبھی کردار اپنی اپنی طبقاتی حیثیت اور تعلیمی استعداد کے مطابق ہی اظہار خیال کرتے ہیں۔اس لئے ان کی گفتگو تاثیر میں خاصے اضافے کا باعث بنتی ہے۔مرزا احمد بیگ اور ان کے دوستوں کے درمیان ہونے والی بات چیت ہمیں ان لوگوں کی جہالت کے بارے میں بھی بتا دیتی ہے، جس سے اس ڈرامے کے مرکزی خیال سے بھی قاری کی توجہ نہیں ہٹتی۔

اپٹا کے ڈراموں کی یہ بڑی خوبی ہے کہ پس پردہ یا پردہ کے پیچھے سے مختلف آوازوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔اس ٹیکنک کے ذریعہ ڈرامے کی تاثیر میں اور زیادہ اضافہ کیا جاتا تھا۔یہاں ڈرامے کی نوعیت دستاویزی دستاویزی ڈرامے کی بن جاتی تھی اور اس طرح ایک بڑے موضوع یا Subject کو بھی ایک اسٹیج ڈرامے میں پیش کیا جاتا تھا۔

ڈراما 'زبیدہ' کے دوسرے ایکٹ میں فوجی بینڈ، گولے پھٹنے، توپیں چلنے، جہازوں، ٹینکوں وغیرہ کی آوازیں سنائی جاتی ہیں۔

ان پس پردہ آوازوں یا کمنٹری یا راوی سے یہاں ڈراما نگار اپنے مطلب یا نظریے کو بھی پوری طرح سے ادا کرتا ہے مثلاً 'زبیدہ' کے مرنے کے بعد یہ آواز آتی ہے:

''ایک آواز: زبیدہ ہندوستان کی بیٹی تھی۔جس پر ہندوستان ہمیشہ ناز کرے گا۔

دوسری آواز: زبیدہ اسلام کی بیٹی تھی۔اس نے انسانوں کی خدمت میں جان دے کر شہادت کا درجہ پایا۔

تیسری آواز: (عورت کی) زبیدہ نے ہم عورتوں کا سر اونچا کیا۔

ہیں، ان موضوعات پر پچاس سال پہلے ہی علامہ راشد الخیری کی ناول لکھ چکے ہیں۔ اقبال انصاری نے بھی انھیں پرانے موضوعات کو پیش کیا ہے لیکن سلیقے سے۔ یہ ان کا ہنر ہے کہ بات اور موضوع بالکل پرانے لیکن پیش کش نئی۔ جیسے کدن اور جمیلہ بیگم جب مولوی صاحب کو ثانیہ پر جادو چلانے کی بات کرتے ہیں تو مولانا نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ بھائی میں ایسے تعویذ نہیں بناتا۔ ہاں میں آپ کو ایک دوسرے مولانا کا پتہ بتائے دیتا ہوں۔ وہ اس قسم کے تعویذ بناتے ہیں کدن اور جمیلہ ان کے پاس جاتے ہیں۔ وہ ساری نوعیت سمجھ کر چار ہزار کے قریب خرچ بتاتے ہیں۔ جمیلہ بیگم اپنا پتہ فون نمبر لکھ کر رقم دینے کا وعدہ کر کے آجاتی ہیں۔

اقبال انصاری کے اس ناول میں جہاں ایک طرف اپنوں کی جعلسازیوں اور مطلب پرستی کو پیش کیا ہے، وہیں دوسری طرف اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ آج جب ہم سائنس کے عروج کے زمانے میں بھی فرسودہ رسموں میں جکڑے ہوئے ہیں، پچاس سال قبل راشد الخیری نے جن موضوعات پر خوبصورت ناول لکھے۔ ان پر دوبارہ اقبال انصاری نے قلم اٹھا کر کونسا کمال کیا ہے۔ بس یہی بات اس ناول کو اہم بناتی ہے کہ آج علم وادب کی ایجادوں نے سارے جادوٹونوں اور تعویذ گنڈوں جیسی فرسودہ روایات کا خاتمہ کر دیا ہے لیکن مسلمان اور بھی پیچھے کی طرف جارہے ہیں اور معاشرے میں پھیلی ان برائیوں کو بجائے ختم کرنے کے اور بھی اس طرف راغب ہورہے ہیں۔ دین اسلام کو چھوڑ کر جہالت کے غاروں میں دبتے چلے جارہے ہیں۔ انصاری نے اپنے اس ناول میں ہی نہیں ان کی زیادہ تر کہانیاں میں نئے پن کی جگہ اصلاحی پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے۔ یہ ناول بھی اس کی زندہ مثال ہے۔ ان کے ناولوں میں کہانی کا خاتمہ چونکا دینے والا نہیں ہوتا بلکہ کہانی کا اختتام ایک خوشگوار ماحول پر ہوتا ہے۔ 'اپنے' کا اختتام بھی اس طرح سے ہوتا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''رات کے آٹھ بجے ثبات نہا دھو کر نیچے اترا۔ اور باہر جانے لگا۔ شکیلہ بیگم ثانیہ اور گلوڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ بھائی جان۔ وہ۔

چپ! ثانیہ مرزا نے تیز آواز میں گلو کی بات کاٹی اور جھپٹ کر اٹھی اور ثبات کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔ ثبات چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ آپ کہیں جارہے ہیں۔ ثانیہ بڑے غصہ میں بولی لیکن جانا بھی ہے تو کھانا کھا کر جائیں گے۔ بہت ہو چکا تماشا۔''

وہ ثانیہ جو ایک لمحے کو بھی ثبات کو پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اب نہ صرف اسے روک رہی تھی بلکہ اپنے غصے کا اظہار بھی کر رہی تھی اور راستہ روک کر کھڑی ہوگئی تھی کہ آپ کس طرح جائیں گے۔

چوتھی آواز: (بچے کی) زبیدہ نے ہم بچوں کو موت سے بچانے کے لئے اپنی جان دیدی۔
پانچویں آواز: زبیدہ نے اپنی جان دے کر، اپنے شوہر کو اپنے دیش کو زندہ کیا۔ ۳

ڈراما 'زبیدہ' پہلی بار ۱۹۴۴ء میں بلراج ساہنی کی ہدایت کاری میں اسٹیج کیا گیا اور اس میں دیوآنند، دمنتی ساہنی، چیتن آنند جیسے اداکاروں نے کام کیا تھا۔

'یہ امرت ہے' ایک نظریاتی یکبابی ڈراما ہے، جس کا بنیادی موضوع اور مقصد یہ ہے کہ دنیا محنت کش طبقے ہی کے دم سے قائم ہے، عمل پیہم پر چونکہ اس دھرتی کی بنیاد ہے اور اس پر اس کے ارتقا کا دارومدار ہے۔ اسی لئے مزدور جو مسلسل جدوجہد کی ایک علامت ہے۔ لافانی ہے اور حیات دائمی پانے کے لئے اسے کسی امرت یا آب حیات کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ محنت ہی دراصل وہ امرت ہے، جو انسان کو لافانی بنا دیتا ہے۔

اس ڈرامے میں ایک سائنسداں امرت بناتا ہے۔ اس کی ایک خوراک حاصل کرنے کے لئے اس کے پاس ایک فلمی اداکارہ آجاتی ہے تاکہ وہ حیات دائمی پاکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے مداحوں کو اپنے حُسن سے خوش کرتی رہے۔ ایک سامراجی سیاست دان آجاتا ہے تاکہ وہ امر ہوکر دنیا کو سامراجی شکنجے میں اور بھ بری طرح کس ڈالے۔ مشہور ڈکٹیٹر ہٹلر بھی یہ آب حیات سائنسدانوں سے اس لئے مانگتا ہے تاکہ وہ دنیا کو گھٹیا قسم کی غیر آریائی نسلوں سے پاک وصاف کردے گا۔ مذہب کے نام پر درپردہ بیج بونے والے مذہبی رہنماؤں کا نمائندہ بھی یہ آب حیات پینا چاہتا ہے۔ غرضیکہ ہر وہ شخص یہ آب حیات پینا چاہتا ہے، جس کا مقصد زندگی ہوتا ہے، دوسروں کو مغلوب کرنا مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ سائنس داں امرت کی ایک خوراک ان میں سے کسی کو بھی دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے کیونکہ اس کے پاس اس کی مقدار محدود ہوتی ہے اور وہ اپنی فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور کو ہی اب یہ خوراک دینا چاہتا ہے لیکن مزدوران کی یہ پیش کش ٹھکرا دیتا ہے، وہ اس لئے کیونکہ اس نے خود ہی محنت کا آب حیات نوش کیا ہے، اس لئے امر ہونے کے لئے اسے کسی اور امرت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، اسی اثناء میں سائنسداں کے ہاتھ سے یہ امرت گر جاتی ہے اور یہی اس ڈرامے کا نقطۂ عروج بھی ہے۔

موصوف مصنف نے زیرنظر ڈرامے میں اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو تخلیق کرکے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ سرمائے اور محنت، جمہوریت اور سامراجیت اور اس کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے عوام کے درمیان جدوجہد میں ملا، پنڈت اور پادری تک بھی لوگ شریک ہوتے ہیں۔ ۴

'انناس اور ایٹم بم' خواجہ احمد عباس کا ایک یکبابی ڈراما 'شاہراہ' دہلی جون ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ یہ بھی ایک نظریاتی ڈراما ہے، جس میں مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ سرمایہ دار طبقے نے اپنے تحفظ کے لئے پورے کرۂ ارض کو موت اور تباہی کے دہانے پر لا کر کھڑا کیا ہے لیکن اس کے بنائے ہوئے اس عفریت نے اس کا اپنا امن وسکون بھی چھین لیا ہے۔ سیٹھ لکشمی چند کے پاس کافی دھن دولت ہونے کے باوجود بھی اسکے پاس سکھ چین اور شانتی نہیں ہوتی ہے، یہ اس لئے ہوا کیونکہ اس نے یہ دولت غلط طریقے سے حاصل کر لی ہے، اس کے سر پر موت کا بھوت سوار ہو گیا ہے، وہ وہ جی بھر کے کھانا کھاتا ہے، پھر اونگھ جاتا ہے، اسی دوران نیم خوابیدہ حالت میں ریڈیو پر ایٹم بم کی تباہ کاریوں کا ذکر سُن کر اس کے اندر خوف کا بھوت بیدار ہو کر اسے اس قدر دہشت زدہ کر دیتا ہے کہ خواب سے بیدار ہو کر اسے راج کالایا ہوا انناس بھی ایٹم بم دکھائی دینے لگتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنی لڑکی رجنی کی شادی بھی راج جیسے قلاش نوجوان سے طے کر دیتا ہے جسے وہ پہلے کئی بار نفی میں جواب دے چکا تھا۔

چند خامیوں کے باوجود یہ ڈراما بڑا دیرپا تاثر پیدا کرتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے دھرتی کے لال، اور 'دو بیگھے زمین' دو اور ڈرامے اپٹا کے لئے لکھے ہیں۔ دھرتی کے لال میں بنگال کے قحط کی عکاسی کی گئی اور دو بیگھے زمین، میں چھوٹے کسانوں کے کرب اور ان کی زمین پر سرمایہ دار کے قبضے کی داستان بیان کی گئی ہے۔

بٹوارے اور فسادات پر ان کے ڈرامے 'میں کون ہوں؟' کا بھی پتہ چلتا ہے، اپٹا نے ممبئی کی مزدور بستیوں میں یہ ڈراما کھیلا، گاندھی کے قتل پر خواجہ احمد عباس نے 'گاندھی جی اور غنڈہ' کے عنوان سے ایک ڈراما لکھا۔ 'بارہ بج کر پانچ منٹ' شاہراہ دہلی اگست ۱۹۴۰ء کے شمارے میں پہلی بار شائع ہوا۔

اس ڈرامے میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمارے صحافیوں سے معاشرہ کیسی کیسی غلط قسم کی توقعات رکھتا ہے۔ سرمایہ داروں نے کیسے اس عظیم پیشے کو تجارت سمجھا ہے۔ جس سے ایک بااصول اور باضمیر صحافی کے لئے کام چلانا کتنا مشکل بن گیا ہے۔ یہاں اخبار کا مالک بھی کسی حد تک اس بات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ ایڈیٹر کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی اصول پرستی کو بالائے طاق رکھ کر اخبار میں مار دھاڑ، قتل وغارت، چوری چکاری و دیگر سنسنی خیز خبریں چھاپے۔ فیشن ایبل طبقے کی عورتوں کی خبریں، مس کلاک والا جیسے لوگوں کی صحت کا خیال رکھنے والا سوامی چھوٹا آنند اپنا بھاشن صفحہ اول پر چھپنا دیکھنا چاہتے ہیں۔ پرانے اور نئے کلچر کے نام نہاد ٹھیکیداروں کی کارکردگی اخبار کے صفحوں پر ہو۔

یہ ڈراما بہت ہی جاندار ہے۔اس میں وحدت تاثیر ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ ۵

متذکرہ بالا ڈراموں کے علاوہ بھی خواجہ احمد عباس نے 'میں کون ہوں؟' ۱۹۴۷ء، لال گلاب کی واپسی ۱۹۶۵ء، رپورٹرا، ۱۹۶۱ء اور پرچم جیسے ڈرامے لکھے اور اسٹیج کئے، جنہیں کافی سراہا گیا۔

چونکہ خواجہ احمد عباس کے یہ سبھی ڈرامے تقریباً اپٹا کے لئے لکھے گئے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ یہاں اپٹا کے قیام اور مقاصد پر بھی ایک نظر ڈالی جائے گی تاکہ اس کے ساتھ ساتھ عباس صاحب کا نظریہ بھی کچھ واضح ہو جائے گا۔

اردو ڈرامے کے فرو میں اپٹا یعنی India people's Theater asdcration نے اہم رول انجام دیا ہے۔ اپٹا سے قبل پارسی تھیٹر قدرے عامیانہ انداز، ہندوستانی ڈرامے کی قدیم اور شاندار روایت کے لئے مجروح کن ثابت ہوا تھا، بعد ازاں ہندوستان میں ریڈیو کی آمد نے ڈرامے سے اسٹیج کا ناتا توڑ دیا تھا۔ان حالات میں ڈرامے کی عظمت کی بحالی کے لئے ۱۹۴۳ء میں اپٹا کا قیام عمل میں آیا، اپٹا کے وجود میں آنے کے محرک ڈرامے اور تھیٹر کے احیاء کی ضرورت کے احساس کے ساتھ ساتھ وہ سماجی اور سیاسی حالات بھی تھے، جو قومی اور عالمی سطح پر رونما ہو رہے تھے۔طوفان کی طرح اٹھتا ہوا فاشزم، انسانیت کو پامال کرتا چلا جا رہا تھا۔ ہندوستان پر بھی اس کے کالے بادل منڈلانے لگے تھے، جس کی ایک بھیانک شکل قحط بنگال کی صورت حال بھی تھی، اس کے علاوہ اس وقت ہندوستان میں جدوجہد آزادی اپنے عروج پر تھی۔ایسے ماحول میں عوام میں بیداری پیدا کرنے اور ان کی ترتیب و تنظیم کے لئے بصری آرٹ (Visnal art) جیسے موثر اور کارگر ذریعہ Madiam کو فروغ دینا ضروری تھا۔

اپٹا نے تھیٹر اور ڈرامے کے عالمی منظر نامے کو اپنے سامنے رکھا اور تکنیکی سطح پر مشرقی روایت کے ساتھ ساتھ جدید مغربی تکنیک کو بھی اپنانے کی کوشش کی، جس کی بنا پر ڈرامے کی پیش کش میں بہت سے نئے اور کامیاب تجربے کئے گئے، اس تحریک کا ایک بڑا اثر یہ بھی ہوا کہ بہت سے نئے طبع زاد ڈرامے لکھے گئے۔ ۶

بلراج ساہنی نے ۳ر جنوری ۱۹۴۵ء کو کہا تھا کہ ''اپٹا نہ تو کسی سیاسی جماعت سے منسلک ہے نہ کسی گٹ سے۔'' ۷ لیکن پھر ایسا کچھ نہیں ہمیں دیکھنے کو ملا البتہ اپٹا نے ہمیشہ کمیونسٹ پارٹی اور ترقی پسندی کی ہی ترجمانی کی ہے۔خواجہ احمد عباس اپٹا کے بانیوں میں ہیں۔ان کے ساتھ اپٹا سے وابستہ دیگر لوگوں میں انل ڈی سلوا، شمبھو مشرا، راجندر سنگھ بیدی، مناڑے، بلراج ساہنی، حبیب تنویر،

پرتھوی راج کپور، کیفی اعظمی، پریم دھون، سردار جعفری، اور صفدر ہاشمی وغیرہ جیسے اہم نام ہیں۔

اگر چہ اپٹا سے جڑنے کی وجہ سے خواجہ احمد عباس پر ترقی پسندی یا سیاست زدگی کا لیبل لگایا جاسکتا ہے لیکن انہوں نے اردو ڈرامے میں تکنیک کے جو نئے تجربے کئے ہیں، ان کو ہم کبھی نہیں بھول سکتے ہیں اس لئے ابراہیم یوسف ان کے ڈرامے زبیدہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس ڈرامے کو اردو ڈرامے کی روایت کے خلاف ڈاکومینٹری فارم میں لکھا گیا ہے، اس طرح اپٹا نے ڈرامے کی ساخت اور پیش کش میں نئے نئے تجربات کئے، جس سے اردو ڈرامے کے لئے نئی راہیں کھلیں اور نئے تجربات کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔'' ۸

خواجہ احمد عباس کے بارے میں ڈاکٹر ضیاء الدین کی رائے بھی اپنا خاص وزن رکھتی ہے:

''انھوں نے ڈرامے کو جہاں پایا، وہاں سے اسے آگے لے جانے میں خاصا کام کیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ان کا فنی جوہر ڈرامے کے مقابلے میں افسانہ اور ناول میں زیادہ کامیابی کے ساتھ نمایاں ہوا ہے۔'' ۹

کتابیات

۱ آج کل جلد ۷۲ شمارہ ۱۱ جون ۲۰۱۴ء (من کہ - خواجہ احمد عباس) صفحہ ۴

۲ زبیدہ خواجہ احمد عباس - نیا سنسار ممبئی ص: ۱۰۰

۳ ایضاً ص: ۸۴ و ۸۵

۴ ملاحظہ فرمایئے۔ یہ امرت ہے۔ خواجہ احمد عباس۔ اشاعت گھر حیدر آباد سن ۱۹۴۴ء

۵ ان ڈراموں کے سلسلے میں اس کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

خواجہ احمد عباس، افکار، گفتار، کردار (تہذیب و ترتیب) راج نرائن راز ہریانہ اردو اکیڈمی ۱۹۸۹ء

۶ اپٹا اور اردو ڈراما، شاہد رزمی، تخلیق کار پبلی کیشنز نئی دہلی ۱۹۹۵ء ص: ۱۲-۱۳

۷ بیسویں صدی میں اردو ادب۔ مرتب گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکیڈمی ۲۰۰۲ء ص: ۲۲۰

۸ ترقی پسند ادب (پچاس سالہ سفر) ترتیب پروفیسر قمر رئیس رسید عاشور کاظمی، ایجوکیشنل پبلی کیشنز ہاؤس دہلی۔ ۲۰۰۰ء

۹ خواجہ احمد عباس: ڈاکٹر ضیاء الدین، ادارہ فکر جدید، دریا گنج نئی دہلی۔ ۱۹۹۴ء ص: ۱۱۶

☆☆☆

ڈاکٹر لطیف سبحانی
Mb:9225796871

غزل کی آبرو کا محافظ: پی پی سریواستوا رند

پی پی سریواستوا رند کا تعلق دہلی سے ہے۔ وہ نوئیڈا میں مقیم ہیں۔ وہ اردو زبان وادب کے شیدائی ہیں۔ پرانے بزرگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کا تعلق اردو اور تہذیبی صحافت سے بھی رہا ہے۔ اردو زبان وشاعری کی خدمات میں کے اعتراف میں انھیں اردو اکیڈمی لکھنؤ نے سن ۲۰۱۱ء میں ''امیر خسرو ایوارڈ'' سے نوازا ہے۔ جو ایک لاکھ پچاس ہزار روپئے، سپاس نامہ، شال اور میمنٹو پر مشتمل ہے۔ اسی طرح دہلی کی ایک مستند ادبی انجمن ''لٹریری فوم'' نے ''تہذیب غزل ایوارڈ'' سے سرفراز کیا ہے۔ یہ ایوارڈ سابقہ وزیر ہند ایم افضل عطا کرتے ہیں۔

غزل کا فن دشوار ترین فن ہے۔ جب تک فکری موضوعاتی سطح پر وجدان، احساسات وجذبات، تجربات ومشاہدات کی کڑیاں ایک واحد مرکز پر مجتمع نہ ہو جائیں۔ موضوع ومعنویت کا امتزاج نہ ہو جائے۔ افکار، خیال، جذبے احساسات میں ہو کر ایک جان نہ بن جائے، غزل بننا مشکل ہے۔ غزل کے مزاج کو اپنانا اس کے چیلنج کو قبول کرنا بڑا دشوار ترین مرحلہ ہے۔ جو ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار غزل گو شعراء کے ریلے میں جنھیں ہم غزل کا اہم شاعر کہہ سکتے ہیں۔ ان میں پی پی سریواستو رند کا بھی شمار ہوتا ہے۔ جو عصر حاضر کے ایک کہنہ مشق، خوش فکر، قادر الکلام اور خوش ادا شاعر ہیں۔ گداز دل کے شاعر ہیں۔ اپج اور طباع ذہن کے شاعر ہیں۔ جنھوں نے غزل کے چیلنج کو قبول کیا، اسے برتا۔ غزل کی رگوں میں گرم گرم خون دوڑاتے رہے

ہیں۔ان کے نو شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ریگزار، رگ سنگ، گلرنگ، شہر احساس، شجر شجر چھاؤں، آسمان کے بغیر، دھوپ کا مسافر، طنابین دھوپ کی، مکان زخموں کا وغیرہ۔

وہ تخلیقی فن کار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں ابھر کر سامنے آئے اور اپنی صلاحیت سے غزل گوئی کے جوہر دکھائے ہیں۔وہ غزل کی آبرو کے محافظ اور پاسبان ہیں۔ان کے افکار و خیالات کے تر تازہ رنگین پھول غزل کے روپ میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔غزل کہنے کے لئے میر تقی میر کی دردمندی، دردشناسی، اسلوب کی نرم روی، جذبے کی لطافت، پرخلوص سپردی کی جلوہ گری، کہنے کا انداز اور اسلوب خالص غزل کی زبان میں ہے۔فکر و خیال کو غزل کا پیراہن عطا کیا ہے۔وہ کہتے ہیں۔

جھنڈ میں بیٹھے پرندے دھوپ میں یہ سوچتے ہیں
شہر کے حالات سے اپنا کھنڈر محفوظ تو ہے

چھت پر چڑھ کر کوئی سورج کو آواز تو دے
تاریکی نے پھیلائے ہیں تانے بانے کیا

غزل کے موضوعات میں کافی وسعت ہوتی ہے۔اس میں افاقیت ہوتی ہے۔رندی و سرمستی سے لے کر تصوف تک سب کچھ سمویا ہوتا ہے۔رند نے اپنی غزلوں میں معنی کی کافی وسعت پیدا کی ہے۔غزل کو نئے لب و لہجے سے قوس قزح کے رنگوں کی آمیزش کر کے خود اپنا طرز سخن ایجاد کیا ،اس میں شبہ نہیں کہ محبت غزل کا دین و دھرم ہے۔اس کے باجود بھی ''آسمان کے بغیر'' کی غزلوں میں ایک بھی مضمون تغزل کا نہیں ملتا۔ان کی غزلوں میں خیال بھی نیا ہوتا ہے۔پیرایہ اظہار میں ندرت بھی پائی جاتی ہے اور کمال کا پہلو بھی نظر آتا ہے۔کچھ باتیں ایسی ضرور کہنے کی کوشش کی ہے، جو کسی کے دل میں پیوست، ہو جائے یا کسی موضوع سے قاری متاثر بھی ہو سکے۔رند کے دل میں وسعت، ذہن میں کشادگی، نظر میں بالیدگی اور نئے خیالات کا راستہ کھلا رکھا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ۔

وحشتوں کا رقص پیہم ظلمت شب کا خمار
یہ خرابہ ہے تو پھر تنہائیوں سے کیا کہوں

مرا وجود بھی اک ملگجا لفافہ ہے
پرانی قبر سے نکلے ہوئے کفن کی طرح

رندؔ معاشرتی تقاضوں، عصری حیثیت سے وابستگی اور تاریخی شعور سے بھی پوری طرح آشنا ہے۔ شاعر کی حیثیت سے رند نے کیوں کہا؟ کیسے کہا؟ اور کیا کہا؟ اس کی بڑی اہمیت ہے۔ دراصل شعر جس دور میں سانس لیتا ہے۔ اس عہد کے حادثات، سانحات، واقعات سے ضرور دوچار ہوتا ہے۔ زندگی کے مدوجزر سماج، حالات یا سیاست جو کچھ اپنا رنگ ڈھنگ دکھاتی ہے۔ حساس شاعر اسے اپنی ذات کا ایک حصہ ضرور بناتا ہے۔ پھر اس پر غور خوض کر کے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ یہی عصری حسیت کہلاتی ہے۔ رندؔ کی شاعری میں عصری زندگی کی تمام تر وسعتیں، تمام سمتیں اور مسئلوں پیچیدگیوں کا عکس جھلکتا ہے۔ نئی فکر عصری زندگی اور پیچیدگیوں کو سلیس رواں عام فہم اور دلچسپ زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ رند نے گھر دیوار، سایہ، دھوپ، شجر، پیاس جیسے بے شمار الفاظ سے عصری حسیت کی پہچان بنائی ہے اور معنویت پیدا کرنے، نئے امکان دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

میری بیساکھیاں تک دوست لے جاتے ہیں
کم سے کم دیکھ تو لیتے مجھے گھر جانا ہے

بارشوں کو کہاں فرصت کہ یہ بھی سوچیں
گھر کی دیوار شکستہ ہے کہ چھت ٹوٹی ہے

ہوگیا بیمار سورج شام کی دہلیز پر
گاؤں کی سرحد پہ لیکن سرخیاں تھیں دور تک

خیر کے تمام پہلو تمام گوشے ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ وہ فلسفیانہ اور صوفیانہ موضوعات کے جال میں نہیں پھنستے، ان کا اپنا ایک الگ اسٹائل ہے۔ انھوں نے قدیم مضامین، فرسودہ موضوعات اور تراکیب سے صرف نظر کر کے غزلوں میں ایک کلچر کی ترجمانی کی ہے۔ ان کی شاعری میں انسانیت کی تڑپ، انسانیت و دردمندی، حادثات کی دستک جو اپنے دل و دماغ پر شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ گردوپیش کے تلخ حقائق داخلی کشمکش کا عکس خود اعتمادی، نیکی و شرافت سے روشن ضمیر، صداقت پسندی، یہی وہ تمام عناصر موجود ہیں۔ جس سے فکر و احساس کی آنچ دے کر جاندار لفظوں کے حسن سے شعر کو جنم دیا ہے۔

مہابھارت ہو چاہے کربلا ہو
ہمارے ہی گھروں کا سلسلہ ہے

احتیاط خاص کی یہ دین ہے لوگو کہ ہم
زندگی بھر دوستوں کے پیار سے ڈرتے رہے

سڑک کے دونوں کنارے پڑے ہیں خانہ بدوش
اب ان کو ان کے ہی ڈیرے سے کیوں نکالا جائے

بٹ نہ پایا و سیہ دار درخت
گھر کے بچوں نے یوں تو بانٹا گھر

انسان کا گھر سکون، چین، آرام، اطمینان کا مسکن ہوتا ہے۔ اس کا اپنا گھر اس کی پوری کائنات ہوتی ہے۔ رند کے یہاں گھر کے بارے میں بے شمار اشعار ملتے ہیں۔ جس میں بیسویں صدی کے انسان کی مختلف حالتوں، کیفیتوں اور خواہشوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کی بے سروسامانی، وحشت، اپنی اندرونی کیفیت، سکون کی تلاش، خواہش ذہنی اطمینان کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے اشعار ہر شخص کو اپنے گھر کی کہانی معلوم ہوتے ہیں۔

ان اشعار کو پڑھ کر وحشت فکر، تخیل کی بلندی، عمومیت اور آفاقیت کی خوبیاں جلوہ گر ہوتی ہیں۔

چلو اے رند اپنے گھر کو جائیں
کہ آگے بے گھروں کا سلسلہ ہے

تمام گھر میں تپش رینگنے لگی اے رند
یہ دھوپ ہے کہ الاؤ جو سائبان میں ہے

ہم سے پوچھو اذیتیں دل کی
ہم نے دیکھا ہے اپنا جلتا گھر

دھوپ کے احساس کی لذت بھی لازم تھی کہ رند
گھر کے سائے بھی درو دیوار سے ڈرتے رہے

عجیب باسی گھٹن ہے رند گویا
گھر اک آسیب کا مسکن بنا ہے

جناب رند ایسے رہ رہے ہیں
کہ جیسے کوئی پردیسی ہے گھر میں

☆☆☆

سیفی سرونجی کی نئی تنقیدی کتاب شائع ہوچکی ہے

تنقید شناسی

فہرست مضامین: غالب کی عظمت کا راز، اردو کا قد آور افسانہ نگار: منٹو، ابنِ صفی اور عام قاری ، عاشق اردو پروفیسر گوپی چند نارنگ، عاشق اردو علم وادب کا پرستار عبدالقوی دسنوی، بھوپال میں اردو غزل کے فروغ میں باسط بھوپالی کا حصہ، ریاض انصاری اور نور فکر، نامور محقق ناقد ابومحمد سحر، شہر میں گاؤں: ندا فاضلی، وہاب اشرفی سے لندن میں چند یادگار ملاقاتیں، پروفیسر حامدی کاشمیری ، اردو غزل کا عالمی استعارہ: وسیم بریلوی، مابعد جدیدیت اور نظام صدیقی، آسان لفظوں میں بڑی بات کہنے والا شاعر: منور رانا، ڈاکٹر راحت اندوری اپنے کلام کی روشنی میں، ساجد رشید سے چند یادگار ملاقاتیں، محمد صلاح الدین پرویز بحیثیت نظم نگار، نارنگ ساقی، حافظ کرناٹکی بحیثیت رباعی گو ، اردو صحافت کا ستون: ڈاکٹر عزیز برنی، ارشد مینا نگری کے ادبی کارنامے، چشمۂ چشم: کرشن کمار طور ، حقانی القاسمی نے حق دوستی ادا کیا، خورشید اکبر کی شاعری، نئی غزل کا اہم نام: مشتاق صدف، دیپک کنول کی کہانیاں، اپنے عہد کی ترجمان آج کی غزل، مدھیہ پردیش میں آزادی کے بعد اردو صحافت، بھوپال میں 80 کے بعد شائع ہونے والی اہم کتابوں کا تنقیدی جائزہ، کوثر صدیقی بحیثیت رباعی گو، مظفر ایرج کی شاعری 'سخن آئینہ' کی روشنی کی، شاہد پٹھان 'تعبیر وتاویل' کی روشنی میں ، ڈاکٹر مہتاب عالم کا ادبی کارنامہ 'وسط ہند میں اردو ادب'، باکمال شاعر سراج دہلوی، ہرش برہم بھٹ کی غزلیہ شاعری، عارف خورشید۔

Rs:200-

شمس الہدیٰ انصاری
Mb:09386697272

قاضی نذرالاسلام عظیم انقلابی شاعر

میں اپنے کمرے میں کرسی سے لگا دریچے سے باہر سُنسان افق کی طرف دیکھ رہا تھا، سائے گھنے ہو چکے تھے، کہیں دور کمرے کے باہر سے ایک اونچی کھجور کی چوٹی نظر آرہی تھی اور اس سے الجھا ہوا شرمیلا چاند کچھ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے کوئی نئی دلہن شب اول اپنے محبوب کی خواب گاہ میں جانے سے پیشتر سنگار کر کے آخری بار شیشے میں اپنا منہ دیکھ کر تھرتھرا رہی ہو۔ فضائیں خاموشیوں سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس شاعر کے تخیّل کی طرح جس کا ایک مصرعہ موزوں ہو چکا ہو۔ لیکن دوسرا مصرعہ پرندے کی طرح گرفت میں نہ آ کر اپنی پرواز سے ہواؤں میں کشیدہ کاری کر رہا ہو۔

ہر طرف خاموشی تھی گہری اور بوجھل جس کو میرے کمرے کے پنکھے کی آواز بیچ بیچ میں توڑ کر اور بھی گہری اور بوجھل کر رہی تھی۔ دفعتاً پارس کے کمرے سے ایک نوجوان اپنی آواز میں کوئی گانا گنگنانے لگا اور اس کی آواز میرے سماعت کے پردے سے آہستہ آہستہ ہم آہنگ ہونے لگا۔ گیت کے الفاظ کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگے۔ یہ کوئی بنگالی نوجوان تھا، جو بنگالی زبان میں ایک گیت گا رہا تھا، اور میں اپنے ہی خیالوں میں کھویا کسی دور افتادہ کے تصور میں ڈوبا اپنے خوش آئند مستقبل کا تانا بانا بُن رہا تھا۔

پھر بنگالی گیت کے الفاظ میرے تحت الشعور میں ڈوبتا رہا اور مجھے محسوس ہوا گویا برسات کا بادل ہواؤں کے دوش پر پہاڑ کو بھی اڑا کر لے جا رہا ہو۔ کوئی دور سے مجھے پکار رہا ہے اور میں ہوں کہ

اس طرح اس ناول میں اقبال انصاری نے ایک گھسے پٹے موضوع کو بھی اپنی ہنرمندی اور فنکارانہ چابکدستی سے نئے رنگ بھر دئے اور تمام مسلم معاشرے پر طنز کرتے ہوئے ایک بہترین اصلاحی ناول لکھ کر ایک اچھے ناول ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان ہونے کا فرض بھی ادا کیا۔

خواب حقیقت :

اس میں کوئی شک نہیں کہ خواب بھی حقیقت بن سکتے ہیں، بس شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر حوصلہ اور صبر کا دامن تھامے رہنے کی ہمت ہو، مشکلات کا سامنا کرنے اور حالات سے لڑنے کا حوصلہ ہو۔ رخسانہ تبسم کے اس ناول میں صائمہ کا کردار ایک ایسا ہی کردار ہے، جس میں ہمت اور حوصلہ اور حالات سے مقابلہ کرنے کی ہمت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس نے اپنے بڑوں کا احترام کیا اور چھوٹوں سے شفقت کی، حالات کا مقابلہ کیا، نوکری کی اور گھر گرہستی چلائی۔ رخسانہ تبسم وادی کشمیر کی ایک اہم ناول نگار ہیں۔ انھوں نے 'خواب حقیقت' ناول لکھ کر اپنے سماج میں اخلاقی قدروں کے زوال کی تصویریں بہت خوبصورت اور فنکارانہ انداز میں کھینچی ہیں۔ شاید وہ اس کردار کی جیتی جاگتی تصویر خود ہیں۔ اس لئے کہ فنکار کی شخصیت تو اجاگر ہو کر ہی رہتی ہے۔ رخسانہ تبسم جس ماحول میں رہتی ہیں اور ان کے آس پاس جو کچھ انھوں نے دیکھا ہے، اسے ہو بہو اپنے ناول میں پیش کر دیا ہے۔ ایک مسلم معاشرے میں پلی بڑھی صائمہ کے کردار کو انھوں نے اپنے خاندان کی کفالت اور ایک گھریلو ماحول کو جس طرح پیش کیا ہے۔ وہ تمام باتیں ان کے اس ناول میں ہی نہیں آس پاس کی زندگی میں ہر گھر میں دیکھ سکتے ہیں۔ عام طور پر اب مسلم گھروں میں نماز کا اہتمام بہت کم ہو گیا ہے اور اگر ہے بھی تو لکھنے والا فیشن پرستی میں اتنا ڈوب جاتا ہے کہ وہ کسی بھی مسلم خاندان کا تذکرہ کرتا ہے تو ایک سچے مسلمان کی تصویر کھینچنے میں تامل کرتا ہے کہ اس سے اس کی فیشن پرستی پر آنچ آتی ہے لیکن رخسانہ تبسم نے اپنے اس ناول میں صائمہ کے خاندان کو ایک سچے مسلمان کے کردار کو واضح کیا ہے۔ یہ ان کے ناول کی بڑی خصوصیت ہے۔ گھر میں نماز کا اہتمام، آداب وتہذیب اس ناول میں دیکھی جاسکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کشمیر کو ہندوستان کی جنت کہا جاتا ہے لیکن اب کشمیر میں کیا حالات ہیں، اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے رخسانہ تبسم نے سب کچھ بیان کر دیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''دوسرے دن تقریباً سبھی مہمان جانے کی تیاری کر رہے تھے کیونکہ لوگ جلد از جلد اپنے گھر پہنچنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ یہاں کے حالات پچھلے کچھ سالوں سے غیر یقینی تھے۔ فائرنگ کراس، فائرنگ مار دھاڑ، قتل وغارت گر، پکڑ دھکڑ.....دھماکے، آتش زنی، لوٹ مار، اغوا کاری اور عزت وناموس کا لٹنا، یہ سب کچھ تو اب روز کا معمول بن چکا تھا۔ بھرے بھرے اور پر رونق شہر اب

گہری نیند سو رہا ہوں اور ایک نہایت حسین خواب دیکھ رہا ہوں۔

پکارنے کی یہ آوازیں میرے خواب میں چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کی ہزاروں شبیہیں بن رہی ہیں اور یہ بچے بھی ہنسنے لگے اور جیسے میری آنکھ کھل گئی ہو۔ بنگالی گیت کی آواز اُبھرتی جارہی تھی اور بیچ بیچ میں گیت کے الفاظ صاف صاف سمجھے جاسکتے تھے اور وہ گا رہا تھا۔ اپنی شاہکار نظم 'باغی'۔

گیت ختم ہوگیا لیکن رات ختم نہ ہوئی اور میں جہاں کا تہاں دریچے سے لگا اپنے کمرے میں بے حس وحرکت کھڑا رہا۔ عجیب گیت تھا، کبھی اس سے پہلے کسی نے میرے جذبات کی اتنی سچی ترجمانی نہیں کی تھی۔ یہ تو میرے ہی جذبات تھے، میرے ہی دل کی آواز تھی، بغاوت کی آگ میرے اندر بھی بھڑکی ہوئی تھی، میں بھی 'باغی' تھا۔ یہ عمر کا وہ دور تھا جب جذبات طوفانی لہروں کے جھاگ کی طرح دل ودماغ پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ سوچنے کی طاقت بہت حد تک دب جاتی ہے، اور انسان جھاگ کے بلبلوں پر قوس قزح کے رنگوں میں محو پرواز ہوجاتا ہے۔ ان رنگوں کو ٹوٹتے ہوئے بلبلوں کے قرمزی رنگوں کو کس نے اس لطافت سے آس پاس کی دنیا میں سمو دیا۔ 'باغی' نے اپنے تمام تر احساسات سے میرے اندر بغاوت کی شدت کو جگا دیا۔ میں اس کی آہنگ میں سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے صبح ہوگئی۔ اگلے ہی دن صبح اس بنگالی سے ملاقات کا طریقہ نکالا اور پھر معلوم ہوا کہ وہ قاضی نذرالاسلام ہے اور اپنی ودروہی (باغی) گا رہا تھا۔

قاضی نذرالاسلام آج یعنی ۲۰۱۳ء تک ۱۱۴ سال پہلے بردوان ضلع بنگال کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک معمولی کسان کے گھر پیدا ہوئے۔ قدرت نے اسے پالا پوسا، افلاس کے بے رحم ہاتھوں نے اور ذہانت نے ان کے ذہن ودماغ نے آبیاری اور تربیت کی۔ اسکول اور کالج کی نیرنگیاں اس کی زندگی کو میسر نہ آئیں، اٹھارہ برس کی عمر میں وہ فوج میں بھرتی ہوکر جنگ اول عراق کے میدانوں میں چلا گیا اور سچ پوچھئے تو یہی میدان جنگ اس کے لئے سب سے بڑی تعلیم گاہ ثابت ہوا۔

جب وہ حولدار بن کر ہندوستان لوٹا تو ملک ایک تاریخی دور سے گذر رہا تھا۔ جدوجہد آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں، بھلا نذرالاسلام کب چوکنے والے تھے۔ بیدار اور انقلابی شاعر کیوں خاموش رہتے۔ انہوں نے ہندوستانی تحریکوں کا ساتھ اپنی شاعری اور اپنے قلم سے دیا۔

قاضی نذرالاسلام مسلمان تھے، نیز بنگالی ان کی مادری زبان تھی، ان کی جتنی بھی تصنیفات ہیں، سب کی سب بنگالی زبان میں ہیں۔

نذرالاسلام کی نظم 'باغی' شائع ہوتے ہی وہ شہرت ومقبولیت کے بام عروج پر پہنچ گئے۔

'باغی' کے بعد ہی شاعرِ انقلاب کے نام سے مشہور ہو گئے۔ یاسیت، مایوسی اور خزاں زدہ گلشن کے پتے پتے اور بوٹے بوٹے پر شجر حجر پرندے ہر طرف چہچہانے لگے تھے۔ نذر الاسلام نے دیکھا کہ آگ دل میں چھپا کر وہ لایا ہے، اس کی لپٹیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور سارا ملک شعلہ گاہ بنا ہوا ہے۔ شعلوں میں گھرا نذر الاسلام نے ایک نغمہ چھیڑا 'اگنی بینا' سازش، آتش، 'زہریلی بانسری' وغیرہ نظمیں اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان نظموں کے شائع ہوتے ہی بنگال کے نوجوانوں نے محسوس کیا کہ ان کی زبان میں کوئی ان کے دل کی باتیں کہہ رہا ہے۔ انہوں نے باغی کا ایک لمبا نغمہ الاپا۔ پھر کیا تھا، تمام بنگال اس سرے سے اس سرے تک ناگ کی طرح مست ہو کر نغمے پر ناچنے لگا۔ گلیوں کوچوں، خفیہ جلسوں اور جلوسوں میں یہ نظم گونجنے لگی، جیل کی دیواروں اور کال کوٹھری کی تنہائیوں سے اس کے نغمے ٹکرانے لگے۔ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکار میں اس کے سر گونجنے لگے اور پھانسی کے تختوں پر آخری ہچکیوں سے ملکر 'باغی' نے ان قیدیوں کو زندہ جاوید بنا دیا۔

قاضی نذر الاسلام کی یہ نظم اور اس قسم کی دوسری باغیانہ نظمیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان انقلابی تصانیف کو اس شاعر نے ادب پارہ کیسے بنا دیا؟ تخئیل کی یہ رنگینی، تصور کا یہ پرواز اور جذبات کا یہ بہاؤ طوفانی ہوتے ہوئے بھی، کس طرح حسن کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ نذر الاسلام کا باغی یونان کا رستم ہرکلس نہیں ہے، جس کی ٹانگیں آہنی ستونوں سے زیادہ موٹی تھیں۔

بلکہ ہومر کا شکیل اور جمیل ہیرو اکیلیس ہے، جس کی تلوار میں اتنی ہی کاٹ تھی جتنی کہ اس کے مدبھرے نینوں میں۔ گوری چمڑی بدیسی حکومت نے بہت چاہا کہ ان کی شاعری کی آواز کو بند کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کے متعدد مجموعے ضبط کر لئے گئے اور نذر الاسلام کو جیل کی کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا لیکن وہاں بھی نغمے کے سوتے ندی کی چنچل دھار کی طرح پھوٹتے رہے اور مختلف زبان زد ہو کر ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ نذر الاسلام کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی جیل ہی میں تھا کہ شاعر اعظم ٹیگور اپنے کلام کے ایک نئے مجموعے کو جس کا نام 'بسنت' ہے، ان کے نام سے معنون کیا۔

نذر الاسلام نے بنگلہ شاعری میں غزل کی صنف ایجاد کی، جو بہت مقبول ہوئی۔ بنگلہ زبان میں اردو فارسی کے الفاظ کی چاشنی ملا کر اس نے بنگال کے رومان پرست طبقے کو اپنا گرویدہ بنا لیا، یہ غزلیں گھر گھر گائی جانے لگیں اور ہر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں زیر لب گنگناتے نظر آنے لگے۔ نذر الاسلام نے عورت کو اس کی غیر فطری جگہ سے نجات دلائی اور انسانوں کی مجلس میں رونق افروز کیا۔ یہاں وہ محبت کرتی ہے۔ یہاں اسے خلوت بھی حاصل ہے اور جلوت بھی۔ وہ روتی بھی ہے اور خلوت

میں ظاہری حیا کو ترک کر کے اپنی عریانی اور نوشگفتہ پھولوں سے کسی کی روح کو عطر بیز بھی کرتی ہے۔ غرض اس کے یہاں عورت ہے کوئی دیوی نہیں۔

قاضی نذر الاسلام نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کی، جس کی وجہ سے ہندوؤں کا ایک تنگ نظر طبقہ ان سے بد دل ہو گیا۔ مسلمان اس سے پہلے نالاں تھے اور اسے کافر کہتے تھے۔ حکومت اسے دشمن سمجھتی تھی۔ نذر الاسلام کو زندگی کے لالے پڑ گئے تھے اور وہ صد افسوس روٹیوں تک کا محتاج ہو گیا۔ اس وقت نذر الاسلام وہ آندھی بھی سہہ گیا۔ افلاس اس کو دامن گیر تھا۔ لیکن گیت اس کے ہونٹوں سے سبک خرامی سے بہہ رہے تھے۔ یہ ہمارے ادب کی کم نصیبی ہے کہ روٹیوں کے لئے اسے وہ گیت لکھنے پڑے، جو آج بھی بنگال کے بچے بچے کے وردِ زباں ہیں۔ اپنے تخلیقی دور کے آخری ایام میں اس نے بکری کے گیتوں کی ایک بھرمار کر دی تھی۔ گراموفون کمپنیوں کے لئے شاید اس سے زیادہ کسی اور نے گیت نہیں لکھے۔ محبت کے گیت، موسمی گیت، مزاحی گیت، رادھا کرشن کے گیت، مکے، مدینے کے گیت، ناچ کے گیت، کھیل کود کے گیت، بچوں کے گیت، ہلکے گیت، بھاری گیت، سبزی فروش، پان فروش، عصمت فروش، اور دل فروش کے گیت، گیت اور ہر قسم کے گیت اس نے لکھے اور اس تعداد میں لکھے کہ تعجب ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تعداد کے لحاظ سے قاضی نذر الاسلام نے دو ہزار سے زیادہ گیت لکھے۔ دنیا کے کسی شاعر نے اتنے گیت نہیں لکھے۔

آج بھی بنگالی حضرات کا دل و دماغ مضمحل ہو تو قاضی نذر الاسلام کا گیت سن کر طمانیت کا احساس کرتے ہیں۔ اگر چہ نذر الاسلام انقلابی نظموں کی وجہ سے مقبول عام ہوا لیکن شہرت دوام اسے اپنے گیتوں کی وجہ سے ہی حاصل ہوئی۔ ان کے چند گیت گو ان کے دنیائے ادب میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

قاضی نذر الاسلام کے خیرہ کن اور لاابالی زندگی پر بدقسمتی کے بادل اس وقت محیط ہوئے جب اس محبوب بیوی فالج کا شکار ہو کر فریش ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ اور بے فکر شاعر غموں کے شکار میں گرفتار ویدوں، حکیموں، حتیٰ کہ یوگیوں، فقیروں، سنیاسیوں کے دروازوں کی خاک چھاننے لگا۔ ایک دن آیا کہ لوگوں نے اسے دیوانوں کی سی باتیں کرتے پایا۔ اور اسے پاگل خانہ پہنچا دیا گیا۔

☆☆☆

اسلم چشتی (پونہ)
9422006327/9326232141
aslamchishti1@facebook.com

سرد موسم کی دھوپ

(تیرہ مجموعوں پر مشتمل کلیات)

''سرد موسم کی دھوپ'' ۱۰۲۴ صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے ہر صفحہ غزل گُلاب سے سجا ہے۔ اِس میں سُندر ٹہنیاں بھی ہیں اور خوش رنگ کانٹے بھی قاری کے لیے خوشبو کا اہتمام بھی ہے اور لطیف چبھن کا انتظام بھی اس کتاب کے ذہنی سفر میں قاری کئی مراحل سے گذرتا ہے اسے زادِ سفر فراہم کر کے ساتھ لے کر چلنے والا عرب زادہ ڈاکٹر زُبیر فاروقؔ ہے جس کی مادری زبان عربی ہے بُک میکرز (پاکستان) کی جانب سے فلیپ پر چھپی رائے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

> ''سب سے پہلے تو یہی بات حیرت واستعجاب میں مُبتلا کر دیتی ہے کہ ایک عرب شخص نے اُردو زبان سیکھی اور اس میں کلاسکی شاعری کے ساتھ ساتھ جدید ادب کا بھی مطالعہ کیا اور خود کو اس سطح پر پہنچایا کہ اپنی مادری زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں شاعری کر سکے اس کے بعد ایک عام قاری اس عرب اُردو شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایک تو اس نووارِد زبان و ادب نے شاعری کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور دوسرے اس فن میں یوں مستغرق ہو گیا ہے جیسے اس کے پاس شعر کہنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں''۔

یہ اقتباس ڈاکٹر زُبیر فاروقؔ کے اُردو زبان سے والہانہ پیار اور اُردو شاعری سے جنون کی حد تک شوق کی غمازی کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی بات ہے کہ ڈاکٹر زبیر فاروقؔ نے اہلِ زبان اصحاب کو بھی اپنے کام سے شرمندہ کیا ہے۔ میں نے کئی بار اُنہیں ٹی وی کے چھوٹے پردے پر کلام سُناتے ہوئے دیکھا

ہے۔ تلفظ کی ادائیگی میں احتیاط نزاکت اور لفظ کے معنی سے میل کھاتی آواز ڈاکٹر زبیر فاروقؔ سے تحت اللفظ میں شعر پڑھنے کا خاصہ ہے یہ ہنر بڑے ریاض سے آتا ہے۔ ڈاکٹری پیشے کو نبھاتے ہوئے کب کس طرح اُردو زبان کو قابو میں کیا ہوگا کب کلاسیکل شعریت کا مطالعہ کیا ہوگا۔ قواعد اور عروض کو سمجھنے میں کتنی مشکلیں آئی ہونگی یہ وہی جانیں اپنے بارے میں اُنہیں کے خیالات مُلاحظہ کریں۔

''طب میرا پیشہ ہے اس میں دیانت و ریاضت مجھ پر فرض ہے مگر اپنی سمجھ کے مطابق شاعری مجھ پر قرض ہے۔ قرض کی ادئیگی کے بغیر فرض کی ادائیگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ شاعری میرے لیے ایک مُرغ زار کی حیثیت رکھتی ہے کہ جہاں مسافر ستا کر تازہ دم ہونے کے بعد سفر کی صعوبتوں کا سامنا کرنے کے لیے مُستعد ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اپنے طبی پیشے کی طرف زیادہ توجہ مبذول کرنے میں شاعری میری معاونت کرتی ہے''۔

ڈاکٹر زبیر فاروقؔ کے اپنے پیشے کے بارے میں خیالات جان کر خوشی ہوئی کہ وہ پیشۂ طب کو اولیت دیتے ہیں اور شاعری کی بھی اُن کے پاس اہمیت ہے لیکن اس کے حدود ہیں۔ اُن حدود کو پھلانگے بغیر وہ شاعری کو اپنائے ہوئے ہیں اور یہ بھی کہ شاعری سے وہ Refresh ہو کر انسانی خدمت والے پیشۂ طب میں مصروف ہو جاتے ہیں اُن کے اس طریق کار کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ایک طرف تو وہ اُردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور انسانی خدمت کا فرض بھی ادا کر رہے ہیں ایک جگہ وہ اپنی اُردو دانی کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ

''اُردو زبان کی جڑیں زرخیز عربی زمین میں بہت زیادہ گہری ہیں اس سے کسی کو انکار ہے نہ ہوگا ہزار ہا الفاظ اپنی ظاہری شکل وصورت بگاڑے بغیر اس میں زندہ و تابندہ ہیں اس لیے انہیں اپنانے اور استعمال کرنے میں مجھے کوئی دِقّت پیش نہیں آتی بعض اوقات ان کے مزاج سے بے خبر ہوتے ہوئے جب میں اُنہیں بلا جھجک استعمال کر جاتا ہوں۔ جو بعد میں غلط ثابت نہیں ہوتا تو مجھے اپنائیت کے علاوہ ایک خوشگوار حیرت کا لُطف بھی آتا ہے۔''

ڈاکٹر زبیر فاروقؔ کی اُردو قُربت اور محبت کی وجہ عربی زبان اور پاکستان میں طبی تعلیم کے دور میں جو ماحول ملا اُس سے ہوئی ڈاکٹر زبیر فاروقؔ پہلے ہی عربی میں شاعری کیا کرتے تھے پھر انگریزی میں بھی Poems لکھنے لگے۔ آتے آتے جب اُردو اُنہیں آگئی تو اُردو میں بھی شاعری

کرنے لگے اُردو شاعری آسان نہیں تُک بندی تو کوئی بھی کر لیتا ہے لیکن ڈھنگ کی شاعری کرنے کے لیے اُستاد کی ضرورت ہوتی ہے جو مشق کروائے اور راہ سے بھٹکنے نہ دے زبان کے رُموز سمجھائے 'بیان کے گُر سے واقف کروائے اور عروضی ہُنر کا عادی بنائے ایسا اُستاد نہ ملے یا پھر شاعر اپنے طور پر شاعری کرتا رہے تو اُس کی شاعری میں کہیں نہ کہیں کمی رہ ہی جاتی ہے یہ اور بات کہ اسکے پاس میں کچھ اچھے شعر مل ہی جائیں گے بہر حال صحیح معنوں میں جو شعر کہنا چاہتے ہیں اُردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں وہ ضرور کسی اچھے اُستادِ سخن سے مشورہ ضرور لیتے ہیں لیکن اچھے قسمت سے ہی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر زبیر فاروقؔ خوش نصیب ہیں کہ اُنہیں شفیق سلیمی جیسا اُستاد مل گیا۔ اُستاد کے بارے میں ڈاکٹر زبیر فاروقؔ کے خیالات ملاحظہ فرمائیں۔

''اپنے اُستادِ مکرم شفیق سلیمی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ سخنوری کے پُر اسرار گوشوں سے جس طرح انہوں نے روشناس کرایا وہ میرے لیے ان کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اگر شہرِ سخن میں میرا کوئی قد و قامت ہے تو سب ان کی وجہ سے ہے۔''

عالمی شہرت حاصل کرنے کے بعد کسی شاعر کا اپنے اُستاد کے بارے میں اعتراف کرنا اور وہ بھی مندرجہ بالا اقتباس میں استعمال کئے گئے الفاظ کے ساتھ، قابل قدر بات ہے ویسے با اخلاق با ہنر ڈاکٹر زُبیر فاروقؔ ادبی حلقوں میں جانے پہچانے لگنے لگے ہیں۔ عوام میں ان کی مقبولیت ہوتی جا رہی ہے ان کے تیرہ مجموعے شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ان تیرا مجموعوں کو ردیف وار ''سرد موسم کی دھوپ'' میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ کُل ایک ہزار ایک غزلیں ہیں یہ غزلیں چھوٹی بڑی بحروں میں ہیں ڈاکٹر زبیر فاروقؔ نے خوب مشق کی ہے بہت خوب شعر تخلیق کیے ہیں یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ جاری ہے شاید انہیں خوب تر کی تلاش ہے۔

ڈاکٹر زبیر فاروقؔ نے غزل جیسے بظاہر آسان لیکن مشکل فن کو اپنا کر جُرأتمندی کا ثبوت دیا ہے یہ کلیات قابل مطالعہ ہے کہ شعر و شاعری کا ذوق رکھنے والے کو مطلب کے شعر ضرور مل جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں کلاسیکل آہنگ بھی ہے اور جدید رنگ بھی۔ یہ آہنگ یہ رنگِ شاعری کے شائقین کے لیے دِلچسپی کا باعث ہے ڈاکٹر زبیر فاروقؔ کے کلام میں کئی طرح کے شعر ملتے ہیں مثلاً خالص تغزل دیکھئے۔

میں نے ہر گذرے ہوئے موڑ پہ پایا تجھ کو
تیری یادیں بھی ہیں گم گشتہ صداؤں جیسی

پرچھائی جس کی آج بھی چلتی ہے میرے ساتھ
میری وفا کو لے کے وہ پیکر کہاں گیا

چھوٹی بحروں میں پُرمغز بامعنی شعر کہنا کمالِ فن ہے۔ یہ فن ڈاکٹر زبیر فاروقؔ کے پاس دیکھئے

ڈوب نہ جاؤں طوفاں میں اس کی آنکھ سمندر ہے

.....

دشمن ہی وہ لاکھ مگر غیر تو نہیں مجھ سے مقابلہ میری اپنی اَنا کا ہے

.....

ایسا مصروف ہوں زندگی کے لیے خود سے ملنا بھی اب مختصر ہوگیا

.....

منزلیں دور ہوتی جاتی ہیں راستوں میں رُکا نہیں کرتے

.....

ہجر آیا وصال سے پہلے دکھ اُٹھایا سوال سے پہلے

.....

یہ زہر ہے ، پر میٹھا شاید وہ نگل جائے

بڑی اور مترنم بحروں میں بھی ان کے اشعار سینکڑوں ہیں چھوٹی بحر کی طرح بڑی ردیف قائم کر کے اچھے شعر کہنا کوئی آسان کام نہیں لیکن ڈاکٹر فاروقؔ نے آسان بنالیا ہے اور ردیف کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے۔ ان کی شاعری میں قوافی مشکل نہیں آسان ہیں جو مضمون بندی کو گرفت میں رکھتے ہیں۔ اور ایک خاص بات ان کے سخن کی یہ ہے کہ الفاظ کا استعمال انہوں نے مواد کے مطلب کے لحاظ سے ہی کیا ہے۔ عموماً الفاظ سہل ہیں عام سمجھ کے ہیں شعر میں آکر رواں ہو جاتے ہیں ان ساری باتوں کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جسے قاری ضرور پسند کرے گا۔ لیکن اس مضمون میں گنجائش نہیں اس کے علاوہ ابھی بہت ساری باتیں باقی ہیں۔ بہت سے نکات تشنہ ہیں بہت سارے اشعار کی تشریحات کرنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ میں نے ڈاکٹر زبیر فاروق کی کلیات کے سارے کے سارے اشعار پڑھے ہیں کچھ اشعار کو تو بار بار پڑھا ہے۔ گنگنایا ہے پسندیدہ اشعار کی اپنی ڈائری میں نوٹ بھی کئے ہیں اس لئے یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ ڈاکٹر زبیر فاروق ایک فطری شاعر ہیں عوام کے جذبات کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔ خواص کے ذوق اور خیالات کا بھی انہیں پاس ہے۔ اُردو کی شاندار روایت کا بھی اُنہیں لحاظ ہے۔ یہ اور ایسی کئی باتیں' ایک میں ہی نہیں اور بھی

لوگ کہتے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے ڈاکٹر زبیر فاروقؔ کی شاعری کو غور سے پڑھا ہے، سمجھا ہے۔ اس بات کا دعویٰ میں بھی نہیں کرسکتا کیونکہ کسی بھی شاعر کی شاعری کو آسانی سے سمجھا نہیں جاسکتا کیونکہ جو مستقل طور پر شاعری کرتا ہے اس شاعر کے پاس زندگی کے بہت سارے تجربے ہوتے ہیں۔ مشاہدے ہوتے ہیں اور اس کے نظریۂ کے تحت بسائی ہوئی اس کی اپنی تصور کی دنیا ہوتی ہے۔ اس دُنیا کو پا جانا یا تجربے اور مشاہدے کو چھو لینا آسان نہیں اور پھر شاعر کے کلام میں قاری یا سامع کے جذبات، خیالات اور نظریات بھی تو ملتے ہیں جو اسکی پسند بنتے ہیں۔ ڈاکٹر زبیر فاروقؔ کے پاس ایسے اشعار بھی جابجا ملتے ہیں۔ اتنی ساری خصوصیات کے باوجود ''کلیات'' کے آخری صفحے پر غالبؔ کا ایک شعر شایع کیا گیا ہے۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ　　گر نہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یہ ڈاکٹر زبیر فاروقؔ کی سادگی ہے۔ انکساری ہے انھوں نے ''عرضِ مُصنف'' کے آخر میں لکھا ہے کہ ''سچی بات یہ ہے کہ شعر کہنے سے مجھے تسکین ملتی ہے میرے لئے کافی ہے تاہم 'سرد موسم کی دھوپ' میں اگر کسی اور کو خوشی کی کوئی بھولی بھٹکی کرن مل جائے تو یہ میرا انعام ہوگا۔''

میں بحیثیت قاری ڈاکٹر زبیر فاروق کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے ان کی شاعری میں خوشی بھی ملی اور کرن بھی اس مناسبت سے ڈاکٹر زبیر فاروقؔ انعام کے مستحق ہوگئے مبارک۔۔

☆☆☆

محمد متین ندوی کی تنقیدی کتابیں

۱-سیفی سرونجی ایک تنقیدی نظر (۲۰۰۴ء میں شائع ہوچکی ہے)

۲-خیال اپنا اپنا

(تنقیدی وتاثراتی مضامین)

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی سے شائع ہورہی ہے۔

۳-گوپی چند نارنگ ایک عظیم مجاہد اردو

عنقریب ہی شائع ہورہی ہے (انشاء اللہ)

احسن امام احسن

قمر گوالیاری قمر کی طرح روشن فنکار

قمر گوالیاری ایک جانا پہچانا اور معتبر نام ہے۔ ایک عرصے سے اردو ادب کی خدمت میں منہمک ہیں۔ آپ کی پیدائش ۱۹۳۸ء میں گوالیار میں ہوئی۔ علامہ ابر احسنی گنوری کے ہونہار شاگردوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ قمر صاحب محفل فنکار نکال کر اردو ادب کی ترویج وترقی میں اردو داں طبقے کے شانہ بشانہ ساتھ ہیں۔ اس وقت انھوں نے اپنی دو کتابیں بھیجی ہیں۔ شعری مجموعہ ''کشش'' اور ''گوالیار اور اردو زبان وادب'' اس میں کوئی شک نہیں کہ شعری مجموعہ خوبصورت غزلوں سے بھرا پڑا ہے۔ موصوف نے غزلوں میں اپنے مشاہدات وتجربات کو موتیوں کی طرح پرو دیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگ اس عمر میں لکھنا پڑھنا بند کر دیتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے دونوں آنکھوں کا آپریشن باری باری سے کروایا ہے۔ پھر بھی وہ کثرت سے لکھتے ہیں اور خوب مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ صاف بات کہنے کے عادی ہیں۔ ایک بار انھوں نے ''محفل فنکار'' کے اداریہ میں اس بات کا ذکر کیا کہ میرے صاحبزادے کو اردو سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، یہ صاف گوئی مجھے پسند آئی۔ وہ تنہا اتنے سارے کام کرتے ہیں۔ گویا اپنے آپ میں وہ ایک ادارہ ہیں۔ اس سے پہلے ان کی کتابیں ہندی میں آچکی ہیں اور داد وصول کر چکی ہیں۔

قمر گوالیاری چونکہ ایک بہترین شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ اب وہ محقق بھی ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ استاد بن کر اصلاح دیتے ہیں۔ خوبصورت انداز میں توضیح لکھتے ہیں۔ قمر گوالیاری مشاہدات

کے تخلیقی لبادے میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور قاری کو اپنے اسلوب سے قائل کر لیتے ہیں۔قمر گوالیاری پورے اعتدال اور توازن کے ساتھ شعری سفر پر گامزن ہیں۔موصوف نے اپنی شاعری میں بھائی چارگی کو خوب بڑھاوا دیا ہے۔

دنیا نے ہر رسم محبت ہی اٹھا دی
میں نے مگر اخلاص دیا ، میں نے وفا دی

پروفیسر ساحل احمد لکھتے ہیں:

''قمر گوالیاری کی غزلیہ اشعار سے ان کی صادقانہ سرشت مصور ہوتی ہے۔وہ زندگی کی ان صالح قدروں کو روشن رکھنے میں یقین رکھتے ہیں۔جن سے آدمیت پائندگی حاصل کرتی ہے۔قمر گوالیاری کے اشعار میں حرکت وعمل کی روشنی اور حقائق کی نہ صرف دھوپ بلکہ چاندنی بھی موجود ہے، میں قمر گوالیاری کے اس مزاج حسنہ کی تحسین کرتا ہوں، جس سے دوستی کی مہک ملے اور مہک سے ضمیر روشن ہو۔''

قمر گوالیاری ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔انھوں نے حادثات زندگی کو شعری پیکر عطا کیا ہے، خوبصورت استعاروں میں بڑی بات کہہ کر نکل جاتے ہیں۔موصوف نے افسانہ نگاری بھی کی ہے اور خوب کی ہے۔فی الحال وہ شاعری کی طرف مائل ہیں۔اب تحقیق کا جنون ان پر سوار ہوا ہے لیکن شاعری کے دامن کو تھامے ہوئے ہیں۔ذائقہ کے لئے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

فوجِ حق بن گئیں ابابیلیں
ورنہ رکھا ہی کیا تھا کنکر میں

مر ااحساس زندگی تو قمر
منتشر ہوکے رہ گیا گھر میں

دریا کو بس میں کرنے کی تدبیر سوچئے
پانی کھسک رہا ہے مکانوں کے آس پاس

سچائیوں کے چہرے پہ ڈالے ہوئے نقاب
سچائیوں سے آج بھی کترا رہے ہیں لوگ